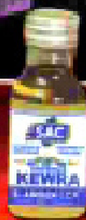
ماہنامہ

مسٹری میگزین

اس ماہ کی خاص کہانی

آتما





MYSTERY MAGZINE

WELCOME 2012

صفحہ	عنوان	مصنف	تعارف
8	روشنی	عنایت اللہ سبحانی	قلب و روح کو منور کرتا ہوا اسلامی سلسلہ
12	مدیر نامہ	فہمیدہ	کچھ تنقیدیں، کچھ تعریفیں قارئین کی آراء پر مشتمل خطوط
15	آتما	نیلم خاتون	پراسرار کہانیوں کے شائق قارئین کے لیے تحفہ
35	سراب	شہاب شیخ	کمزور عقیدہ خواتین کے لیے بطور خاص ایک رہنما تحریر
50	غلط فیصلہ	پرکاش کمار	غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک معصوم لڑکی کو دولت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا
57	پیانو	صغیر ملال	ایک ناسٹلجیا......ایک دل گداز کہانی
69	گلابوں کی جنگ	اشتیاق فاطمہ	تاریک یورپ کے رخ سیاہ سے پردہ اٹھاتا منفرد سلسلہ
99	مقتول گواہ	راشد سعید	ایک مقتول گواہ کی گواہی کی داستان
108	قاتل	ایس فاروق	اس نے اپنے قاتل سے اپنے لیے اس کا جسم حاصل کر لیا تھا
121	محبت	شہاب شیخ	محبت ہو گئی ہے کسی مہرباں کو کسی نامہرباں سے
134	کلب میں ایک اور شام	اجمل کمال	پرتعیش زندگی ہر عورت کی تمنا
140	پلاسٹک سرجری	راشد سعید	ایک چالاک تاجر کا احوال
148	حقدار	نیلم خاتون	اماں حوا نے ایک غلطی کر کے جنت کیا ٹھکرائی
156	اور کشتے والے	اعجاز راہی	وہ بھی اپنے بیٹے کو ترقی کرتے دیکھنا چاہتا تھا
161	دس ہزار حق مہر	ذیشان عبداللہ	ایک دلچسپ وانوکھی داستان
163	دلدل	الف صدیقی	موجودہ حالات وواقعات پر مبنی سسپنس سے بھرپور سلسلے وار کہانی
191	انسان	مسعود صدیقی	اپنی زندگی پر دوسروں کی زندگی کو اہمیت دینے والے ایک نیک انسان کی کہانی
194	قرض	زاہد شاہ	اس دور کا قصہ جب بس کا کرایہ اٹھ آنے ہوتا تھا
195	آخری ہنسی	عطا صدیقی	ایک سادہ لوح مگر ذہین پولیس افسر کی دلچسپ روداد
200	شہید	عابدہ خان	اللہ کے ایک سپاہی کا ایمان افروز قصہ
206	بہار کا ایک دن	ستار طاہر	محبت کی ایک بہت دل آویز کہانی
209	آتش فشاں	ایم اے راحت	انتقام کی آگ میں جلنے والے شخص کی ایک نئی سلسلے وار کہانی

MYSTERY MAGZINE

WELCOME 2012

قلب و روح کو منور کرتا ہوا اسلامی سلسلہ

روشنی

نازک مرحلے

لیکن ابھی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ان کی ہٹ دھرمی پھر جاگ اٹھی اور وہ شک کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے:

''ضرور کسی نے تم کو یہ سب بتلا دیا ہے۔ کوئی اور روشن دلیل لاؤ۔''

اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم راستے میں جن جن چیزوں سے گزرے تھے' ان کو بیان کرنے لگے۔ فرمایا:

''فلاں فلاں قافلے سے میری ملاقات ہوئی۔ فلاں فلاں بستیوں میں سے گزرا۔ فلاں فلاں اونٹنیاں میں نے دیکھیں۔ اتنے قافلے عنقریب ہی پہنچنے والے ہیں اور اتنے ابھی کچھ فاصلہ پر ہیں۔ پھر ان قافلوں کے ساتھ یہ یہ سامان ہیں اور ان کے جانور ایسے ایسے ہیں۔''

مشرکوں نے کہا:

''تمہاری باتوں پر یونہی کیسے یقین آجائے گا۔ ذرا ٹھہرو قافلوں کو آلینے دو۔ ان سے بھی پوچھ لیں گے کہ وہ اس رات کہاں تھے؟ اور جو جو علامتیں تم بتا رہے ہو' ذرا اپنی آنکھوں سے بھی ہم دیکھ لیں۔''

اسیوقت ابوبکرؓ بول اٹھے:

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا' سچ فرمایا''

اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر جھکا لیا' اور کچھ دیر یونہی رہے۔ پھر سر مبارک اٹھایا، اور ابوبکرؓ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا:

''ابوبکرؓ! اللہ نے تم کو ''صدیق'' کا خطاب دیا ہے۔''

پھر مجلس برخاست ہو گئی اور لوگ ادھر ادھر پھیل گئے۔ لیکن اب جہاں دیکھئے یہی چرچا تھا۔ اور جدھر دیکھئے، اس کا تذکرہ تھا۔ اب جہاں دو آدمی ملتے اس طرح کی باتیں کرتے۔

کیا یہ واقعہ صحیح ہے؟ کیا عقل یہ باور کرتی ہے؟ کیا اتنی دیر میں اتنے دور کی سیر ممکن ہے؟ کیا خبر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کا پل باندھا ہو!

ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے اور ہر طرف اس قسم کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ وہ قافلے آپہنچے۔ دیکھا گیا، تو سامان وہی تھے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے تھے اور جانور بھی بالکل ویسے ہی تھے۔

تو کیا مشرکوں نے اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سر جھکا دیا؟ نہیں۔ ان کی ہٹ دھرمی کو اور جوش آگیا۔ وہ

بولے:

''مغیرہ کے بیٹے ولید نے کہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جادوگر ہے۔ اس نے کوئی غلط تھوڑی کہا تھا۔ دیکھو' ان باتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ واقعی سچی بات کہی تھی اس نے!''

مشرکوں کی مجلس برخاست ہو گئی تو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مخلص ساتھیوں میں بیٹھے' اور اللہ نے جن جن بڑی نعمتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوازا تھا، ان کا تذکرہ کرنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس سے آسمان پر جانے کا حال سنایا۔ وہاں قدرت کے جو جو جلوے دیکھے تھے' ان کو بیان فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا' کہ اس طرح حضرت جبرائیل مجھے پہلے آسمان پر لے گئے۔ وہاں انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ملے۔ حال یہ تھا کہ جب دائیں دیکھتے تو کھل اٹھتے اور ہنسنے لگتے اور بائیں طرف دیکھتے تو مارے غم کے آنسو بھر لاتے' کیونکہ دائیں طرف نیک اولاد کے اعمال تھے اور بائیں طرف بد کے۔ حضرت آدمؑ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بولے:

''خوش آمدید اے نیک نبی! اے نیک فرزند!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

''جبریلؑ! یہ کون ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا:

''یہ آدمؑ ہیں، سارے انسانوں کے باپ!''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ دوسرے آسمان پر لے گئے' پھر تیسرے پر' اسی طرح وہ آگے بڑھتے رہے اور ہر آسمان پر یہ دلنواز فقرے کانوں میں گونجتے رہے:

''خوش آمدید اے نیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اے نیک بھائی!''

یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساتویں آسمان پر پہنچ گئے۔ وہاں حضرت ابراہیمؑ ملے۔ دیکھتے ہی وہ بولے:

''خوشآمدید اے نیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اے نیک فرزند!''

پھر آگے بڑھے' اور آگے' اور آگے۔ راہ میں جمال کے بھی جلوے دیکھے اور جلال کے بھی۔ ہزاروں فرشتے بھی نظر آئے۔ جو سجدہ و تسبیح میں مصروف تھے۔ بڑھتے بڑھتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرشِ الٰہی کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور امت پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ پھر واپس ہوئے تو حضرت موسیٰؑ کے یہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا، دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا:

''کہیے' کیا فرض ہوا امت پر؟''

''پچاس نمازیں۔''

موسیٰؑ نے فرمایا:

''لوٹ کر جائیے اور رب سے کمی کی درخواست کیجیے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گئے اور کمی کی درخواست کی اس طرح اللہ تعالیٰ نے آدھی نمازیں کم کر دیں۔''

واپسی میں پھر حضرت موسیٰؑ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی، انہوں نے سنا تو فرمایا:

"پھر جائیے اور کمی کی درخواست کیجیے، اتنی نمازیں بھی امت پر گراں ہوں گی۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر لوٹ کر گئے اور کمی کی درخواست کی، اللہ نے درخواست قبول کی اور کچھ نمازیں پھر کم کر دیں۔ موسیٰؑ کو معلوم ہوا، تو فرمایا:

"ایک بار اور جائیے اور مزید کمی کی درخواست کیجیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر تشریف لے گئے تو اللہ نے اس بار پانچ نمازیں کر دیں اور فرمایا:

"یہ پانچ نمازیں ہیں لیکن ثواب ان کا پچاس کا ہے، میرے فیصلے بدلا نہیں کرتے۔"

پوری رات گزر گئی اور مخلص ساتھی بیٹھے رہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان پر جو جو مناظر دیکھے تھے اور خدا کی قدرت کے جو جو جلوے نظر آئے تھے پوری دلچسپی سے بیان فرما رہے تھے اور ساتھی مزے لے لے کر سن رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں جو کچھ دیکھا تھا، وہ بھی بیان فرمایا اور نیک ساتھیوں کو مژدہ بھی سنایا، کہ:

"جنت میں یہ یہ نعمتیں ہیں، جو تمہارے انتظار میں ہیں۔"

اور...... "کارواں" بنتا گیا!

(ترجمہ) "برائی کو نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجیے، پھر یکا یک آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اور جس شخص میں عداوت تھی، وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی دلی دوست۔"

ظلمتوں کے طوفان میں کیا کرنا چاہیے؟ دشمنوں سے کیسا برتاؤ ہونا چاہیے اور بیزار دلوں میں اسلام کو کیسے بسانا چاہیے؟ یہ آیت ان ہی سوالات کا جواب ہے۔ خدائے دانا نے فرمایا:

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ایسے نازک وقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی ہوشیاری اور حکمت سے کام کرنا ہے۔ دشمنوں سے بات کیجیے، تو بہت ہی میٹھے انداز میں۔ اعتراضات کے جواب دیجئے تو بہت ہی سنجیدہ لہجہ میں۔ کچھ سمجھایئے تو انتہائی پیار و محبت کے پیرایہ میں، اور اگر وہ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑیں تو صبر کیجیے، کیونکہ جو صبر کرتا ہے، اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔"

معراج کا حیرت ناک واقعہ ایسا نہ تھا کہ اسے لوگ سنتے اور بھول جاتے کہ یہ دراصل مومنین کے لیے ایک عظیم خوش خبری تھی اور مشرکین کے لیے نہایت زبردست خطرے کی گھنٹی! یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کھلا ہوا اعلانِ جنگ کر دیا، اور طے کر لیا کہ کسی کے ساتھ ذرا بھی رو رعایت نہیں کریں گے۔ مسلمانوں سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے اور انہیں گھیر گھیر کر ستاتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ گھبرا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیں اور ان کی دعوت اور تعلیمات سے بیزار ہو جائیں۔

رسولِ خدا ساری اذیتیں جھیلتے رہے، اور ان کے لیے سراپا خیر و رحمت بنے رہے۔ عرب میں تین بہت مشہور بازار تھے۔ بازار عکاظ، بازار مجنہ، بازار ذی مجاز۔ حاجی ہر سال مکہ جانے سے پہلے ان بازاروں میں جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں تشریف لے جاتے اور ان سے ملاقاتیں کرتے۔ منیٰ اور عقبہ جاتے ہوئے بھی حاجیوں کے قافلے جس جگہ ٹھہرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں جا کر ان سے ملتے اور ان کو دین کی دعوت دیتے اور قرآن کی وہ آیتیں سناتے۔ جن

میں شرک کے انجام بد کے ڈراوے اور ایمان کے حسن انجام کے وعدے ہوتے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے کہتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ قریش کی بدسلوکیوں سے نجات مل جائے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آزاد ہو کر دین کی دعوت دے سکیں اور رب کا بھیجا ہوا پیغام پہنچا سکیں۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح دعوت دیتے اور لوگوں کو دین کی طرف بلاتے رہیں، یہ قریش کو کب گوارا تھا؟ جاں نثاروں کی تعداد بڑھے اور مددگاروں میں اضافہ ہو، یہ انہیں کب برداشت تھا؟ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے جاتے تو ابو لہب یا دوسرے غنڈے بھی پیچھے ہو لیتے اور کسی کو دعوت دیتے، تو یہ فوراً تردید کرتے اور ہونٹ چباتے ہوئے کہتے:

"بھائیو! یہ تو جھوٹا ہے، جادوگر ہے۔ خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ دیکھو، اس کی باتوں میں ہرگز نہ آنا۔ اس کی ایک نہ سننا۔"

چنانچہ قافلے والوں نے کانوں پر ہاتھ دھر لیے۔ برا بھلا کہا اور چہرے پھیر لیے۔ سینکڑوں انسانوں میں بس چند ہی ایسے تھے، جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں اور تسلیم کیں۔ انہی خوش نصیبوں میں طفیل دوسی بھی تھے۔ یہ بہت اونچے گھرانہ کے شاعر تھے۔ عقل و خرد سے بھی بہرہ ور تھے۔ حج کی غرض سے کعبہ آئے تو قریش نے کان بھر دیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رہنے کی تاکید کی، ان کو قریش کی باتوں پر یقین آ گیا اور طواف کرنے چلے، تو کان بند کر لیا کہ مبادا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات سن لیں۔ وہاں آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ طواف کے دوران پاس سے گزر ہوتا تو کانوں میں کوئی نہ کوئی آیت پڑ ہی جاتی۔ غور کیا، تو وہ آیتیں بہت بھلی لگیں۔ دل میں سوچا:

"اُف، میری نادانی!! میں تو ایک نامور شاعر ہوں۔ عقل و ہوش سے مالا مال ہوں۔ خوب و ناخوب میں خوب تمیز کر سکتا ہوں۔ پھر اس کی باتیں نہ سننے کے کیا معنی! اچھی ہوئیں تو بہتر ہے ورنہ ٹھکرا دوں گا!"

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر آنے لگے تو وہ بھی ساتھ ہو لیے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پوری داستان سنائی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن سنایا۔ قرآن سننا تھا کہ دل پگھل گیا اور انہیں ایک قسم کی ٹھنڈک اور راحت محسوس ہوئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے بڑی جرأت مندی اور حق پسندی کا ثبوت دیا۔ فوراً دعوت پر لبیک کہا، اور عرض کیا:

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! قبیلہ کا دل میرے ہاتھ میں ہے۔ ہر ایک مجھ پر جان دیتا ہے، اور کوئی بات کہوں، تو اسے ماننا اپنے لیے فخر سمجھتا ہے، جاتا ہوں میں ان کو بھی اسلام کی دعوت دوں گا۔"

چنانچہ وہ لوٹ کر گھر آئے اور گھر والوں کو اسلام کی دعوت دی۔ سب کو ان پر اطمینان تھا ہی۔ وہ لوگ فوراً تیار ہو گئے اور اسلام لے آئے بعد میں قوم بھی مسلمان ہو گئی۔

سارے عرب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا ہو گیا۔ عیسائیوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چھان بین کے لیے ایک وفد بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن کی چند آیتیں سنائیں۔ سنتے ہی ان کے دل دہل گئے اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب ایک لمحہ کی بھی تاخیر گوارا نہ تھی۔ وہ فوراً ایمان لے آئے اور جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، اس کو تسلیم کیا اور مسلمان ہو کر واپس ہوئے۔ (جاری ہے)

ماخذ کتاب، محمد عربی ﷺ...... مترجم، محمد عنایت اللہ سبحانی

مدیر نامہ

قارئین کرام...... السلام علیکم

حسبِ وعدہ مسٹری میگزین کا ویل کم 2012ء حاضرِ مطالعہ ہے۔ 2011ء [illegible] نہ جانے کتنی تلخ و شیریں یادوں کو سمیٹے رخصت ہوگیا۔ گزرا ہوا سال بھی ہم مسلمانوں کے لیے [illegible] ثابت ہوا۔ اگر ہم گزشتہ سال میں نظر اٹھا کر دیکھیں تو نہ جانے کتنے ہی مسائل نے جنم لیا۔ جن [illegible] مسائل پیٹرول، گیس، CNG، ٹرانسپورٹ اور دیگر مسائل نے عوام کا جینا دوبھر کردیا۔ ہماری [illegible] 2011ء ہمارے لیے ایک اچھا سال ثابت ہو۔

اس ماہ ہم نے کوشش کی ہے کہ خصوصی شمارہ کے حوالے سے اپنے قارئین کے دل کی [illegible] تسکین کرسکیں، سو اس ماہ آپ کو شمارہ میں کئی تحریریں خاصے کی محسوس ہوں گی۔ خاص شمارہ میں آپ کے اصرار پر آپ کی ملاقات نیلم خاتون سے بھی ہوگی اس کے علاوہ اور بہت کچھ ہے، جو یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔

✍ **نسیم قائم خانی** سانگھڑ سے لکھتے ہیں:

جنابِ عالی السلام علیکم اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو خوش رکھے میں خط لکھنے کا عادی نہیں ہوں اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ خط میں کسے کیسے مخاطب کیا جاتا ہے میرا تعلق ویسے بھی آئی ٹی ٹیکنالوجی کے دور سے ہے اب خطوط کے بجائے موبائل فون پر گفتگو اور ای میل، انٹرنیٹ پر چیٹنگ زیادہ کی جاتی ہے اس لیے میرا کوئی جملہ ناگوار گزرے تو معذرت۔ میرے خط لکھنے کی وجہ اس ماہ پہلے نمبر پر شائع ہونے والا ناول "500 سال بعد" ہے ناول تو بہت خوب صورت تھا اتنا سنسنی خیز کہ میں نے ایک ہی رات میں اسے ختم کردیا مگر اس کا ٹائٹل بھی بہت خوبصورت تھا۔ ویسے ایسے تیز رفتار ناول ہر ماہ آنا چاہیے۔ میری طرف سے اس ناول کے مصنف کو بہت بہت مبارک باد۔ اس کے علاوہ میری آپ سے گزارش ہے کہ جستہ جستہ ایک بہت اچھا سلسلہ تھا اسے دوبارہ شروع کیا جائے اور انعامی کہانی کا سلسلہ بھی دوبارہ شروع کریں۔ ہمیں اپنی ذہانت آزمانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں آپ نے کیوں ان دونوں سلسلوں کو بند کردیا۔ مسٹری میگزین میں قارئین کی انوالمنٹ زیادہ ہوتی جارہی ہے، دوسرے ایک خطوط پر بھی انعامات کا سلسلہ شروع کریں یعنی خوب صورت خط پر انعام اور انعام کا فیصلہ قارئین کریں یعنی وہ خط لکھ کر بتائیں کہ گزشتہ ماہ کس قاری کا خط زیادہ خوب صورت تھا اس سے خط لکھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا۔ امید ہے آپ میری ان تجاویز پر ضرور غور کریں گے۔ دیگر تمام چھوٹی

کہانیاں اور سلسلے وار کہانیوں بہت اچھی رہیں۔ اب اجازت دیں، خدا حافظ۔

✍ **فریدہ جمال** جنگ صدر سے لکھتی ہیں:

فہمیدہ باجی آداب آپ کی خدمت میں اپنا پہلا خط پیش کررہی ہوں امید ہے لفٹ ضرور ملے گی۔ گو میں مسٹری میگزین کی خریدار تو نہیں لیکن مستقل قاری ضرور ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مسٹری میگزین ہر ماہ بڑے بھیا خرید کر لاتے ہیں جب وہ پورا پرچا چاٹ لیتے ہیں تو میرا نمبر آتا ہے پہلے پہل تو بھائی سے ڈانٹ پڑ جاتی تھی کہ رسالے کو ہاتھ کیوں لگایا۔ مگر بعد میں امی کی اس بات نے بھائی کو ٹھنڈا ٹھار کردیا کہ ایسی چیزیں گھر میں کیوں لاتے ہو جسے بہن کے ہاتھ میں دیکھ کر شرماؤ، اب تو بھائی کو لینے کے دینے پڑ گئے انہوں نے کہا کہ ماں یہ ایسا پرچا نہیں ہے بڑا صاف ستھرا رسالہ ہے تو بس اس دن سے مجھے کھلے عام مسٹری پڑھنے کی اجازت مل گئی ایک دوبار میں نے بھائی سے کہا کہ وہ خط لکھ کر کہے کہ رسالے میں تاریخی کہانیاں اور بزرگانِ دین کے قصے بھی شائع کیے جائیں تو انہوں نے کہا کہ یہ رسالے والے سب کے خط شائع نہیں کرتے بلکہ چند مخصوص لوگ جو ان کے اپنے ہوتے ہیں یہ صرف ان ہی لوگوں کے خط چھاپتے ہیں مگر میں نے اس مرتبہ بھائی سے اجازت لے ہی لی کہ آپ کو خط لکھوں ہاں ایک بات بتادوں میں اپنے چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں اس لیے سب ہی مجھ سے بہت پیار اور لاڈ کرتے ہیں اور میری کوئی بات نہیں ٹالتے بس باجی آپ میرا خط ضرور چھاپیے گا ورنہ میری بہت ہتک ہوگی اور باجی آپ کا رسالہ ویسے تو بہت اچھا اور معیاری ہے مگر آپ بزرگانِ دین کے قصے بھی اگر دیا کریں تو اس سے نہ صرف اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جائیں گے بلکہ ہمارا ایمان بھی تازہ ہوگا ویسے روشنی کا سلسلہ بھی بہت خوب صورت اور ایمان افروز ہے یہ سلسلہ بھی مسٹری میگزین کو دیگر پرچوں سے منفرد بناتا ہے۔ مجھے مسٹری میں اشتیاق فاطمہ عظمٰی کی تحریریں بہت پسند ہیں گلابوں کی جنگ میں روشنی کے بعد سب سے پہلے پڑھتی ہوں اس ماہ انہوں نے گلابوں کی جنگ کے علاوہ ایک اور کہانی سوال بھی دی۔ جو بہت اچھی اور متاثر کن تھی۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ ہر ماہ گلابوں کی جنگ کے ساتھ ساتھ ایک آدھ کہانی ضرور دیا کریں۔ دوسری کہانیوں میں مجھے احمد صغیر صدیقی کی کہانیاں بھی بہت اچھی لگتی ہیں مگر وہ کرداروں کے نام بہت مشکل مشکل استعمال کرتے ہیں انہیں کہیں ذرا آسان نام دیا کریں باجی آپ میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ رب راکھا۔

✍ **حشمت علی** سکھر سے لکھتے ہیں:

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ السلام علیکم امید ہے کہ آپ بہ فضلِ خدا بہ خیریت ہوں گی۔ دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد خط لکھنے کی جسارت کررہا ہوں۔ کچھ مصروفیات کی وجہ سے خط نہ لکھ سکا لیکن پچھلے دونوں ماہ کے ڈائجسٹ مکمل طور پر پڑھے ہیں۔ اب اس ماہ کے شمارے کی طرف آتے ہیں۔ اس ماہ کہانیوں میں اول، دوم شہاب شیخ کی "500 سال بعد" "باغ کی لالٹین" رہیں۔ سوم اشتیاق فاطمہ عظمٰی کی "گلابوں کی جنگ" چہارم احمد صغیر صدیقی کی "انقلابی" پنجم الف صدیقی کی "دلدل"۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں اس مرتبہ آپ لوگوں نے

آتما

نیلم خاتون

پراسرار کہانیوں کے شائق قارئین کے لئے دنیا کے ایک انوکھے شخص کی روداد



بہت سے انگریزی سے ترجمہ شدہ کہانیاں شائع کی ہیں۔

✍ نجم فاروق کراچی سے لکھتے ہیں:

اس مرتبہ اپنے پرانے دوست مسٹری میگزین سے ملاقات ہوئی۔ ٹائٹل اس بار چہرے کے اسٹائل سے کافی منفرد اور جاذب نظر لگا۔ کاغذ کا معیار، جلد بندی اور طباعت و اشاعت بہت اچھی ہے۔ ادارہ ہر شعبہ پر اپنی پوری توجہ صرف کر رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ''آتش فشاں'' کی تصویر اور ڈیزائننگ تو اپنی مثال آپ تھی۔ ''گلابوں کی جنگ'' کا انداز بھی خوب صورت اور جاذبیت سے بھرپور تھا۔ روشنی کی کرنیں ایمانیات کا اہم نمونہ تھا۔ مدیر نامہ میں عالم اسلام کا سارا کرب سمٹا ہوا تھا۔ جو دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس مرتبہ کہانیاں تقریباً سبھی اچھی تھیں البتہ ''500 سال بعد، گڑیاں، کھلاڑی، حساب کتاب، مکافات، ناکارہ'' خوبصورت تحریریں تھیں۔ محترم عاصم بٹ کا قلم اپنے جوبن پر ہے۔ ان کی تحریر ''باغ کی لالٹین'' ایک اچھی اور منفرد تحریر تھی۔ ''دلدل'' اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کاوش بھی اچھی تھی۔ کچھ تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ مسٹری میگزین کی مزید ترقی و کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ ایڈونچر کی اشاعت پر بھی کافی توجہ دی جا رہی ہے۔ اگر آپ خواتین کا بھی ایک جریدہ نکال لیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ امید ہے آپ سب بخیر و عافیت ہوں گے۔ ادارہ کے تمام رائیٹرز اور معاونین ورکرز کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

✍ شاہ رخ اسلام آباد سے لکھتے ہیں:

''مسٹری میگزین'' کا تازہ شمارہ میں نے مارکیٹ میں آتے ہی خریدا۔ سب سے پہلے سلسلہ وار کہانی ''گلابوں کی جنگ'' پڑھی۔ ہر قسط کے بعد کہانی دلچسپ اور مزیدار ہوتی جا رہی ہے۔ اگلی قسط کا بہت بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ اسی لیے تازہ شمارہ خریدتے ہی میں سب سے پہلے کمرہ بند کر کے اس کی تازہ قسط پڑھتا ہوں۔ بعد میں دیگر کہانیوں اور سلسلوں کو پڑھتا ہوں۔ ''روشنی'' ایک پرنور سلسلہ ہے جو اسلام کی روشنی سے ہمارے دلوں کو منور کرتا ہے۔ ہر بار اتنی خوبصورت باتیں پڑھ کر دل اور دماغ مسرور ہو جاتے ہیں۔ روشنی پورے ''مسٹری میگزین'' کا سب سے منفرد سلسلہ۔ ''پرچھائیوں کا رقص'' ایک بہترین کہانی تھی۔ ''مدیر نامہ'' میں دوسرے قارئین کے خطوط اور تبصرے، بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ شہاب شیخ ہر مرتبہ ایک انوکھی اور دلچسپ کہانی کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کا انتخاب ہر بار ہی منفرد ہوتا ہے اور اس انتخاب کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ ''500 سال بعد'' ایک دلچسپ اور خوبصورت تحریر تھی۔ نئے شمارے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں، خدا حافظ۔

یہ تھے قارئین کے خطوط اب اگلے ماہ تک کے لیے اجازت

فہمیدہ

آتما

نیلم خاتون

اک پیاسی روح کا قضیہ،
اس کی تشنہ لبی انسانوں کے لیے
جاں لیوا بن گئی تھی وہ چاند کی مخصوص تاریخوں
میں کسی مرد کا انتخاب کرتی اور پھر تین روز تک
اپنی پیاس بجھانے کے بعد اسے ہلاک کردیتی
تھی۔ فرض کریں ایسی ہی کوئی بے چین
روح آپ سے بھی آٹکرائے تو......

طورانی کہانیاں پسند کرنے والوں کے لیے بطور خاص ایک بد چلن عورت کی کہانی

میں نے اپنی کار پارک کی اور ڈیش بورڈ پر رکھی فائل اٹھا کر کار سے نیچے اتر آیا۔ اسے لاک کرنے کے بعد میں تیز تیز قدموں سے اس بلڈنگ کی جانب چل پڑا جس میں میرا آفس تھا۔

میں مین گیٹ پر پہنچا تو وہاں سیکورٹی گارڈ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی گن گود میں رکھی ہوئی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے مجھے سلام کیا اور میں اسے جواب دیتا ہوا گزر گیا۔

ذرا ہی دیر بعد میں لفٹ کے ذریعے اپنے فلور پر پہنچ گیا اور پھر میں اپنے آفس میں داخل ہوگیا۔ میرا چپراسی عبدل کرسی پر بیٹھا ہوا تھا لیکن مجھے دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دینے کے بعد اس سے کہا۔ ”ہاں بھئی عبدل......! کیسے ہو تم......؟“

”جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کوئی آیا تو نہیں تھا؟“ میں نے اپنا چشمہ آنکھوں پر سے اتارتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”نہیں آکاش بابو کوئی نہیں آیا!“

”ٹھیک ہے۔“ کہتا ہوا میں اپنے روم میں آ گیا۔ میں نے کوٹ اتار کر ریوالونگ چیئر کی پشت پر ڈال دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور اس فائل کا مطالعہ کرنے لگا جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد چپراسی نے دستک دی اور میرے ”یس“ کہنے پر وہ کمرے میں آ گیا اور مجھ سے بولا۔

”آکاش بابو......! کوئی لڑکی آپ سے ملنے آئی ہے۔“

”لڑکی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا نام ہے......؟“

”شکنتلا بتاتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”شکنتلا!“ میں نے زیر لب کہا اور سوچنے لگا کہ یہ شکنتلا کون ہے کیونکہ کوئی شکنتلا نامی لڑکی تو میرے احباب میں نہیں تھی، ہاں میری چچی کا نام شکنتلا تھا لیکن وہ بہرحال لڑکی نہیں تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میرے چپراسی کرشن کمار کی عمر بھی تو تقریباً پینسٹھ برس ہے جبکہ میری چچی کی عمر پچاس سال کے قریب ہوگی، ممکن ہے کرشن کمار نے اپنی عمر کے حساب سے میری چچی ہی کو لڑکی کہہ دیا ہو اس لیے

میں نے اس سے کہا۔ ”تم نے اسے لڑکی کہا ہے...... کیا عمر ہوگی اس کی؟“

”عمر...... تقریباً پچیس سال ہوگی۔“ اس نے جواب دیا تو یہ ثابت ہوگیا کہ آنے والی میری چچی نہیں ہے۔ میں نے کرشن کمار سے کہا۔

”ٹھیک ہے تم اسے میرے پاس بھیج دو۔“

”جی بہتر......!“ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا اور میں ایک بار پھر اپنی یادداشت پر زور دینے لگا کہ آخر یہ شکنتلا ہے کون۔

ذرا ہی دیر بعد دروازہ پر دستک ہوئی۔

”یس......!“ میں نے کہا تو دروازے کا ہینڈل گھوما اور پھر اسے تھوڑا سا کھول دیا گیا۔ ایک نوجوان اور حسین لڑکی نے اندر جھانکا۔ وہ مسکرا کر مجھ سے بولی۔ ”کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“

”جی جی آیئے......!“ میں نے مسکراتے اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

وہ اندر آ گئی۔ اس نے نیلے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کا رنگ گورا اور قد درمیانہ تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور پرکشش تھیں جبکہ اس نے اپنے تراشے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک لگا رکھی تھی جس کی وجہ سے اس کے ہونٹ گلابی دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنے لمبے ریشمی اور کالے بال کھول رکھے تھے۔ اس کے کانوں میں بڑے بڑے جھمکے لٹک رہے تھے۔

”کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟“ اس نے میرے سامنے رکھی کرسی پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

”جی جی بیٹھیے...... پلیز!“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

ہم دونوں بیٹھ گئے تو میں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”جی فرمایئے......! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

”میں آپ سے کچھ ڈیلنگ کرنا چاہتی ہوں۔ آئی مین...... بزنس ڈیل۔“ وہ بولی۔

”جی جی ضرور۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا میں سمجھ گیا کہ وہ اس سلسلے میں مجھ سے بات چیت کرنا چاہتی ہے۔

”مجھے کچھ تصویریں باہر بھجوانی ہیں۔“ وہ بولی۔

”تصویریں......! کیسی تصویریں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ پینٹنگز ہیں۔“

”پینٹنگز......! اچھا کیسی پینٹنگز ہیں وہ؟“

”عام سی پینٹنگز ہیں۔“

”وہ آپ ساتھ لائی ہیں کیا؟“

”جی نہیں۔“

”اوہ تو پھر لے آیئے گا میں دیکھ لوں گا بھجوا دی جائیں گی وہ۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا جبکہ میں نے سوچا تھا کہ اگر وہ تصویریں کسی بھی اعتبار سے قابل اعتراض ہوئیں تو میں انہیں نہیں بھیجوں گا۔

”کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ آج رات کا کھانا میرے ساتھ میرے گھر پر کھائیں وہیں وہ پینٹنگز دیکھ لیجیے گا۔“ وہ بولی اور جواب طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ میں خوب صورت لڑکیوں کا دیوانہ ہوں۔ میں ذرا بھنورا صفت آدمی ہوں۔ مردانہ وجاہت رکھتا ہوں۔ میری پرسنلٹی پر لڑکیاں اور عورتیں بھی مرتی ہیں۔ ویسے مجھے بگاڑنے میں ایسی ہی لڑکیوں اور خواتین کا زیادہ ہاتھ ہے کیونکہ وہ خود مجھے دعوت دیتی ہیں کہ میں ان کے قریب ہوجاؤں۔ اب شکنتلا بھی مجھے اپنے ساتھ ڈنر کی دعوت دے رہی تھی اور میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اس کی آفر ٹھکرا دوں۔ میں نے اس سے مسکرا کر کہا۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں ضرور آپ کے ساتھ رات کا کھانا کھاؤں گا۔“

”تھینکس......! اس نے کہا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے پرس میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ میرا ایڈریس اور فون نمبر ہے۔“

میں نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے کر اس پر نظر ڈالی۔ وہ شہر کے ایک پوش علاقے میں رہتی تھی۔ وہاں بڑی بڑی کوٹھیاں بنگلے بنے ہوئے تھے۔

”ٹھیک ہے میں حاضر ہوجاؤں گا۔“ میں نے وہ کارڈ اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر اس سے کہا۔

”کتنے بجے تک آئیں گے؟“ وہ بولی۔

”جتنے بجے آپ کہیں؟“

”نہیں جب آپ کو سہولت ہو چھ بجے سات بجے آٹھ بجے۔“

”او کے......! میں سات بجے تک آجاؤں گا۔“ میں نے اپنے کاموں کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا جنہیں میں چھ بجے تک نمٹا لیتا اور سات بجے اس کے گھر پہنچ سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے میں آپ کا ویٹ کروں گی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”اچھا اب مجھے اجازت دیجیے؟“

”ارے ارے......! یہ کیا غضب کر رہی ہیں۔“ میں نے فوراً کہا۔ ”یعنی میں آپ کے گھر پر ڈنر کروں گا اور آپ میرے پاس کچھ پئیں گی بھی نہیں......؟ بتایئے کیا چلے گا؟“

”کوئی ڈرنک مناسب رہے گی۔“ وہ بولی۔

”او کے......!“ کہتے ہوئے میں نے کال بیل کا بٹن پش کر دیا۔ باہر بیل بجی اور ذرا ہی دیر بعد کرشن کمار اندر آ گیا۔ میں نے اسے کولڈ ڈرنک لانے کا کہا۔ وہ واپس چلا گیا۔ میں نے شکنتلا کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”ویسے آپ کو میرا ایڈریس کس نے دیا؟“

”مجھے ایک پارٹی میں آپ کے بارے میں کسی نے بتایا تھا۔ ویسے بھی مجھے یاد نہیں ہے کہ کس نے بتایا تھا۔ اس نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا بھئی۔“ میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ ”یہ کون ہے جو میری تعریف کرتا ہے جبکہ میں تو کسی لائق ہی نہیں ہوں۔“

”انسان اپنے بارے میں ایسا ہی کہتا ہے لیکن دوسرے جانتے ہیں کہ وہ کس قابل ہے۔“ وہ بھی مسکرا کر بولی۔

”بہر حال میں تو خود کو کسی قابل نہیں سمجھتا اگر کوئی میری تعریف کرتا ہے تو یہ اس کی مہربانی ہے۔“

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی اور کرشن کمار دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں دو کولڈ ڈرنک اور گلاس نظر آرہے تھے۔ اس نے کولڈ ڈرنک اور گلاس سامنے رکھ دیے اور کمرہ سے باہر چلا گیا۔

”ویسے آپ کے کیا شوق ہیں؟“ میں نے شکنتلا سے کہا۔

”میں بہت سے شوق رکھتی ہوں۔“

پینٹنگز...... ٹیبل ٹینس اور......“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”ایک اور شوق بھی رکھتی ہوں اس کے بارے میں رات کو بتاؤں گی آپ کو۔“

”اوہ......“ میں مسکرا دیا۔ آپ نے تو سسپنس پیدا کر دیا۔“

”رات میں یہ سسپنس ختم ہوجائے گا۔“

”او کے...... جیسی آپ کی مرضی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکا کر کہا۔

ہم عام معاملات پر بات چیت کرتے رہے اور کولڈ ڈرنک پینے کے بعد وہ مجھ سے بولی۔ ”اچھا! اب مجھے اجازت دیں مجھے ایک سہیلی سے بھی ملنا ہے۔“

”جی بالکل بالکل۔“ میں نے کہا۔

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے مجھ سے الوداعی کلمات کہے اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں اپنی ریوالونگ چیئر پر آ گیا۔ مجھے اتنی خوب صورت لڑکی سے ملاقات پر بے حد خوشی ہورہی تھی۔

☆

میں شکنتلا کے بتائے ہوئے علاقے میں آ گیا اور اپنی کار کی رفتار آہستہ رکھتے ہوئے کوٹھیوں اور بنگلے کے نمبر دیکھنے لگا۔ بالآخر میں اپنے مطلوبہ نمبر پر پہنچ گیا۔ یہ ایک

شاندار بنگلہ تھا میں نے اس کے سامنے کار روک دی اور اتر کر کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ اندر بیل بجی۔

ذرا ہی دیر بعد ایک باوردی گارڈ نے ذیلی دروازہ کھولا اور باہر آ کر مجھ سے بولا۔ "جی فرمایئے؟"

"مجھے میڈم شکنتلا سے ملنا ہے۔" میں نے بتایا۔

"آپ تشریف لے آیئے۔" اس نے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ شکنتلا نے اسے میرے بارے میں بتا رکھا ہے۔

ہم دونوں بنگلے کے اندر آ گئے۔ ایک جانب ایک شاندار گاڑی کھڑی تھی۔ اسی وقت میری نظر دور برآمدے میں پڑی۔ وہاں شکنتلا کھڑی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میں نے مسکرا کر جواباً ہاتھ ہلایا۔ پھر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ "نمستے!" میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے اس سے کہا۔

"نمسکار، نمسکار!" اس نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے۔ "آؤ آؤ میرے ساتھ آ جاؤ۔" وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ "مجھے شدت سے تمہارا انتظار تھا۔" وہ بولی۔

"میں لیٹ تو نہیں ہوا، صحیح وقت پر آ گیا ہوں، پھر انتظار کیوں کر رہی تھیں، انتظار تو وقت گزارنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں ...... یہ بات تو درست ہے۔" وہ آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ "لیکن پھر بھی مجھے تمہارا انتظار تھا۔ آخر ایسا کیوں تھا......؟ ہم...... تم بتا سکتے ہو راج؟"

"ارے ہوتا ہے...... جب کسی سے کوئی اہم کام ہو تو اس کا انتظار وقت سے پہلے بھی شروع ہو جاتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے یار......! چھوڑو، زیادہ نہ سوچو......!" میں نے ہنستے ہوئے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں...... ہاں......" اس نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "تم...... تم ٹھیک کہتے ہو...... جب کسی سے اہم کام ہو تو اس کا انتظار وقت سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے...... یہ...... یہ تم نے ٹھیک کہا۔" اب اس کا کھویا کھویا انداز ختم ہو چکا تھا۔ "اچھا...... یہ بتاؤ کہ کیا پینا پسند کرو گے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بھئی گرمی سی لگ رہی ہے۔ کولڈ ڈرنک مناسب رہے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"او کے......! میں خود لے کر آتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی اور تیزی سے ڈرائینگ روم سے باہر جانے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی تھی جس کے ہاتھ میں ٹرے تھی اور اس میں کولڈ ڈرنک نظر آ رہی تھی۔ اس عورت نے وہ ٹرے میرے سامنے موجود سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔ شکنتلا نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے موسی......! تم باہر ٹھہرو، کوئی کام ہوا تو بلا لوں گی تمہیں۔"

"جی اچھا......!" کہہ کر وہ عورت باہر چلی گئی اور شکنتلا میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے ٹرے میں سے کولڈ ڈرنک اٹھا کر مجھے تھما دی اور دوسری کولڈ ڈرنک اٹھا کر صوفے کی پشت گاہ سے ٹک گئی۔

ہم دونوں عام موضوعات پر بات چیت کرتے رہے اور پھر جب ہم نے کولڈ ڈرنک ختم کر لی تو میں نے شکنتلا سے کہا۔ "وہ پینٹنگز کہاں ہیں؟"

"ہاں آؤ وہ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں ڈرائنگ روم سے باہر آ گئے۔

وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ یہاں گھریلو استعمال کی کئی چیزیں پڑی تھیں اور ایک کونے میں کچھ پینٹنگز بھی موجود تھیں جو الٹی تھیں، ہم ان کے پاس پہنچ گئے۔ شکنتلا نے ایک پینٹنگ اٹھائی اور میرے سامنے سیدھا کر دیا۔ میں اسے دیکھ کر چونک گیا کیونکہ وہ ایک عورت اور مرد کی ہاتھ سے بنائی گئی تصویر تھی جو لباس سے آزاد ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

"یہ...... یہ تصویر تو بھیجنا ذرا مشکل ہو جائے گا۔" میں

نے شکنتلا کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔ "یہ نہیں بھیجنی ہے۔ یہ تو میں نے تمہیں دکھائی ہے۔"

"اوہ اچھا۔" میں مسکرا کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ وہ تصویریں دکھاؤ جو بھیجنی ہیں۔"

"ہاں...... وہ یہ ہیں۔" اس نے دو تین تصویریں ہٹائیں اور پھر مجھے کئی تصویریں دکھائیں اور ان کے بارے میں بتایا کہ وہ بھیجنی ہیں۔ میں نے انہیں بھیجنے کی ہامی بھر لی۔

ہم دونوں واپس ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے اور عام معاملات پر بات چیت کرنے لگے۔ پھر اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ "آٹھ بجنے والے ہیں، کیا خیال ہے کھانا کھا لیا جائے؟"

"ہاں بھئی......!" میں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بھوک تو لگنے لگی ہے۔"

ہم ڈائننگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ شکنتلا نے یہاں آتے ہوئے موسی کو کھانا لگانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ موسی نے کچھ ہی دیر میں کھانا لگا دیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے کافی پی اور واپس آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ ہم باتیں کرتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ رات کے بارہ بج گئے۔ شکنتلا کی بات چیت سے یوں لگتا تھا جیسے وہ باتیں ختم کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتی اور اس حسین لڑکی کی صحبت سے اٹھنے کو تو میرا بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اخلاقاً مجھے جانے کے لیے نہ کہہ پا رہی ہو۔ میں نے اس سے کہا۔

"اچھا شکنتلا......! کافی رات ہو گئی ہے۔ اب مجھے اجازت دو۔"

"کیا تم جانا چاہتے ہو؟ کوئی ضروری کام ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"نہیں ضروری کام تو نہیں ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہیں ڈسٹرب کروں، یقیناً اب تم بھی آرام کرنا چاہ رہی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "میں آرام نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے تو تمہارے ساتھ باتوں میں مزہ آ رہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ساری رات اسی طرح باتیں کرتی رہوں اور میں چاہوں گی کہ تم بھی ابھی نہ جاؤ، بعد میں چلے جانا اور اگر دیر ہو جائے تو یہیں رک جانا۔"

میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مجھے یہاں روکنا چاہتی ہے۔ اس طرح پہلے بھی کئی عورتیں اور لڑکیاں میرے ساتھ کر چکی تھیں۔ وہ مجھے روک لیتی تھیں اور پھر رات بھر ہم انجوائے کرتے تھے۔ یہاں بھی یہی کچھ ہونے کا امکان نظر آ رہا تھا۔ شکنتلا نے مجھے جذبات میں ہلچل پیدا کر دینے والی پینٹنگ بھی دکھائی تھی، یقیناً وہ بھی میرے لیے اشارہ تھا کہ میں اس کی قربت حاصل کر لوں۔ میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے...... میں یہیں ہوں۔"

ہم دونوں ایک بار پھر باتوں میں کھو گئے اور پھر رات کے دو بج گئے...... شکنتلا کی آنکھوں میں نیند کا خمار نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تمہیں نیند آ رہی ہے۔"

"ہاں اب چل کر سوتے ہیں۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے چلو۔"

وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ یہاں ایک ہی بیڈ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں یہیں سو جائیں کیا خیال ہے تمہارا......؟"

میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔ "اگر تمہاری خواہش ہے تو......"

"تو پھر آ جاؤ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے۔

طوفان گزر جانے کے بعد وہ نڈھال سی ہو گئی اور میں بھی بے دم ہو گیا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے ذرا دور جا کر لیٹے رہے اور پھر جلد ہی مجھے نیند نے دبوچ لیا۔

صبح مجھے شکنتلا نے جگایا۔ اس نے رات کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ ہم دونوں نے ناشتہ ساتھ ہی کیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”اچھا تو میں دوپہر دو تین بجے کے قریب تمہارے پاس آجاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں چونکہ شادی شدہ نہیں تھا اس لیے مجھے گھر جانے کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اکثر میں کئی کئی راتیں اپنے یاروں دوستوں کے ساتھ گزار دیتا تھا۔ میں اپنے ماتا پتا کی اکلوتی اولاد تھا۔ انہیں پتا تھا کہ میں یاروں دوستوں میں خوش رہتا ہوں اور راتیں بھی انہی کے ساتھ گزارتا ہوں اس لیے وہ بھی میرے گھر نہ آنے کی وجہ سے پریشان نہیں ہوتے تھے۔

میں اپنے آفس آ کر کام میں مشغول ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن اب تک میرے ذہن پر شکنتلا کی قربت کا خمار چھایا ہوا تھا۔ اس لیے میرا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ بے زار ہو کر میں نے کام چھوڑ دیا۔ کرشن کمار سے چائے منگوائی اور شکنتلا کے بارے میں سوچنے لگا۔ بار بار بے اختیار میری نظر دیوار گیر گھڑی پر جا رہی تھی۔ مجھے شکنتلا کا بے چینی سے انتظار تھا۔

بالآخر دو بج گئے اور پھر تین لیکن جب چار بج گئے تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اپنا موبائل فون میز پر سے اٹھایا اور شکنتلا کا نمبر ملایا۔ رابطہ ملنے پر مردانہ آواز آئی۔ ”ہیلو؟“

”ہیلو......کون بول رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

”شکنتلا سے۔“ میں نے جواب دیا۔

”شکنتلا سے؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”یہ کون صاحب ہیں؟“

مجھے شک ہوا کہ مجھ سے نمبر ملانے میں غلطی ہوئی ہے۔ میں نے سوری کہہ کر دوبارہ نمبر ملایا تو پھر اس آدمی نے ہیلو کہا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا یہ شکنتلا کا نمبر نہیں ہے؟“

”نہیں جناب! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے؟“ وہ بے زاری سے بولا۔

میں نے اسے شکنتلا کا نمبر بتایا اور بولا۔ ”یہی نمبر ہے نا آپ کا؟“

”جی ہاں بالکل۔“

”لیکن......یہ تو شکنتلا کا تھا۔“ میں حیران و پریشان ہو...

نمبر ایک سال سے میرے استعمال میں ہے۔ پلیز...... آپ مجھے بار بار پریشان نہ کریں۔ میں ایک اسکول ٹیچر ہوں اور اپنی کلاس لینے جا رہا ہوں۔ پلیز...... اگر آپ مذاق کر رہے ہیں تو اسے ختم کریں کیونکہ کہ بچوں کی تعلیم کا معاملہ ہے۔“

”جی بہت بہتر۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو میری وجہ سے پریشانی اٹھانی پڑی۔“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ تھا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں جا کر خود شکنتلا سے ملتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

میں شکنتلا کے بنگلے پر پہنچا تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا کیونکہ صبح جب میں یہاں سے گیا تھا تو اس بنگلے کی بناوٹ اور رنگ کچھ اور تھا۔

میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ کچھ ہی دیر میں ایک باوردی گارڈ نے گیٹ کھول کر باہر آیا۔ یہ وہ گارڈ نہیں تھا جسے میں پہلے یہاں دیکھ چکا تھا۔ میں نے اسے سے کہا۔

”مجھے میڈم شکنتلا سے ملنا ہے۔“

”میڈم شکنتلا؟“ اس نے قدرے حیرت سے کہا۔ ”آپ کو غلطی ہوئی ہے جی۔ یہاں کوئی میڈم شکنتلا نہیں رہتی ہیں۔“

”میڈم شکنتلا یہاں نہیں رہتیں؟“ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔

”نہیں جی!“ وہ بولا۔ یہ تو اشوک ورما کا بنگلہ ہے۔“

"اشوک ورما!" میں نے زیر لب کہا۔ پھر اس سے بولا۔ "لیکن...... کوئی شکنتلا نامی لڑکی بھی تو یہاں رہتی ہے۔ شاید ان کی بیٹی ہو۔ تم کب سے یہاں ہو؟"

"میں تو پچھلے چھ ماہ سے یہاں پر ہوں۔"

"تم کسی شکنتلا کو نہیں جانتے؟"

"نہیں جی!" اس نے نفی میں گردن ہلا کر کہا۔ "آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

میں نے بنگلے کے نمبر والی تختی پر پھر نظر ڈالی۔ شکنتلا کے بنگلے ہی کا نمبر تھا۔ میں سوچتے ہوئے گال کھجانے لگا۔

میں سوچوں کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔ پھر میں نے اس گارڈ کی طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "اچھا معاف کرنا بھائی!...... مجھے واقعی کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

میں اپنی کار میں واپس روانہ ہوگیا۔ میرا ذہن شکنتلا کے بارے میں سوچ سوچ کر تھک رہا تھا۔

میں واپس اپنے آفس آکر اپنی ریوالونگ چیئر پر ڈھے گیا۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا میرا ذہن اس کی توجیح تلاش کر رہا تھا لیکن کوئی قابل قبول بات سامنے نہیں آرہی تھی۔

جب سوچ سوچ کر میرا ذہن بری طرح تھک گیا تو میں نے سوچنا ترک کیا اور کرشن کمار سے پانی منگوا کر پیا۔ ایک سگریٹ سلگایا اور کرشن کمار کو اپنے سامنے بٹھا کر اس سے آفس کے امور پر بات چیت کرنے لگا۔ میری یہ حکمت عملی کامیاب رہی اور میں کافی حد تک شکنتلا کے اثر سے نکل آیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد میرا ذہن صحیح طور پر کام کرنے لگا اور ذہنی تھکاوٹ دور ہوگئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں شکنتلا والے معاملے پر کسی عامل وغیرہ سے بات کروں گا۔

میں اپنے دفتری کام میں مشغول تھا۔ میرے موبائل کی بیل بج اٹھی۔ میں نے میز پر سے فون اٹھایا اور اس کی اسکرین پر نمبر دیکھا۔ جو میرے کسی جاننے والے کا نہیں تھا۔ میں نے بٹن پش کرکے فون کان سے لگایا اور ہیلو کہا۔

"ہیلو...... راج کمار بات کر رہے ہیں؟" ایک نسوانی آواز آئی۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں پریانی بول رہی ہوں۔"

"اوہ اچھا تم ہو...... کیسی ہو؟" میں نے کہا۔ وہ میری جاننے والی تھی۔ اسٹیج پر گانے گاتی تھی۔ ایک فنکشن میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی خواہش پر میں نے اس کا انٹرویو ایک رپورٹر دوست سے کہہ کر اخبار میں شائع کروادیا تھا۔ اس کے بعد اس سے ایک مرتبہ ایک اور فنکشن میں ملاقات ہوئی تھی۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"اچھا تو پھر آجاؤ۔ میں آفس میں ہی ہوں۔" میں نے اس سے کہا۔

"جی بہت بہتر ہے۔ میں آتی ہوں۔"

"او کے!"

اس نے رابطہ منقطع کردیا۔ میں نے موبائل واپس میز پر رکھ دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد پریانی آگئی۔ وہ ویسے تو خاصی حسین تھی۔ لیکن آج اس نے جو ڈریس پہنا ہوا تھا اور جو میک اپ کیا تھا اس میں وہ بہت ہی زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔

اس سے رسمی بات چیت اور اس کے لیے کولڈ ڈرنک منگوانے کے بعد میں نے اس سے کہا "ہاں اب بتاؤ کیسے آنا ہوا؟"

"میری چھوٹی بہن کی سالگرہ کی تقریب ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ بھی اس میں شرکت کریں۔" اس نے جواب دیا۔

"کب ہے تقریب؟" میں نے پوچھا۔

"آج شام ہی ہے۔ رات میں گانوں کا پروگرام بھی ہے۔"

میں نے سوچا کہ اس پروگرام میں شرکت کرنا میرے

لیے مناسب رہے گا۔ اس طرح میں شکنتلا کے اثر سے پورے طور پر نکل سکتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے میں آجاؤں گا۔ کہاں ہے تمہارا گھر؟"

اس نے ایک کاغذ پر مجھے ایڈریس لکھ کر دے دیا۔ ساتھ ہی اس نے موبائل فون نمبر بھی لکھا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کاغذ کو طے کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "کتنے بجے آنا ہے؟"

"چھ بجے تک آجائیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"اچھا، مجھے اجازت دیں۔ مجھے کچھ اور لوگوں کو دعوت دینے بھی جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

وہ چلی گئی اور میں پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

☆

میں نے پریانی کے گھر کے سامنے اپنی کار روکی اور اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی، چھ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔

میں نے پریانی کی بہن کا تحفہ اٹھایا اور کار سے اترا۔ اسے لاک کیا اور پریانی کے دروازے پر آگیا۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبادیا۔ اندر گھنٹی کی آواز گونجی۔ کچھ ہی دیر بعد پریانی خود باہر آئی اور مجھے دیکھ کر خوش گوار لہجے میں بولی۔ "مجھے معلوم تھا کہ آپ ہی آئے ہوں گے۔ اس لے میں خود باہر آگئی۔"

"میری بھی عادت ہے کہ میں وقت پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ مجھے گھر میں لے آئی۔ گھر کو جھنڈیاں اور غبارے لگا کر سجایا گیا تھا۔ کافی لوگ ادھر ادھر موجود تھے۔ پریانی مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ یہاں کچھ خواتین اور آدمی موجود تھے۔ پریانی نے میرا ان سے تعارف کروایا۔ وہ اس کے رشتے دار تھے۔ ان ہی میں اس کی چھوٹی بہن نندنی بھی موجود تھی۔ وہ بھی اس کی طرح خوش شکل تھی۔

سالگرہ کی تقریب بڑے پرجوش انداز میں ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ مہمان جانے لگے۔ یہاں تک کہ سارے مہمان چلے گئے۔ لیکن رات بہت ہوگئی تھی۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے پریانی سے کہا۔ "اچھا اب مجھے اجازت دو۔"

"نہیں...... آپ نہیں جائیں گے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"کیوں؟" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ خاص بات کرنی ہے۔"

"خاص بات؟"

"جی ہاں۔"

"تو پھر اب تک کیوں نہیں کی تھی؟"

"وقت ہی نہیں ملا تھا اور موقع بھی نہیں ملا تھا۔ وہ بات میں آپ سے تنہائی میں کرنا چاہتی تھی۔"

"اوہ اچھا...... بھئی وہ کیا خاص بات ہے؟" میں نے بھویں سکیڑ کر کہا۔

"سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے ہیں اب آپ میرے کمرے میں چلیں۔ وہیں کریں گے ہم بات چیت۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے چلو!" میں نے کہا۔

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس نے کمرے کو بڑے اچھے انداز میں سجایا ہوا تھا۔ زمین پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں شاندار بیڈ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ جس کے سامنے سینٹر ٹیبل بھی موجود تھی۔ کھڑکیوں پر سرخ مخملی پردے لٹک رہے تھے اور دیگر اشیاء بھی قیمتی تھی اور سلیقے سے سجائی گئی تھی۔

"آیئے بیٹھیں۔" اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ہم دونوں وہاں ذرا فاصلے سے بیٹھ گئے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"اس رات کی تنہائی میں، اتنے خوب صورت بیڈ پر ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی کسی ہینڈسم سے کیا کہہ سکتی ہے؟" اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میرے ذہن میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ جسم میں سرور کی

لہریں دوڑنے لگیں۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔

"تم تو بہت تیز طرار ہو۔ بڑے بہانے سے مجھے یہاں تک لے آئی ہو۔"

"کیا کریں...... کسی من پسند شخص کو اسی طرح اپنے قریب لایا جاسکتا ہے۔ اس نے مستی بھری آنکھوں کے ساتھ میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔ وہ میرے کافی قریب آگئی۔ اتنا قریب کہ اس کی گرم سانسیں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔ پھر ہم دونوں کیف و سرور کی جانی پہچانی راہوں پر گامزن ہوگئے۔ جذبات کا طوفان اترا تو ہم بے دم ہو چکے تھے۔

"آپ بہت اچھے اور بھرپور ہیں۔" اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"تم بھی لاجواب ہو۔" میں نے بھی اس کی تعریف کی۔

"اچھا!" وہ پھر مسکرادی۔

"ہاں بالکل......"

کچھ دیر ہم دونوں عام امور پر بات چیت کرتے رہے اور پھر وہ سوگئی۔ میں بھی کچھ دیر بعد کسی وقت سوگیا۔

صبح مجھے پریانی نے جگایا۔ ہم نے ناشتہ ساتھ ہی کیا اور پھر میں نے اس سے کہا۔ "پریانی!...... کیا ایسا ممکن ہے کہ تم دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ؟"

دراصل میں آج اسے ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ آنے والی رات بھی اس کے ساتھ گزاری جائے۔

ٹھیک ہے، دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ کھایا جاسکتا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تو پھر تم ایک بجے تک میرے آفس آجاؤ۔ ہم وہاں سے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں چلیں گے۔" میں نے کہا۔

"میں آجاؤں گی۔"

میں اس سے رخصت آفس پہنچ کر بے چینی سے ایک بجنے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک بج گیا لیکن وہ نہ آئی۔ میں نے اس کا دیا ہوا فون نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی لیکن وہ پریانی کی نہیں لگتی تھی۔

"ہیلو...... مجھے پریانی سے بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔

"کون پریانی۔" پوچھا گیا۔

"پریانی!...... جس کا یہ فون نمبر ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ کسی پریانی کا نمبر نہیں ہے۔ یہ میرا نمبر ہے اور تم کون ہو؟" بولنے والی کا لہجہ کرخت ہوگیا تھا۔

"میں...... میں پریانی کا دوست ہوں۔

"تو پھر اس نمبر پر کیوں فون کیا؟ پریانی کے نمبر پر کرو۔"

"اس نے مجھے یہی نمبر دیا تھا۔"

"کیا نمبر ہے؟"

میں نے اسے نمبر بتایا۔ وہ بولی۔ "نمبر تو ٹھیک ہے لیکن لگتا ہے کہ تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہے اور یاد رکھو میں تم جیسوں کا دماغ درست کروانا جانتی ہوں جو مختلف بہانوں سے عورتوں کو فون کرتے ہیں۔" وہ مجھ پر برس پڑی۔

"دیکھئے محترمہ...... مجھے غلط نہ سمجھئے...... میں کوئی غلط آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے کسی بہانے سے فون کیا ہے۔ میری دوست پریانی نے مجھے یہ نمبر دیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مجھ سے اس کا نمبر نوٹ کرنے میں کچھ غلطی ہوگئی ہو۔ میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" وہ تلخی سے بولی اور رابطہ منقطع کردیا۔

میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ میرے ذہن میں شکنتلا والا واقعہ گھوم گیا تھا۔ اس نے بھی مجھے جو فون نمبر دیا تھا۔ وہ کسی اور کا تھا اور اب یہ پریانی والا معاملہ بھی اس سے ملتا جلتا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ یہ کیس بھی ویسا ہی نہ ہو لیکن اس کی تصدیق کے لیے ضروری تھا کہ میں جا کر پریانی کے گھر پر پتہ کروں۔

ذرا ہی دیر بعد میں اپنی کار میں روانہ ہوگیا۔ میں پریانی کے بارے میں بہت کچھ سوچتا جا رہا تھا۔ کبھی میرا دل کہتا

کہ وہ اپنے گھر پر ہی ہوگی اور اس نے غلطی سے مجھے کسی اور کا نمبر دے دیا ہوگا۔ جبکہ کبھی میرا دل یہ کہتا کہ یہ کیس بھی شکنتلا ہی جیسا ہے اور جب میں وہاں پہنچوں گا تو پریانی بھی مجھے وہاں نہیں ملے گی اور اس کے بارے میں بھی شکنتلا جیسا ہی کچھ سننے کو ملے گا۔

بالآخر میں پریانی کی گلی میں پہنچ گیا۔ اس کے گھر پر دور سے ہی میری نظر پڑ گئی اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ کیونکہ اس کا مکان بھی اب تبدیل ہو چکا تھا۔ کل اس مکان کی رنگت لال تھی جبکہ آج وہ پیلے رنگ کا تھا اور اس کا نقشہ تبدیل تھا۔

میں نے اس مکان کے سامنے کار روک دی اور اتر کر سوچنے لگا کہ گھر کی کال بیل بجاؤں یا نہیں کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جب گھر ہی تبدیل ہو چکا ہے تو گھر کے مکین بھی بدل چکے ہوں گے لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر کال بیل کا بٹن پش کر دیا کہ حقیقت حال ضرور دیکھنی چاہیے۔

بیل بجنے کی آواز گونجی اور ذرا دیر بعد ایک بوڑھا آدمی گھر سے باہر آ گیا۔ اس کی عمر ستر سال سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ دبلا پتلا تھا اس نے اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”جی فرمائیے!...... کس سے ملنا ہے؟“

”مجھے پریانی سے ملنا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”پریانی؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ کون پریانی؟...... کس پریانی کی بات کر رہے ہیں؟“

”کیا یہاں کوئی پریانی نہیں رہتی؟“

”نہیں جی!...... یہاں تو کوئی پریانی نہیں رہتی یہ مکان تو میرا ہے اور میں گزشتہ بیس سال سے یہاں رہ رہا ہوں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام آکاش ہے اور میری پتنی ہے لیکن اس کا نام بھی پریانی نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا۔

”مجھے شما کیجئے گا۔ مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔“ وہ بولا۔ ”ویسے اگر میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں تو بتائیے؟“

”نہیں نہیں ...... آپ کی بڑی مہربانی۔“ میں نے کہا اور واپس کار کی جانب بڑھا۔

ذرا ہی دیر بعد میں اپنی کار میں روانہ ہو گیا۔ اس واقعے نے تو مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لگاتار دو ایک جیسے واقعات پیش آئے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی پراسرار مسئلے سے دوچار ہوں اور اس کا حل کسی عامل وغیرہ کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔

میں سوچنے لگا کہ آخر کون سا عامل ایسا ہے جو میرا مسئلہ حل کر سکتا ہے ویسے تو کئی ایسے لوگ میری نظر میں تھے لیکن ان میں سے اکثر کے بارے میں جانتا تھا کہ ان کے پاس کوئی شکتی یا روحانی صلاحیت تو نہیں ہے ہاں ایک صلاحیت ضرور ان میں تھی اور وہ یہ کہ وہ لوگوں کو نہایت چالاکی سے بے وقوف بنا کر ان سے رقم بٹور لیتے تھے۔

کچھ دیر غور کرنے کے بعد میں نے شنکر داس سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا جس میں مجھے کچھ سچائی نظر آتی تھی۔ وہ جعلی عاملوں کو خوب گالیاں دیتا تھا اور انہیں برا بھلا کہتا تھا۔ اس کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اگر کسی کا کوئی مسئلہ حل کرتا تھا تو اس کے عوض کچھ نہیں لیتا تھا۔

اچانک میرے موبائل فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے اسے ڈیش بورڈ پر سے اٹھایا اور اس کی اسکرین پر نمبر دیکھا۔ وہ میرے جاننے والے کا نہیں تھا۔ میں نے اس کا بٹن پش کر کے اسے کان سے لگایا اور ہیلو کہا۔

”ہیلو!...... راج بول رہے ہو؟“ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔

”ہاں ہاں...... تم کون؟“ میں نے کہا۔

”شاردا۔“ جواب آیا۔ ”یونیورسٹی والی۔“

”او شاردا کیسی ہو تم؟ میں نے گرم جوشی سے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟“ وہ بولی۔

”بالکل ٹھیک۔“

”کہاں ہو اس وقت؟“

”اپنی کار میں۔“

”کہیں مل سکتے ہو؟“

”ابھی؟“

”ہاں...... فوری طور پر تم سے کچھ کام ہے۔“

”اسٹار ریسٹورنٹ میں آ جاؤ، میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ ہم پہلے بھی وہاں آتے جاتے رہے تھے۔

”او کے میں پہنچتی ہوں۔“ اس نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے فون واپس ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ اور شاردا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتی تھی بہت حسین و جمیل لڑکی تھی۔ یونیورسٹی کے بعد اس کی اور میری کچھ ملاقاتیں رہیں۔ اس کے بعد وہ امریکہ چلی گئی۔ اسے وہاں تقریباً ڈیڑھ سال ہوا تھا اور اب نہ جانے وہ کس وقت واپس آئی تھی۔ میں نے اس کی قربت میں بہت سے حسین لمحات گزارے تھے۔ وہ خود بھی بہت حسین تھی۔ میں اب بھی اس کی قربت کا خواہاں تھا۔ وہ بڑے بھرپور اور دلکش سراپا کی مالک تھی۔ لوگ اس کے حسن کے دیوانے تھے لیکن وہ اسے دور سے دیکھ کر رال ہی ٹپکا سکتے تھے کیونکہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ جبکہ میں وہ خوش نصیب تھا جس نے اس کے جسم کے نشیب و فراز سے آگاہی حاصل کی تھی۔

اس کے ساتھ گزارے ہوئے ماضی کے حسین لمحے میرے اندر کیف و سرور کی لہریں دوڑا رہے تھے۔ اسی وجہ سے میں نے بے اختیار کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ میں جلد از جلد اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاردا کا بھی شکنتلا اور پریانی جیسا ہی کیس ہو اور اس کی بھی حقیقت کچھ اور ہو؟ اس خیال نے کافی حد تک میرے جذبات کا جھٹکا پہنچایا میرا جوش خاصی حد تک کم ہو گیا۔

میں نے مزید سوچا اور فیصلہ کیا کہ میں شاردا سے مل لیتا ہوں لیکن اگر اس نے بھی مجھے کہیں آنے کی دعوت دی تو میں اس سے پہلے شنکر داس کے پاس جاؤں گا۔

میں اسٹار ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔ وہاں کافی لوگ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے میں نے متلاشی نگاہیں مختلف اطراف میں دوڑائیں اور ایک کونے میں مجھے شاردا بیٹھی نظر آئی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلایا جواب میں میں بھی ہاتھ ہلاتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اس کے پاس پہنچ کر گرم جوشی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”کیسی ہو شاردا تم؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

میں کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”کب آئیں تم امریکہ سے؟“

”ابھی پچھلے ہفتے ہی آئی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا اچھا...... اب کب تک رکنے کا ارادہ ہے...... کیا مستقل یہیں رہو گی؟“

”نہیں...... ہفتے دس دن میں جانا ہے۔“

”اوہ...... کاش تم مستقل یہیں رک جاتیں۔“

”تاکہ تمہارے مزے آ جاتے۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”ہاں بالکل۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے ساتھ بیتے حسین لمحوں کو میں کبھی بھلا ہی نہیں سکتا۔ دل چاہتا ہے کہ تم یہیں رہو اور ہم ان لمحات کا اعادہ کرتے رہیں۔“

”مگر افسوس کہ تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی، مجھے جلد ہی واپس جانا ہے۔“

”چلو چھوڑو ان باتوں کو...... یہ بتاؤ کہ کیا کھاؤ پیو گی؟“

”بہت کچھ...... تم یہ بتاؤ کہ تم کیا کھانا پینا پسند کرو گے؟“

”جو تم منگوا لو۔“

اوکے کہہ کر اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ وہ ہمارے قریب آ گیا۔ شاردا نے اسے آرڈر دے دیا۔ وہ واپس چلا گیا۔

ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم نے ساتھ ہی چائے وغیرہ پی اور میں نے اس سے کہا۔ ''اچھا اب تمہارا کیا پروگرام ہے شاردا!''

''میں تو گھر جاؤں گی۔ تم کہاں جا رہے ہو۔'' وہ بولی۔

''میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔''

''پھر کب ملاقات ہوگی؟''

''جب تم کہو؟''

''آج رات آ جاؤ گھر پر۔''

اس کی بات سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ میں جب تک کرشن داس سے نہ مل لوں۔ میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا لیکن میں نے اس سے صاف انکار کرنا مناسب نہ سمجھا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے شاردا!...... میں آ جاؤں گا تمہارے گھر۔''

''اب وہ گھر نہیں ہے ہمارا...... بدل چکا ہے۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے...... مجھے بتا دو کہ اب کہاں ہے تمہارا گھر؟'' میں نے کہا۔

اس نے اپنے پرس میں سے ایک کاغذ اور قلم نکالا۔ کاغذ پر اس نے ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر مجھے دے دیا۔ میں نے اس پر نظر ڈال کر اسے جیب میں رکھ لیا اور شاردا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اوکے...... میں آ جاؤں گا۔''

''رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھانا۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے۔''

''سات بجے تک آ جانا۔''

''اوکے!'' میں نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔

ذرا ہی دیر بعد میں اپنی کار میں روانہ ہو گیا۔ شاردا سے میری جو بات چیت ہوئی تھی۔ اس سے مجھے واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ شکنتلا اور پریانی والی کہانی دہرائی جا رہی ہے۔ کیونکہ شاردا نے کئی ایسی باتیں کی تھیں جو شکنتلا اور پریانی کر چکی تھیں۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ شاردا کا فون نمبر ملا کر دیکھوں۔ اگر اس نے بات کی تو اس کا مطلب ہوگا کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں اور اگر کسی اور نے اٹینڈ کیا تو ثابت ہو جائے گا کہ میں شاردا پر درست شک کر رہا ہوں۔''

میں نے کار سڑک کے کنارے روک دی۔ جیب سے شاردا کا دیا ہوا کاغذ نکالا اور اس پر درج فون نمبر اپنے فون سے ملایا۔

رابطہ ملنے پر آواز آئی۔ ''ہیلو؟''

آواز شاردا ہی کی لگتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ہیلو کون...... شاردا بول رہی ہو؟''

''ہاں ہاں...... تم؟''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میں راج بول رہا ہوں۔''

''ہاں راج بولو۔'' وہ بولی۔

''یار...... میں ایک جگہ جا رہا ہوں۔ اگر وہاں مجھے دیر ہو گئی تو شاید میں تمہارے پاس آنے میں بھی لیٹ ہو جاؤں گا۔ تم آٹھ بجے تک میرا ویٹ کرنا۔'' میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''اوکے اوکے نو پرابلم میں کر لوں گی ویٹ۔'' وہ بولی۔

''اوکے تھینک یو۔'' کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔''

میں شاردا کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں رات میں اس کے پاس جاؤں گا۔ اس کے باوجود میں نے شنکر داس سے ملنے کا ارادہ بھی ترک نہیں کیا تھا اور پھر میں شنکر داس کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ کار روک کر میں اس سے اترا اور شنکر داس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

کچھ دیر بعد شنکر داس باہر آ گیا۔ وہ خاصا موٹا ہو گیا تھا۔ اس کی عمر پچاس سال تھی لیکن وہ چالیس سال کا لگتا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پرجوش انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''ارے بھئی!...... بڑے لوگ ہمارے غریب خانے

پر آئے ہیں۔"

میں نے پیچھے مڑ کر اور پھر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس سے کہا۔ کہاں ہیں بڑے لوگ؟"

"ارے میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"میں تو بڑے لوگوں میں شمار نہیں ہوتا۔ بڑا چھوٹا آدمی ہوں۔"

"ارے تم بڑے ہو...... آجاؤ آجاؤ، اندر آجاؤ۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

میں اس کے ساتھ گھر کے اندر آ گیا۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے آیا۔ جسے وہ نشست گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ یہاں دری بچھی ہوئی تھی جس پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔

"اور سناؤ...... ہمارے غریب خانے کا راستہ کیسے یاد آ گیا؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"یار میں ایک مسئلے سے دوچار ہوں۔" میں نے بتایا۔

اس کی بھویں سکڑ گئیں۔ اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے اسے سارے حالات بتا دیئے۔ وہ اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "مجھے حساب لگا کر دیکھنا پڑے گا۔"

"کس طرح لگاؤ گے حساب؟" میں نے پوچھا۔

"ایک عمل کرنا پڑے گا۔ تمہارے سامنے ہی کروں گا میں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔" وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک انگیٹھی تھی جسے اس نے ایک جانب رکھ دیا۔ اس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ اس نے ایک کونے میں پڑی کچھ چیزیں اٹھا کر اس انگیٹھی کے پاس رکھ دیں اور خود بھی آلتی پالتی مار کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ڈبے میں سے کوئی سفوف نکال کر کوئلوں پر ڈالا جس کی وجہ سے دھواں اٹھنے لگا۔

شنکر داس تھوڑا تھوڑا سفوف کوئلوں پر ڈالنے لگا اور زیر لب کچھ پڑھنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ انگیٹھی کمرے سے باہر چھوڑ آیا اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے قریب پڑا کاغذ کا پیڈ اور قلم اٹھا لیا اور کچھ لکھنے لگا۔ اس کی تحریر مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ ہندسے بھی لکھتا جا رہا تھا۔

پھر اس نے قلم پیڈ پر رکھ دیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تم بہت خوش قسمت ہو۔"

"اچھا...... وہ کیسے؟" میں نے بلاتوقف کہا۔

وہ بولا۔ "آج تم میرے پاس آئے۔ بس یہی تمہاری خوش قسمتی ہے ورنہ آج کی رات تمہارے جیون کی آخری رات ثابت ہوتی۔"

"کیا؟" میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں......" وہ بولا۔ "آج رات اس آتما نے تمہارے جیون کا خاتمہ کر دینا تھا۔"

"کس آتما نے؟" میں نے بلاتوقف کہا۔

"وہی...... جس سے تم آج ملنے کا وعدہ کر کے آئے ہو۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے اسے شاردا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب اس سے کہا۔ "میں آج اپنی ایک پرانی دوست شاردا سے ملنے کا وعدہ کر کے آیا ہوں۔"

"وہ تو مر چکی ہے۔" اس نے کہا تو میں یوں اچھلا جیسے مجھے بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔ ساتھ ہی بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"کیا!!"

"ہاں مترا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور وہ دونوں لڑکیاں بھی مر چکی ہیں جن کے ساتھ تم گزشتہ راتوں میں رہے ہو۔"

"اوہ۔" میں ایک بار پھر حیرت سے اچھلا۔ "یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"لیکن...... یہ سب کیا چکر ہے؟"

"میں ذرا اس آتما کو قابو میں کر لوں جس نے یہ چکر چلایا تھا۔ اس کے بعد تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔" اس نے کہا اور اپنے گلے میں جھولنے والی مالا اتار لی۔ آنکھیں بند کر کے وہ مالا کے موتی چلانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ وہ زیر لب بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔

میں اس کی دی ہوئی اطلاعات پر اب بھی حیران پریشان تھا۔ اس نے تو مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو آج رات میرے جیون کی آخری رات ہو سکتی تھی اور وہ تینوں لڑکیاں مر چکی ہیں جن سے میں نے ملاقات کی تھی۔

اگر کسی اور ذریعے سے مجھے یہ اطلاعات ملتیں تو شاید میرا دماغ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتا لیکن اس وقت شنکر داس میرے ساتھ تھا جو ایسے معاملات کو سنبھال سکتا تھا اسی لئے مجھے حوصلہ ملا ہوا تھا۔

کچھ دیر تک شنکر داس اپنا عمل کرتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مالا دوبارہ اپنے گلے میں ڈال لی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کمرے کے ایک کونے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بوتل اٹھا کر مجھے دے دو۔"

میں اٹھا اور وہ بوتل اٹھا کر اسے دے دی جو کہ خالی تھی اور پھر میں واپس جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس نے بوتل مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں اس بوتل میں اس آتما کو بند کر دوں گا۔"

"لیکن...... وہ ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔ "بس ابھی ذرا دیر میں آ جائے گی وہ۔" اس نے جواب دیا اور کمرے کے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اسی جانب نظریں گھما دیں۔ دروازہ بند تھا۔

ذرا ہی دیر بعد دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا اور اسی کے ساتھ وہاں سے دھواں اندر داخل ہونے لگا لیکن جب وہ دھواں پوری طرح اندر داخل ہو گیا تو یہ وضاحت ہو گئی کہ وہ کسی انسان سے مشابہ ہے لیکن ان کا چہرہ غیر واضح تھا۔

شنکر داس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بوتل کا ڈھکنا اتار دیا اور ایک ہاتھ اس دھوئیں کی طرف پھیلا دیا۔ ساتھ ہی وہ زیر لب کچھ پڑھنے بھی لگا تھا۔

آہستہ آہستہ دھواں اس کے قریب آ گیا۔

"راج!...... میں تمہیں اس آتما کا اصل روپ دکھانا چاہوں گا۔" شنکر داس نے مجھ سے کہا پھر اس دھوئیں کی جانب دیکھتے ہوئے زیر لب بڑبڑانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس دھوئیں نے ایک واضح شکل اختیار کرنا شروع کر دی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ٹھوس صورت میں آتی جا رہی ہے اور پھر کچھ ہی دیر بعد ایک نہایت بوڑھی اور مکروہ شکل والی عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔

"یہ ہے اس کا اصل روپ۔" شنکر داس نے اس کے بارے میں مجھ سے کہا۔

"یہ...... یہ تو بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" شنکر داس خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اور آج رات یہی تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی۔ وہ اس آتما کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی وہ زیر لب بڑبڑانے لگا تھا۔ وہ آتما ایک بار پھر دھوئیں کی صورت میں آ گئی اور آہستہ آہستہ بوتل میں جانے لگی۔ بالآخر وہ پورے طور پر بوتل میں چلی گئی تو شنکر داس نے بوتل کا ڈھکنا لگایا اور بوتل کو اپنے قریب ہی رکھ لیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ہاں تو دیکھا تم نے اس آتما کو۔"

"ہاں...... لیکن یہ میری جان کیوں لینا چاہتی تھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جنسی ہوس!"

"کیا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ "یہ ایک ایسی عورت کی آتما ہے جسے اس کے پتی نے کسی غیر مرد کے

ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا کیونکہ وہ اپنی پتنی پر بہت اعتبار کرتا تھا۔ دل ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ اس کی مردانہ غیرت بھی جوش مارنے لگی تھی۔ اس کا اپنی پتنی سے جھگڑا ہوا۔ پتنی نے اسے واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ صرف اس کے سہارے نہیں رہ سکتی، وہ دوسرے مردوں سے تعلقات رکھتی ہے اور آئندہ بھی رکھے گی۔ اس آدمی کو جوش آگیا۔ اس نے اس عورت کو پکڑ کر تہ خانے میں قید کردیا۔ وقت گزرتا رہا۔ ان دونوں کی جوانی گزر گئی لیکن اس آدمی نے اپنی پتنی کو آزاد نہیں کیا حتیٰ کہ دونوں بہت ہی بوڑھے ہوگئے۔ بالآخر اس آدمی نے اس عورت کو آزادی دے دی۔ لیکن اس کے کچھ دن بعد ہی وہ بوڑھا مرگیا اور پھر اس کے کچھ عرصے بعد وہ بڑھیا بھی ایک حادثے میں مرگئی۔ بس کہانی یہ تھی کہ وہ بڑھیا جو کچھ اپنی زندگی میں نہ کرسکی وہ سب کچھ مرنے کے بعد کررہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کچھ عملیات بھی کیے تھے جن سے اس نے مرنے کے بعد فائدہ اٹھایا۔ وہ عملیات ایسے ہی تھے کہ کوئی مرد اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ بڑھیا نے ان کے ذریعے اپنی جنسی خواہشات پوری کرنا شروع کردیں۔ وہ ہر سال چاند کی مخصوص تاریخوں میں کسی ایک زندہ مرد اور تین مری ہوئی عورتوں کا انتخاب کرتی اور پھر ان کے ساتھ وہی کھیل کھیلتی جو وہ تمہارے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس مرد کو ان تین عورتوں کے بارے میں یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ مرچکی ہیں کیونکہ ان سے ملے ہوئے اس مرد کو کافی عرصہ گزر چکا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ آتما اپنا کھیل کھیلنے کے لیے پوری طرح منصوبہ بناتی تھی تاکہ مرد کو کسی قسم کا شک نہ ہوسکے۔ وہ تین راتوں تک اس مرد سے خوب جنسی بھوک مٹاتی تھی اور پھر آخری رات کو اس مرد کو ماردیتی تھی تاکہ بعد میں وہ حقیقت سامنے آجانے کے بعد کسی طرح اس کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔ بہر حال...... تم خوش قسمت ہو کہ آج رات اس عورت یعنی آتما کے پاس جانے سے قبل میرے پاس آگئے۔"

میں نے ایک گہرا سانس لے کر اس سے کہا۔ "شنکرداس...... تم نے میری جان بچائی۔ تم میرے محسن ہو۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "تم جانتے ہو کہ میں اس طرح کے کسی کام کے کسی سے کوئی پیسے یا خدمت نہیں لیتا ہوں۔ بس میرے لیے یہی خوشی کی بات ہے کہ تم بچ گئے اور یہ۔" اس نے بوتل کی طرف دیکھا۔ خونی آتما میری قید میں آگئی۔"

میں بھی اس بوتل میں بند آتما کو دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں شنکرداس کے پاس نہ آیا ہوتا تو آج رات اس کا شکار ہوجاتا۔

کچھ ہی دیر بعد شنکرداس سے اجازت لے کر اس کے گھر سے باہر آگیا اور اپنی کار میں روانہ ہوگیا۔ میں نے جیب سے اپنا موبائل فون اٹھایا اور اس سے شاردا کا موبائل فون نمبر ملایا۔ بیل ہونے لگی۔ اس سے پہلے کے دوسری جانب سے کال ریسیو کی جاتی۔ میں نے کال کاٹ دی اور فون ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

ذرا ہی دیر بعد فون کی بیل بجی۔ میں نے اسے اٹھا کر اسکرین پر نمبر دیکھا۔ وہ شاردا کا نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ہیلو کہا۔

"جی فرمایئے!...... آپ نے مجھے کیوں بیل دی؟"

دوسری جانب سے ایک مردانہ بھاری آواز آئی۔

"سوری...... میں نے غلطی سے یہ نمبر ملادیا تھا اس لیے میں نے آپ کے کال ریسیو کرنے سے پہلے ہی اسے کاٹ دیا تھا۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"اوکے اوکے!" اس نے کہا اور میں نے رابطہ کاٹ کر فون ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ میں اب کافی حد تک مطمئن تھا۔ جبکہ اس خونی آتما کا کچھ اثر اب بھی میرے ذہن میں موجود تھا۔

☆☆☆

کمزور عقیدہ خواتین کے لیے بطور خاص ایک رہنما تحریر

شہاب شیخ

سراب



سراب

شہاب شیخ

خواتین خواہ ان کا تعلق دنیا کے کسی بھی خطے سے ہو بہر صورت اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتی ہیں اور اس کے لیے وہ ہمیشہ شارٹ کٹ ڈھونڈتی ہیں۔ اس شارٹ کٹ کی تلاش بعض اوقات انہیں بدنامی اور تباہی کے گڑھے تک بھی لے جاتی ہے۔

ایک دوشیزہ کا احوال' وہ اپنے محبوب کی تلاش میں ایک بھیڑیے کے بھٹ تک چلی گئی تھی۔

کمزور عقیدہ خواتین کے لیے بطور خاص ایک رہنما تحریر

''ارے سلمٰی!......تم آخر بیٹھے بیٹھے کن خیالوں میں کھو جاتی ہو؟'' فاخرہ نے کہا تو سلمٰی چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آ گئی اور اُس نے شرمندہ مسکراہٹ کے ساتھ فاخرہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

''نہیں' کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''کوئی خاص بات تو ہے ورنہ کوئی اس طرح خیالوں میں کھوتا ہے؟ چلو سچ سچ بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟'' فاخرہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اُس سے کہا۔

''معاملہ؟'' سلمٰی سوچنے لگی۔

''ارے بتا دو چاند!......اب ہم سے بھی چھپاؤ گی اپنی باتیں؟'' فاخرہ نے سلمٰی کی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''چلو شاباش کیا بات ہے؟ میں کئی دنوں سے یہ بات نوٹ کر رہی ہوں' کالج میں بھی تم اکثر اس طرح بیٹھے بیٹھے کھو جاتی ہو۔''

سلمٰی نے سوچتے ہوئے سر کھجایا اور پھر اُس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''میں...... میں کسی کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔''

''اوہو!......تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں ہے۔'' فاخرہ گردن ہلاتے ہوئے شکایتی لہجے میں بولی۔

''دراصل...... میں تمہیں بتانا تو چاہتی تھی لیکن...... میرا خیال تھا کہ تم میرا مذاق اڑاؤ گی کیوں کہ میں ہمیشہ محبت کی مخالفت کرتی رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''لیکن......اب میں پریشان ہو رہی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں۔''

''کیا مطلب؟'' فاخرہ نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''کیا مسئلہ ہے' مجھے بتاؤ؟''

''وہ بہت غریب لڑکا ہے اور پڑھا لکھا بھی نہیں ہے۔ ایک دکان پر ٹیلرنگ کا کام کرتا ہے۔'' سلمٰی نے بتایا۔

''اوہو تو ہماری شہزادی ایک غریب سے دل لگا بیٹھی ہے۔'' فاخرہ شوخ انداز میں بولی۔ ''لیکن فکر نہ کرو۔ محبت میں تو ایسا ہوتا رہا ہے۔ ماضی پر نظر ڈالو تو ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ لڑکی امیر تھی اور لڑکا غریب تھا یا لڑکا امیر تھا اور لڑکی غریب تھی۔ بہر حال یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔''

''مسئلہ نہیں ہے؟'' سلمٰی نے شکایتی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''میرے لیے تو یہ سب سے بڑا

مسئلہ بنا ہوا ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے؟"

"دیکھو بھئی!...... میری ڈکشنری میں مسئلہ اُسے کہتے ہیں جس کا کوئی حل نہ نکل سکے لیکن یہ تو ایسا معاملہ ہے جس کا حل نکل سکتا ہے لہٰذا میں تو اسے مسئلہ نہیں مانتی۔" فاخرہ بولی۔

"تو پھر بتاؤ اس کا کیا حل ہے؟" سلمٰی نے جلدی سے کہا۔

"ارے بی بی!...... ذرا سوچنے تو دو تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار نظر آرہی ہو۔ پہلے تو تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ وہ کون ہے کہاں ہوتا ہے تم لوگ کہاں ملتے ہو کیا کیا بات چیت ہو چکی ہے پھر میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ اب تمہیں کیا کرنا چاہیے۔" فاخرہ نے کہا۔

"اُس کا نام حبیب ہے۔ ہمارے محلے میں ہی ایک ٹیلرنگ شاپ ہے وہ وہاں کام کرتا ہے۔ میں وہیں سے اپنے کپڑے سلواتی ہوں وہاں پر جو دکان کے مالک ہیں ماسٹر لطیف صاحب وہ تو بڑے پرانے آدمی ہیں ان کے پاس کاریگر آتے جاتے رہتے ہیں حبیب کو آئے ہوئے تین چار ماہ ہوئے ہیں۔ جب میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تو میں اپنا دل دے بیٹھی تھی۔" سلمٰی نے بتایا۔

"بات چیت کیسے شروع ہوئی تھی؟" سلمٰی نے شوخی سے کہا۔

"میں کپڑے دینے گئی تو میں نے حبیب کو دیکھا اُس نے بھی میری طرف دیکھا میں ماسٹر صاحب سے باتیں کر رہی تھی لیکن بار بار بے اختیار حبیب کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ جو ایک جانب بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ بھی بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس روز تو اُس سے میری کوئی بات چیت نہیں ہو سکی لیکن جب میں دوسری مرتبہ دکان پر گئی تو ماسٹر صاحب نہیں تھے۔ مجھے دیکھ کر حبیب اٹھا اور کاؤنٹر پر آ گیا۔ میں نے اُس سے کپڑوں کے بارے میں بات چیت شروع کر دی اور پھر اس طرح ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک روز وہ مجھے دکان پر اکیلا مل گیا۔ اُس نے مجھ سے اظہار محبت کر ڈالا۔ میں تو ویسے بھی دل میں اُس کی محبت لیے بیٹھی تھی اس لیے میں نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا اور پھر ہم مختلف پارکوں اور ہوٹلوں وغیرہ میں ملاقاتیں کرنے لگے۔ ہم دونوں ہی چاہتے ہیں کہ شادی کر لیں؛ ابھی نہیں جب میری تعلیم مکمل ہو جائے لیکن سب سے بڑا مسئلہ سامنے یہی آ رہا ہے کہ وہ غریب ہے اور غیر تعلیم یافتہ ہے۔ ایسے رشتے کو تو تم جانتی ہو کہ میرے گھر والے کسی صورت قبول نہیں کریں گے شاید وہ غریبی کو تو کس طرح برداشت بھی کر لیں لیکن وہ کسی صورت غیر تعلیم یافتہ شخص سے میری شادی نہیں کریں گے۔ یہی مسئلہ ہے اب بتاؤ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟" سلمٰی نے فاخرہ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم اپنے گھر والوں سے بات کر کے دیکھو۔" وہ بولی۔

"ناممکن!...... وہ لوگ تو کسی صورت نہیں مانیں گے۔" سلمٰی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" فاخرہ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ "کیا تم اس کے ساتھ بھاگنے کی ہمت رکھتی ہو؟"

"نہیں۔" سلمٰی نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلائی۔ "یہ تو میرے لیے ناممکن ہے۔"

"لیکن...... محبت میں تو بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔" فاخرہ نے دلیل دی۔

"بھئی!...... تم میں یہ ہمت ہے مجھ میں نہیں۔" سلمٰی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ فاخرہ تین سال قبل ایک لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو کر بھاگ گئی تھی لیکن وہ لڑکا اُسے راستے ہی میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اس لیے وہ واپس آ گئی تھی۔ فاخرہ ذرا کھلے مزاج کی لڑکی تھی اور

اس میں حوصلہ بھی بہت تھا لیکن سلمٰی اس کی خرابیوں کے باوجود اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی تھی کیوں کہ وہ اس کی سلمٰی کی بچپن کی سہیلی تھی۔

"اچھا تو پھر ایک اور کام کرتے ہیں۔" فاخرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" سلمٰی جلدی سے بولی۔

"کوئی ایسا عمل کراتے ہیں جس سے تمہارے گھر والے مان جائیں۔" اُس نے جواب دیا۔

"عمل؟" سلمٰی نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "ایک عامل صاحب میرے جاننے والے ہیں۔ وہ تمہیں ایسے تعویذ گنڈے دے سکتے ہیں جن سے تمہارا کام ہو جائے گا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

"یہ...... یہ مناسب رہے گا۔" سلمٰی نے قدرے پُرجوش انداز میں کہا۔ اُسے یہ طریقہ محفوظ محسوس ہوا تھا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم ابھی چلو میرے ساتھ ان کے پاس۔" فاخرہ بولی۔

"لیکن...... وہ ہیں کہاں پر؟" سلمٰی نے کہا۔

"ارے بھئی!...... زیادہ دور نہیں ہے۔ اب تم یہ چاہو کہ تم اتنا بھی نہ کرو اور تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے تو یہ مشکل ہے۔" فاخرہ نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ارے ناراض کیوں ہو رہی ہو؟" سلمٰی نے اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے منانے والے انداز میں کہا۔ "میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں نہیں جاؤں گی؛ میں تو یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ وہ عامل صاحب کتنی دور رہتے ہیں تاکہ میں امی کو اسی حساب سے بتا سکوں کہ میں کتنی دیر میں آؤں گی۔"

"ہمیں آنے جانے میں دو تین گھنٹے تو لگ جائیں گے۔" فاخرہ نے کہا۔

"اچھا۔" سلمٰی نے ذرا سوچا۔ "تو پھر میں امی سے کہہ دیتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ کپڑے خریدنے جا رہی ہوں۔"

"ہاں یہ مناسب رہے گا۔" فاخرہ نے اُس کے خیال سے اتفاق کیا۔ "جاؤ امی کو بتا کر آؤ۔"

"میں ابھی آئی۔" سلمٰی کہتے ہوئے اٹھی اور تیزی سے امی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ذرا دیر بعد وہ فاخرہ کے پاس واپس آ کر بولی۔

"میں نے امی کو بتا دیا ہے چلو۔"

فاخرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ذرا دیر بعد وہ لوگ ایک لوکل بس میں روانہ ہو گئیں اور پھر وہ ایک اسٹاپ پر اُتر گئیں۔ یہ مضافاتی علاقہ تھا اور سامنے غریبوں کی ایک بستی نظر آ رہی تھی۔ فاخرہ نے اُس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ سامنے بستی میں رہتے ہیں عامل بابا۔"

وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چل پڑیں۔

کچھ دیر بعد وہ بستی میں داخل ہو گئیں۔ یہاں کچے پکے مکان موجود تھے۔ لوگ اِدھر اُدھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ جا بہ جا چھپڑا ہوٹل اور خستہ حال دکانیں موجود تھیں۔

"بس...... یہی ہے عامل بابا کا گھر۔" ایک جگہ رُکتے ہوئے فاخرہ نے سامنے موجود ایک نیم پختہ گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سلمٰی بھی رُک گئی۔ گھر کے دروازے پر میلا سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ فاخرہ نے پردہ ہٹایا۔ دروازہ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ اندر سے گھر پختہ اور خاصا بہتر تھا۔ صحن کے بعد برآمدہ تھا جہاں کچھ لوگ دری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں عورتیں زیادہ تھیں۔

وہ دونوں ان عورتوں کے پاس پہنچ گئیں۔ ایک آدمی ان کے قریب آ گیا۔ وہ تیس بتیس سال کا تھا۔ اُس نے ہلکی داڑھی رکھی ہوئی تھیں۔ سر پر سفید ٹوپی تھی جب کہ کپڑے بھی سفید ہی پہن رکھے تھے اور کاندھوں پر

ایک چھوٹی سی چادر بھی موجود تھی۔ فاخرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے سلام کرتے ہوئے کہا۔ کیسے ہو تم نظام؟"

اُس نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ "میں تو ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟"

"بالکل ٹھیک۔" فاخرہ بولی۔ پھر اُس نے سلمیٰ کی طرف اشارہ کر دیا۔ "یہ میری سہیلی ہے سلمیٰ۔"

"اچھا اچھا۔" نظام نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ سلمیٰ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اُسے سلام کیا اُس نے جواب دیا۔

"ان کا ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔" فاخرہ بولی تو نظام نے سلمیٰ پر سے نظریں ہٹا کر اُس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"مسئلہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ یہاں سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔" اُس نے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ "بی بی!...... آپ بالکل بے فکر رہیں...... آپ کی مراد پوری ہوگی۔"

"جی ہاں...... میں یہی اُمید لے کر یہاں آئی ہوں۔" سلمیٰ نے اُس سے کہا۔

"اُمید نہیں...... یقین بی بی یقین۔" نظام نے تصیح کی۔

"یہاں جب بھی آؤ تو اُمید نہیں یقین لے کر آؤ۔"

"جی جی ہاں، جی ہاں۔" سلمیٰ بولی۔

"آپ لوگ بیٹھیں، جیسے ہی آپ لوگوں کی باری آئی بابا جی کے پاس لے جاؤں گا آپ لوگوں کو۔" نظام نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں وہاں موجود لوگوں کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ نظام ایک جانب جا کر ایک بوڑھی عورت سے آہستہ آواز میں کچھ بات چیت کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد نظام، سلمیٰ اور فاخرہ کو لے کر بابا جی کے کمرے میں آ گیا۔

فاخرہ نے عقیدت بھرے انداز میں بابا جی کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی اُس نے یہ بھی سوچا کہ بابا جی تو زیادہ عمر کے نہیں ہیں جب کہ اُس نے تو یہ سوچا تھا کہ وہ عمر رسیدہ ہوں گے جب کہ بابا جی کی عمر چالیس پینتالیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کی داڑھی کے بال بھی زیادہ سفید نہیں تھے۔ ان کا حلیہ بھی نظام سے ملتا جلتا تھا۔

انہوں نے فاخرہ اور سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ ان دونوں نے انہیں سلام کیا۔ بابا جی نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا اور اپنے سامنے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ فاخرہ نے بابا جی کا ہاتھ چوما اور سلمیٰ کو بھی ایسا ہی کرنے کا اشارہ کیا۔ سلمیٰ نے بھی بابا جی کا ہاتھ چوما۔ فاخرہ نے سلمیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بابا جی سے کہا۔ "بابا جی!...... یہ میری سہیلی سلمیٰ ہے اسے ایک لڑکے حبیب سے پیار ہو گیا ہے، وہ غریب ہے، درزی ہے۔ یہ پڑھے لکھے لوگ ہیں اس لیے یہ حبیب کے بارے میں اپنے ماں باپ سے بات چیت نہیں کر سکتی ہے، گھر سے بھاگ جانے کی ہمت بھی نہیں ہے اس میں بس۔ یہ چاہتی ہے کہ کس طرح اس کا مسئلہ حل ہو جائے، اب آپ ہی کچھ کریں اس کے لیے۔

"ہوں۔" بابا جی نے فاخرہ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "کرتے ہیں کچھ اس کے لیے۔"

"بابا جی!...... آپ کو اس کے لیے خصوصی توجہ دینی ہے۔ میری بہت پیاری سہیلی ہے یہ۔" فاخرہ نے منت کرنے والے انداز میں کہا۔ ساتھ ہی اُس نے اُن کے ہاتھ بھی تھام لیا تھا۔

بابا جی کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور بولے۔ "تم فکر نہ کرو۔ یہ تمہارے ساتھ آئی ہے اس لیے ہم اس پر خصوصی توجہ ہی کریں گے۔"

فاخرہ نے سلمیٰ کی طرف دیکھ کر قدرے پر جوش انداز میں کہا۔ "بس اب تم بے فکر رہو...... تمہارا کام جلدی

ہی ہو جائے گا۔"

سلمیٰ نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

فاخرہ نے بابا جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تو بتائیں بابا جی سلمیٰ کو کیا کرنا ہے؟"

"بتاتے ہیں بتاتے ہیں۔" بابا جی نے مسکرا کر کہا۔ قدرے توقف کے بعد انہوں نے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ "تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

"سلمیٰ انیس!...... انیس والد صاحب کا نام ہے۔" سلمیٰ نے جواب دیا۔

"ہوں۔" بابا جی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "والدہ کا نام؟"

"نسیمہ بیگم!"

"نسیمہ بیگم!" بابا جی نے آہستہ سے کہا اور سوچنے لگے۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولے۔ "تمہارے ساتھ تو کچھ گڑبڑ بھی لگتی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ بابا جی!" سلمیٰ فکر مندی سے بولی۔

"ہمیں کچھ محسوس ہو رہا ہے۔ یہ تو ہم حساب کتاب لگائیں گے تو پتہ چلے گا۔" وہ بولے۔

"تو آپ لگائیں ناں حساب کتاب۔" فاخرہ نے جلدی سے کہا۔

"لگاتے ہیں لگاتے ہیں۔ تم جلد بازی نہ کرو بی بی۔" بابا جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ انہوں نے اپنی تسبیح اپنے منہ کے قریب کر لی اور آنکھیں موند لیں۔

ذرا دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ "ہاں بھئی!...... ذرا ان کا مسئلہ تو معلوم کرو؟" انہوں نے مدھم آواز میں تسبیح سے کہا۔ آواز اس قدر ضرور تھی کہ فاخرہ اور سلمیٰ کے کانوں تک آ گئی تھی۔

بابا جی یوں ہوں ہاں، کرنے لگے جیسے وہ کسی سے باقاعدہ بات چیت کر رہے ہوں۔ وہ بولے۔ "ٹھیک ہے...... یہ کر لیتے ہیں، تم بھی دھیان رکھنا۔" انہوں نے تسبیح گود میں رکھ لی اور سلمیٰ کی طرف دیکھ کر بولے۔

"تمہارے ساتھ ایک جنات کا معاملہ ہے۔"

"جی؟" سلمیٰ حیرت زدہ رہ گئی۔

"گھبراؤ نہیں۔" بابا جی تسلی آمیز لہجے میں بولے۔

"یہ تو اچھا ہوا کہ تم ہمارے پاس آ گئیں...... دراصل یہ جن بچپن سے ہی تمہارے ساتھ لگا ہوا ہے اور یہ کسی مرد کو تمہارے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا اس لیے اگر تمہاری شادی ہو جاتی تو یہ تمہارے شوہر کو مار دیتا بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ شادی سے پہلے ہی مار دیتا لیکن ہمیں اس کا پتہ چل گیا ہے۔ ہمارے اپنے قبضے میں کئی جنات ہیں اور ابھی ہم ایک جن سے ہی بات چیت کر رہے تھے، ہم اُس سے مختلف کام لیتے ہیں، اُس نے ہمیں بتایا ہے کہ تمہارے ساتھ یہ معاملہ ہے۔ بہر حال...... اب تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ایسا کام کر دیں گے کہ وہ جن حبیب کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

"اوہو!...... یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ہم لوگ یہاں آ گئے ورنہ حبیب کو تو بہت نقصان پہنچ سکتا تھا۔" فاخرہ نے کہا۔

"لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔" بابا جی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "بس اب سلمیٰ کو کچھ تھوڑا سا کام کرنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ جن بھاگ جائے گے۔"

"کیا کام کرنا ہوگا بابا جی؟" سلمیٰ نے ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ہم تمہیں ایک تعویذ دے رہے ہیں اُسے کسی بھاری چیز کے نیچے دبا دینا، کوئی صندوق ہو یا الماری وغیرہ ہو اور ہم تمہیں پانی دے رہے ہیں، وہ تم تکیے پر چھڑک کر سو جانا اور جو خواب تمہیں نظر آئے وہ کل آ کر ہمیں بتانا۔ پھر ہم تمہیں بتائیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" بابا جی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے بابا جی!" سلمیٰ نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

فاخرہ نے سلمیٰ کا یہ انداز دیکھ کر اُس سے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”فکر نہ کرو سلمیٰ!...... اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں تو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے بارے میں بروقت بابا جی کو علم ہو گیا ہے۔“

بابا جی نے اپنے قریب پڑی چھوٹکوں میں سے ایک بوتل اٹھائی اور ایک بڑی بوتل میں سے اُس میں پانی انڈیل کر زیرِ لب کچھ پڑھنے کے بعد اُس پر پھونک ماری اور اُس کا ڈھکن بند کرنے کے بعد سلمیٰ کو وہ شیشی دے دی۔ پھر انہوں نے ایک تعویذ تیار کیا اور اُسے بھی سلمیٰ کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

”لو!...... یہ ہے وہ تعویذ جسے تم نے کسی بھاری چیز کے نیچے دبانا ہے اور اس شیشی میں جو پانی ہے اُسے تم تکیے پر چھڑک کر سو جانا۔“

”جی بہتر ہے۔“ سلمیٰ نے کہا۔

”کیا اب ہمیں اجازت ہے بابا جی؟“ فاخرہ بولی۔

”ہاں۔“ بابا جی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اب تم لوگ جا سکتی ہو...... کل آ جانا۔“ انہوں نے سلمیٰ پر نظر ڈالی۔ ”دیکھو! اگر کوئی خواب نہ بھی نظر آئے تب بھی تم آ کر ضرور بتانا۔“

”جی بہتر ہے۔“ سلمیٰ بولی۔

ان دونوں نے بابا جی کا ہاتھ چوما اور انہیں سلام کرنے کے بعد کمرے سے باہر آ گئیں۔ قریب ہی نظام کھڑا تھا۔ اُس نے اُن کے قریب آ کر فاخرہ سے کہا۔ ”ہاں بھئی!...... ہو گیا تم لوگوں کا کام؟“

”ہاں ہو گیا......“ فاخرہ نے جواب دیا اور سلمیٰ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کے ساتھ عجیب مسئلہ تھا جس کا بابا جی نے پتہ لگا لیا۔“

”اچھا...... وہ کیا؟“ نظام نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ایک جن کا اس پر سایہ ہے۔“ فاخرہ نے جواب دیا۔

”اوہو!...... یہ تو واقعی اہم مسئلہ تھا۔“ نظام نے کہا۔

”لیکن بابا جی نے معاملہ سنبھال لیا ہے۔“ فاخرہ نے بتایا۔

”یقینی بات ہے۔ وہ تو سنبھالیں گے اور ایسے معاملات بابا جی ہی سنبھال سکتے ہیں۔“ نظام بولا۔ پھر اُس نے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ ”بی بی!...... تم فکر نہ کرو، بابا جی اس جن کو اپنے قبضے میں لے لیں گے۔“

سلمیٰ نے صرف سر ہلایا۔

”اچھا اب ہم چلتے ہیں۔“ فاخرہ نے نظام سے کہا۔ ”بابا جی نے کل آنے کے لیے کہا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم لوگ کل آ جاؤ۔“ نظام بولا۔

وہ دونوں بابا جی کے کمرے سے باہر آ گئیں۔

”بابا جی نے تو عجیب بات بتا دی ہے۔“ سلمیٰ بولی۔

”ہاں...... بہرحال، یہاں آنے سے تمہارے دو مسئلے حل ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ تم پر جس جن کا سایہ ہے بابا جی اُس جن کو اپنے قابو میں کر لیں گے اور دوسرے یہ کہ حبیب اور تمہاری شادی کی بات بھی طے ہو جائے گی۔ بابا جی بہت اچھے آدمی ہیں، میں اکثر ان کے پاس آتی رہتی ہوں۔ تم سے کبھی ان کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا کہ تم ایسی باتوں پر یقین ذرا کم ہی رکھتی ہو۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے تمہیں بابا جی کے بارے میں بتا دیا تو ہو سکتا ہے تم میرا مذاق اڑاؤ اور مجھے یہاں آنے سے منع کرو۔ اب جب کہ تمہارا یہ مسئلہ آن کھڑا ہوا تو میں نے تمہیں بابا جی کے بارے میں بتا دیا کیوں کہ ان سے ملاقات کے علاوہ کوئی اور راستہ نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔“ فاخرہ نے کہا۔

”یہ تم نے اچھا کیا...... اگر ہم ان سے ملاقات نہ کرتے تو وہ جن نہ جانے کیا کرتا۔“ سلمیٰ بولی۔

”ہاں بالکل...... اس کے بارے میں تو درست وقت پر پتہ لگ گیا ورنہ آگے چل کر تو یہ تمہاری زندگی اجیرن کر دیتا لیکن...... اب بابا جی اس کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔“ فاخرہ نے کہا۔

اگلے روز وہ دونوں ایک بار پھر بابا جی سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گئیں۔ سلمیٰ نے بابا جی کی ہدایات کے مطابق عمل کر لیا تھا لیکن اُسے کوئی خواب نظر نہیں آیا تھا۔

بابا جی کے سامنے پہنچ کر ان دونوں نے انہیں سلام کیا اور ان کے کہنے پر ان کے سامنے ہی بیٹھ گئیں۔

”ہاں بھئی!...... کیا خواب نظر آیا تمہیں؟“ بابا جی نے سلمیٰ کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

”جی...... وہ...... مجھے کوئی خواب نظر نہیں آیا۔“ سلمیٰ نے جواب دیا۔

”ہوں۔“ بابا جی نے اثبات میں سر ہلایا اور ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے سوچنے لگے پھر بولے۔ ”ہمیں معلوم تھا کہ وہ تمہارے خواب کے بارے میں مزاحمت کرے گا۔“

”وہ...... کون......؟“ فاخرہ نے بابا جی کی طرف دیکھا۔

”اسی جن کی بات کر رہے ہیں ہم...... ہم نے رات میں اُس کے خلاف ایک عمل کیا، اُس نے مزاحمت شروع کر دی، بڑا طاقتور جن ہے اور عامل بھی ہے۔“

”عامل؟“ فاخرہ حیرت سے بولی۔

”ہاں۔“ بابا جی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جنات میں بھی عامل ہوتے ہیں اور شاید تم لوگوں کو یہ بات بھی معلوم ہو کہ جنات مسلمان اور کافر ہوتے ہیں اور یہ کافر جن ہے۔ اس نے ہمارے خلاف عملیات شروع کر دیئے۔ وہ تو ہم بال بال بچ گئے کیوں کہ اس نے ایک بڑا خطرناک داؤ کھیلا تھا، اگر ہم ہوشیار نہ ہوتے تو یہ ہمیں جان سے مار دیتا۔“

”بابا جی!...... کیا آپ نے اُسے پکڑ لیا ہے؟“ فاخرہ نے جلدی سے سوال کیا۔

”نہیں...... ابھی تو وہ ہمارے قابو میں نہیں آیا ہے۔ فی الحال وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن جلدی وہ قابو میں آ جائے گا، اس سلسلے میں سلمیٰ کو بھی کچھ تعاون کرنا پڑے گا۔“

”میں...... میں کیا تعاون کر سکتی ہوں بابا جی؟“ سلمیٰ نے جلدی سے کہا۔

بابا جی نے فاخرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم کل اسے صبح گیارہ بجے لے کر آ جاؤ۔ ہم ایک عمل کریں گے اور اس جن کو اپنے قابو میں کر لیں گے۔“ پھر انہوں نے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ ”تم نے بس یہ تعاون کرنا ہے کہ ہم جیسا کہیں ویسا کرنا۔ ہم تمہیں ایک ڈنڈا دیں گے، ہم جہاں کہیں تم اسے وہاں مارتی رہنا اس کے علاوہ ایک انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے ہوں گے، تم ایک جملہ پڑھتی جانا اور جو سفوف ہم تمہیں دیں وہ تھوڑا تھوڑا اس انگیٹھی میں پھینکتی رہنا، بس یہی کرنا ہو گا تمہیں۔“ جن تمہیں نظر نہیں آئے گا لیکن ہمیں نظر آئے گا اور ہم اُسے قابو کر لیں گے۔

”جی بہت بہتر ہے۔“ سلمیٰ بولی۔

”بس تم کل اسے لے کر صبح گیارہ بجے آ جانا۔“ بابا جی نے فاخرہ سے کہا۔

”جی بہتر ہے۔“ فاخرہ بولی۔

”وقت کی پابندی کا خیال رکھنا۔“ بابا جی نے ہدایت کی۔

”جی اچھا۔“

وہ دونوں بابا جی کا ہاتھ چومنے اور انہیں سلام کرنے کے بعد کمرے سے باہر آ گئیں۔ نظام وہاں نہیں تھا وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئیں۔

”لو بھئی!...... کل ہی تمہارا معاملہ نمٹ جائے گا۔“ فاخرہ نے سلمیٰ سے کہا۔

”مجھے تو ڈر سا لگ رہا ہے۔“ سلمیٰ بولی۔

”وہ کیوں؟“

”جن کے بارے میں سوچ کر۔“

”لیکن وہ تمہیں نظر تو نہیں آئے گا۔“

"ہاں پھر بھی...... ویسے جب سے میں نے جن کے بارے میں سنا ہے میں خوف زدہ ہوں۔"

"بالکل خوف زدہ نہ ہو۔ کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کسی جن کی مجال نہیں ہے جو بابا جی کے ہوتے ہوئے کچھ کر سکے۔"

اسی شام سلمٰی، حبیب کی دکان پر پہنچ گئی۔ حبیب نے اُسے آج ہی آنے کے لیے کہا تھا کیوں کہ آج جمعرات تھی اور ہر جمعرات کو ماسٹر صاحب پانچ بجے گھر چلے جاتے تھے اور کاری گر بھی چھٹی کر جاتے تھے جب کہ حبیب وہاں رہ جاتا تھا۔ سلمٰی کو حبیب کی جگہ وہاں ایک اور کاری گر انجم ملا۔ وہ حبیب کا گہرا دوست تھا اور سلمٰی اور حبیب کی محبت کے بارے میں نہ صرف جانتا تھا بلکہ کبھی کبھی اس حوالے سے ان کے پیغامات بھی ایک دوسرے کو پہنچاتا رہتا تھا۔

"حبیب کہاں ہے انجم؟" سلمٰی نے پوچھا۔

"سلمٰی باجی!...... وہ تو......" انجم نے سر جھکا لیا۔

"کیا ہوا اُسے؟" سلمٰی پریشان ہو گئی۔

"وہ تو پرسوں...... یہاں سے کام چھوڑ کر چلا گیا ہے۔" انجم نے بہ مشکل بتایا۔

"کیا؟" سلمٰی چونک کر بولی۔ "کہاں چلا گیا ہے وہ؟"

"سلمٰی باجی!...... مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں آپ کو اصل صورت حال سے آگاہ کر دیتا۔" انجم نے اُس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اصل صورتِ حال؟...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو انجم کھل کر مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے؟" سلمٰی نے کہا۔

"سلمٰی باجی!" انجم نظریں نیچی رکھتے ہوئے بولا۔ "دراصل حبیب اچھا لڑکا نہیں تھا۔ وہ بہت تیز طرار اور چالاک لڑکا تھا، اس نے یہاں مجھے گہرا دوست بنا لیا، ماسٹر جی کو بھی اُس نے اپنے قابو میں کر لیا تھا، وہ اُن کا بیٹا بن گیا تھا اور آپ کو بھی اُس نے محبت کا دھوکا دیا۔"

"دھوکا؟" سلمٰی حیرت سے بولی۔ یہ بات اُس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔ "یہ...... یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اُس نے مجھے دھوکا دیا؟"

"بلکہ میں تو یہ کہوں گا باجی کہ...... آپ اس کے ہاتھ سے بچ گئیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" سلمٰی تیزی سے بولی۔

"ہاں باجی!...... کچھ لوگ اُسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ گئے تھے، انہوں نے بتایا کہ اُس نے کئی لڑکیوں کو دھوکا دیا ہے، ان سے محبت کا ناٹک کھیلا، ان میں سے کئی ایک کی عزت لوٹی ہے اور ان سے رقمیں بٹورتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس پر ڈکیتی کا کیس بھی تھا، اس لیے اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔"

"اوہ نہیں۔" سلمٰی نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "وہ اس قدر دھوکے باز تھا؟"

"ہاں باجی!...... اس دنیا میں جگہ جگہ بھیڑیے بیٹھے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں عورتوں کی عزتوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ مال و دولت کی تو خیر ہے لیکن اگر عزت چلی جائے تو واپس نہیں آتی ہے اور آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کی عزت بچ گئی ہے۔" انجم نے کہا۔

سلمٰی نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو اور ایسے لوگوں کا انجام بھی یہی ہوتا ہے۔" اُس نے کاؤنٹر پر سے اپنا پرس اٹھایا اور بوجھل قدموں سے واپس چل پڑی۔

اُس نے آ کر فاخرہ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ فاخرہ نے بھی اُس کی عزت بچ جانے پر اُسے شکر ادا کرنے کو کہا۔

☆

اگلے روز صبح گیارہ بجے سلمٰی اور فاخرہ بابا جی کے گھر پہنچ گئیں۔ وہاں صرف بابا جی اور نظام ہی تھے۔

وہ دونوں نظام سے سلام دعا کرتی بابا جی کے کمرے میں آ گئیں۔

"آؤ بھئی آؤ!...... ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے

تھے۔" بابا جی نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ دونوں بابا جی کے قریب بیٹھ گئیں۔ انہوں نے بابا جی کا ہاتھ چوما اور فاخرہ نے ان سے کہا۔ "بابا جی!...... میری سہیلی تو بال بال بچ گئی۔"

"وہ کس طرح؟" بابا جی نے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

فاخرہ نے انہیں حبیب والا واقعہ سنایا۔ وہ بولے۔ "واقعی بھئی!...... یہ تو بہت اچھا ہوا کہ وہ اپنے کسی غلط مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی پکڑا گیا۔"

"بس اب اس کا معاملہ تو ختم ہو گیا ہے، اب تو صرف اُس جن کا مسئلہ ہی رہ گیا ہے۔" فاخرہ نے کہا۔

"ہاں ہاں۔" بابا جی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بس ابھی ہم اُسے قابو کر لیں گے۔ ویسے وہ بہت طاقتور ثابت ہوا ہے، ہم نے رات میں اُسے پھر قابو کرنے کی کوشش کی، پہلے تو بڑے مشکل عمل سے اُسے آنے پر مجبور کیا، جب وہ آ گیا تو ہم نے اُس سے کہا کہ وہ اگر اپنی خیر چاہتا ہے تو اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دے، ہم نے اُسے بتایا کہ کیسے کیسے طاقتور جنوں کو ہم نے قابو کر لیا ہے لیکن وہ ہمارے رعب میں نہیں آیا، ہم نے اُسے قابو کرنے کے لیے کچھ عمل بھی کیے لیکن وہ بھی اپنے عمل کرتا رہا اور بالآخر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا، بہت طاقتور ہے بھئی!...... ایسے طاقتور جنات کے ساتھ تو مقابلے میں جان جانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔" انہوں نے سلمٰی کو خوف زدہ ہوتے دیکھ کر کہا۔ "تم گھبراؤ نہیں...... میں اور تم مل کر اُسے قابو کر لیں گے۔"

"بابا جی!...... وہ قابو میں آ جائے گا ناں؟" فاخرہ نے سوال کیا۔

"ہاں ہاں بالکل!" بابا جی بولے۔ "بس سلمٰی ہماری ہدایات پر پوری طرح عمل کرے۔"

"سلمٰی!" فاخرہ نے سلمٰی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم بابا جی کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرنا۔"

"ہاں ہاں، بالکل کروں گی۔" سلمٰی بولی۔

"ٹھیک ہے بابا جی!" فاخرہ نے بابا جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ اس کی طرف سے بے فکر رہیے۔ یہ آپ کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ بس اب ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں۔" بابا جی نے کہا پھر سلمٰی کی طرف دیکھا۔ "کیوں سلمٰی تمہارا کیا خیال ہے؟ تم تیار ہو؟"

"جی ہاں......" سلمٰی نے جواب دیا۔

"کوئی گھبراہٹ تو نہیں ہے؟"

"نہیں بابا جی!"

"اگر ایسی کوئی بات ہے تو ہم پانچ دس منٹ دیر سے اپنا کام شروع کر سکتے ہیں؟"

"نہیں نہیں...... میں ٹھیک ہوں، تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے فاخرہ!" بابا جی نے فاخرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم یہیں رہو، ہم دوسرے کمرے میں جا رہے ہیں۔"

"جی بہتر ہے۔" فاخرہ بولی۔

"آؤ بھئی سلمٰی!" بابا جی نے سلمٰی کی طرف دیکھا اور اٹھنے لگے۔

ذرا دیر بعد بابا جی اور سلمٰی دوسرے کمرے میں آ گئے۔ یہاں زمین پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر موٹے اور لمبے لمبے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک جانب ایک انسانی کھوپڑی، ایک انگیٹھی اور کچھ دوسری چیزیں پڑی تھیں۔ وہیں دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک تختہ بھی لگا ہوا تھا۔ بابا جی نے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلمٰی سے کہا۔ "تم یہاں بیٹھ جاؤ۔" وہ خود چیزوں کی طرف بڑھے اور پھر انہوں نے لکڑی کا تختہ اٹھا لیا۔ وہ پلٹے سلمٰی ان کی ہدایت کے مطابق بیٹھ چکی تھی۔ انہوں نے وہ تختہ لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"بابا جی!...... مجھے بتا دیں کیا چیزیں رکھنی ہیں، میں رکھ دیتی ہوں۔" سلمٰی بولی۔

بابا جی نے اُس کی طرف دیکھا۔ "نہیں...... بس تم

آرام سے بیٹھو میں رکھ لوں گا چیزیں' پھر عمل شروع کرتے ہیں۔"

بابا جی نے تختے پر انگیٹھی رکھ دی۔ ایک چھوٹے ڈبے میں سے کچھ کوئلے نکال کر اُس میں دہکا دیئے اور ایک ڈبے میں سے ایک پڑیا نکال کر سلمٰی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ لوبان ہے۔ جب تم میرا بتایا ہوا جملہ ادا کرو تو اسے تھوڑا تھوڑا کوئلوں پر ڈالتی جانا۔"

"جی بہتر ہے۔" سلمٰی بولی۔

بابا جی اُس کے قریب ہی بیٹھ گئے اور بولے۔ "اب میں تمہیں وہ جملہ بتا رہا ہوں' وہ تم نے مسلسل بولنا ہے اور جیسا میں کہتا جاؤں ویسا کرتی جانا' کرتی جاؤ گی ناں؟"

"جی ہاں بالکل۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے تو جملہ سنو!" انہوں نے چند الفاظ پر مشتمل ایک جملہ اسے بتا دیا۔ وہ کسی ایسی زبان کا تھا جو سلمٰی کے لیے انجانی تھی' پھر بولے۔ "اسے دہراؤ؟"

سلمٰی وہ جملہ دہرایا۔ اس میں ذرا سی غلطی تھی۔ جسے بابا جی نے درست کرا دیا اور بولے۔ "بس اب تم نے اپنا عمل شروع کرنا ہے۔ یہ ڈنڈا بھی اپنے پاس رکھ لو اور جب میں کہوں' اسے یہاں قالین پر ذرا زور سے مارنا۔" انہوں نے کہتے ہوئے قالین کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ٹھیک ہے۔" سلمٰی بولی۔

"اور جب جن آ جائے گا تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ صرف مجھے نظر آئے گا' اُسے قابو کرنے کے لیے میں اُسی وقت فیصلہ کروں گا کہ ہمیں کیا کرنا ہے' میرا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے ہمیں بھاگنا پڑے' اُس پر پانی پھینکنا پڑے' اگر پانی پھینکنا ہوا تو میں تمہیں پانی بھی دے دوں گا' یعنی یہ اُسی وقت فیصلہ ہو گا کہ کیا کرنا ہے' سمجھ گئیں؟"

"جی' جی ہاں۔" سلمٰی جلدی سے بولی۔

"ٹھیک ہے' بس ہم عمل شروع کرتے ہیں۔" بابا جی نے کہا۔

"چلو اب تم جملہ ادا کرنا شروع کرو اور انگیٹھی میں لوبان بھی ڈالنا شروع کر دو۔"

"جی اچھا۔" کہہ کر سلمٰی نے ان کی ہدایت پر عمل شروع کر دیا۔

بابا جی نے بھی آہستہ آواز میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔ "سلمٰی!...... جن آ چکا ہے۔ ذرا زور سے ڈنڈا قالین پر مارو۔"

سلمٰی نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔

بابا جی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک کونے میں آ گئے۔ انہوں نے سلمٰی کی طرف دیکھا اور بولے۔ "ذرا زیادہ لوبان ڈالو انگیٹھی میں۔"

سلمٰی نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔

بابا جی نے فضاء میں گھورنا شروع کر دیا اور وہیں دیکھتے ہوئے بولے۔ "خبیث!...... میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" قدرے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔ "آج تو بچ کر نہیں جائے گا۔ بہت بھاگ لیا تو۔ اب نہیں بھاگ سکے گا۔ کیا کیا؟ ہمیں شکست دے دے گا؟ نہیں...... آج کسی صورت ہم شکست تسلیم نہیں کریں گے۔ ہاں ہاں...... ٹھیک ہے جو تیرے بس میں ہے' وہ کر لے...... اچھا ٹھیک ہے۔ ہم دونوں تیرا مقابلہ کرتے ہیں اور تجھ میں جتنی صلاحیت ہے وہ دکھا۔ آج میں تجھے قید کر کے ہی رہوں گا۔" وہ سلمٰی کے بالکل قریب آ کر بیٹھ گئے اور اس سے بولے۔ "سلمٰی!...... جن اب ہم دونوں کو شکست دینے کے لیے بہت زور لگائے گا اور ہمیں بھی اُسے قابو کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔"

سلمٰی نے ان کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ بولی اس لیے نہیں کیوں کہ وہ جملہ بولے جا رہی تھی۔

بابا جی اُس کونے کی طرف دیکھ کر کچھ بڑبڑانے لگے جہاں وہ جن سے بات چیت کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے سلمٰی سے کہا۔ "جن اب اس طرف آ رہا ہے' تم

لیٹ جاؤ۔"

سلمٰی کو اس ہدایت پر ذرا اُلجھن ہوئی لیکن حالات کی نزاکت سمجھتے ہوئے وہ لیٹ گئی۔

بابا جی ایک بار پھر فضاء میں گھورنے لگے لیکن سلمٰی نے انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا کہ شاید جن قریب آ چکا ہے۔ بابا جی نے وہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو!...... اب بھی وقت ہے' تم شکست تسلیم کر لو ورنہ میں تمہارا بُرا حشر کروں گا۔" قدرے توقف کے بعد وہ بولے۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم باز نہیں آؤ گے۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ اگر تم میں طاقت ہے تو ضرور لے لو ہماری جان۔ لیکن یاد رکھو آج تم ضرور بے بس ہو کر رہو گے۔" انہوں نے سلمٰی کی طرف دیکھا۔ "دھمکیاں دے رہا ہے مجھے کہ ہماری جان لے لے گا۔ تم فکر نہ کرو' یہ آج ضرور میری قید میں آئے گا۔ ڈنڈا مارو قالین پر ڈنڈا مارو۔"

سلمٰی نے زور سے ڈنڈا قالین پر دے مارا۔

"سلمٰی...... اب اس جن کو کمزور کرنے کے لیے میں کچھ پڑھوں گا۔ ساتھ ہی ہمیں اپنی ٹانگیں اسے دکھانا پڑیں گی۔ تم یہ پائینچے اُوپر کر لو۔" انہوں نے آگے ہو کر سلمٰی کی شلوار کے پائینچے اُوپر گھٹنوں تک چڑھا دیئے۔

سلمٰی کو یہ عمل پسند نہ آیا لیکن اس وقت مجبوری تھی' وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

بابا جی نے ایک بار پھر فضاء میں گھورتے ہوئے بڑبڑانا شروع کر دیا اور پھر وہیں دیکھتے ہوئے بولے۔ "ہاں...... اب کمزور پڑنے لگے ناں...... بس کچھ ہی دیر میں شکست مان لو گے۔" انہوں نے سلمٰی کی طرف دیکھا۔ "ہماری کامیابی شروع ہو گئی ہے۔ بس اب تھوڑا سا مقابلہ اور کرنا پڑے گا۔" وہ کھسک کر سلمٰی کے بالکل قریب بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس کی قمیض اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اسے بھی تھوڑا سا اُوپر کر دو۔"

سلمٰی سوچتی ہی رہ گئی اور انہوں نے اُس کی قمیص سینے سے اوپر تک اٹھا دی اور اس سے پہلے کہ سلمٰی کو کچھ کرنے کا موقع ملتا' انہوں نے سلمٰی کے سینے پر موجود سینے کے محافظ کپڑے کو ایک ہی جھٹکے سے اُوپر کر دیا اور سلمٰی کا سینہ کپڑے کے حصار سے باہر آ گیا۔ بابا جی نے اُس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں بابا جی!" سلمٰی ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ارے!...... یہ کپڑے اتار دو' ہمیں جن کو شکست دینی ہے۔" بابا جی بولے۔ ان کا سانس تیز ہو چکا تھا اور آنکھوں میں چمک آ چکی تھی۔

"نہیں...... یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔" سلمٰی بولی۔ اتنی دیر میں وہ اپنے کپڑے درست کر چکی تھی۔

"ارے!...... کیا کر رہی ہو؟...... اُتار دو کپڑے۔ اگر تم نے کپڑے نہ اُتارے تو جن ہمیں مار ڈالے گا۔" بابا جی نے اس کی قمیض پکڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... میں یہ نہیں کروں گی۔" سلمٰی کھسک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ...... یہ تو تمہیں کرنا پڑے گا۔ میں جن کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا ہوں۔" بابا جی اپنی بات کہتے ہوئے اُس کے قریب آ چکے تھے اور انہوں نے اُسے پکڑ لیا۔

"نہیں...... مجھے...... مجھے چھوڑ دیں۔" سلمٰی نے خود کو ان سے چھڑانے کی کوشش کی۔

"ارے!...... تم کپڑے اُتار دو!...... تم اتنی خوب صورت ہو۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ میں تمہارا خوب صورت جسم دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُتار دو کپڑے۔" انہوں نے سلمٰی سے لپٹتے ہوئے کہا۔ اس دوران انہوں نے سلمٰی کے کچھ بوسے بھی لے لیے تھے۔ اب سلمٰی کے لیے یہ سمجھنا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ اس جعلی بابا جی کے کیا ارادے ہیں۔ اُس نے بابا جی سے خود کو چھڑانے کی بھرپور کوشش شروع کر دی۔ اِدھر بابا جی بھی اُسے پوری طرح گرفت میں لے لینے کی بھرپور

کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے سلمیٰ کو کافی حد تک قابو میں کر لیا تھا اور جھنجھوڑنا شروع کر دیا تھا۔

سلمیٰ نے اُس ڈنڈے کو اٹھانے کی کوشش کی جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور قریب ہی موجود تھا۔ بالآخر اس نے وہ ڈنڈا اٹھا لیا اور بابا جی کے سر پر مارا جو بہت زیادہ زور سے تو نہیں لگا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ بابا جی کراہا اور اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

سلمیٰ اس وقت بھپری ہوئی شیرنی بن گئی تھی۔ اُس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بابا جی کی گردن دبوچ لی۔ بابا جی کے خلاف اس کے اندر ایک آتش فشاں اُبل رہا تھا۔ جذبات کی وجہ سے سلمیٰ کے اندر جیسے طاقت بھی بہت زیادہ بھر گئی تھی۔ اُس کی گرفت بابا جی کی گردن پر سخت سے سخت ہوتی جا رہی تھی۔ بابا جی چوں کہ سر پر چوٹ کھانے کی وجہ سے ڈھیلا پڑ چکا تھا اس لیے زیادہ شدت کے ساتھ مزاحمت بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ سلمیٰ نے اُسے اپنے اُوپر سے ہٹایا اور اب وہ اُس کے اُوپر آ چکی تھی۔ اُس نے بابا جی کی گردن چھوڑی نہیں تھی۔

اپنی عزت پر ہاتھ ڈالے جانے کا خیال سلمیٰ کو کچو کے لگا رہا تھا اور اُس کے اندر بھڑکنے والی نفرت کی آگ لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بابا جی کی گردن پر اُس کی گرفت میں بھی بتدریج سختی آتی جا رہی تھی۔ بابا جی تھوڑی بہت مزاحمت کر رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں باہر کو آ رہی تھیں۔

سلمیٰ کسی جنونی کی طرح اُس کی گردن دباتی چلی جا رہی تھی اور پھر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے بابا جی نے مزاحمت چھوڑ دی ہے۔ وہ منجمد ہو کر رہ گیا تھا لیکن سلمیٰ کی جنونی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ مسلسل بابا جی کی گردن دباتی رہی لیکن بابا جی بے حس وحرکت پڑا تھا۔

کچھ دیر بعد سلمیٰ کو جیسے ہوش آ گیا۔ اُسے خیال آیا کہ بابا جی مزاحمت نہیں کر رہا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی اور حرکت کر رہا ہے' اُس کی آنکھیں بھی پتھر کی ہو گئی ہیں' کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مر گیا ہو؟ سلمیٰ نے اپنی گرفت ہلکی کر دی لیکن اس نے اپنے ہاتھ بابا جی کی گردن پر سے نہیں ہٹائے کیوں کہ اُسے خطرہ تھا کہ کہیں بابا جی صرف ڈھیلا نہ پڑا ہوا ہو اور کسی بھی وقت پھر حرکت کرنے لگے۔

سلمیٰ نے اپنی گرفت مزید ڈھیلی کی لیکن بابا جی میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ پھر سلمیٰ نے اپنی گرفت اس حد تک ڈھیلی کر دی کہ اگر بابا جی کوئی حرکت کرنا چاہے تو کر سکتا تھا لیکن سلمیٰ پوری طرح محتاط تھی' وہ تیار تھی کہ اگر بابا جی نے حرکت کی تو وہ اُسے پھر فوراً گرفت میں لے لے گی لیکن جب بابا جی نے ذرا بھی حرکت نہ کی' حتیٰ کہ اُس کی آنکھوں کا انجماد بھی ختم نہ ہوا تو سلمیٰ کو یقین سا ہونے لگا کہ اب اُس میں زندگی کا رمق باقی نہیں ہے۔

وہ کچھ دیر بابا جی کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ بابا جی بے حس وحرکت پڑا رہا اور پھر سلمیٰ نے اُس کے گالوں پر تھپڑ مار کر دیکھا' پھر بھی بابا جی میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ سلمیٰ کا یقین پختہ ہونے لگا تھا کہ بابا جی اب اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکا ہے۔ وہ وہیں آرام سے بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ دھینگا مشتی کی وجہ سے اُس کا سانس بے ترتیب ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد اُس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ بابا جی اب بھی بے حس وحرکت پڑا ہوا تھا۔ اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں جیسے چھت کو گھور رہی تھیں۔ سلمیٰ اب بھی اُس کے خلاف اپنے اندر شدید نفرت محسوس کر رہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ بابا جی ایک بار پھر زندہ ہو جائے اور وہ اُسے پھر سے بے دردی سے مار ڈالے۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے اپنے کپڑے درست کیے اور بابا جی پر نظر ڈالتی ہوئی کمرے کے دروازے کی

جانب چل پڑی۔

ذرا دیر بعد وہ برآمدے میں آ گئی۔ نظام اور فاخرہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ نظام کو دیکھ کر اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی کیوں کہ وہ بابا جی کا ساتھی تھا۔ اُس نے سلمیٰ سے کہا۔ ”ہاں بھئی!...... ہو گیا تمہارا معاملہ ختم؟“

”معاملہ بھی ختم ہو گیا ہے اور بابا جی بھی ختم ہو گئے ہیں۔“ سلمیٰ نے اپنی نفرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ نظام چونک کر بولا۔

”ہاں۔“ سلمیٰ نے کہا۔ ”بابا جی اور جن کا سخت ترین مقابلہ ہوا۔ بابا جی پہلے ہی بتا چکے تھے کہ وہ جن خطرناک ہے اور اُس سے ہماری زندگیوں کو خطرہ ہے۔ وہ جن واقعی خطرناک ثابت ہوا اور بابا جی کو اُس نے مار ڈالا۔“

”نہیں نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔“ نظام تیزی سے اٹھتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔

”یہ ہو گیا ہے۔“ سلمیٰ نے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ نظام نے کہا اور تیزی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

سلمیٰ نے فاخرہ کی طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولی۔ ”تمہاری عزت لوٹی تھی بابا جی نے؟“

فاخرہ نے اثبات میں سر ہلا کر نظریں نیچی کر لیں۔

”تو پھر تم مجھے یہاں کیوں لے آئیں؟“

”میں مجبور تھی...... بابا جی کا اصرار تھا کہ میں اُس کے لیے لڑکیاں اور عورتیں گھیر کر لاؤں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو جن مجھے مار ڈالے گا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو سلمیٰ۔“ فاخرہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”تم جو چاہو مجھے سزا دے سکتی ہو' میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔“

”تمہاری سزا یہی ہے کہ میں تمہارے ساتھ اب دوستی قائم نہیں رکھوں گی۔“ سلمیٰ بولی اور اُس نے گھر کے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھاتے دیے۔

فاخرہ نے تیزی سے بڑھ کر اُس کے پیر پکڑ لیے اور رونے لگی۔ وہ بولی۔ ”سلمیٰ!...... تم...... تم مجھے معاف کر دو' مجھ سے غلطی ہو گئی' میں...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی ہوں' مجھے معاف کر دو۔ غلطی کو تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے' مجھے ایک بار معاف کر دو' آئندہ میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گی۔“

سلمیٰ کو اس کی تڑپ کا اندازہ ہو گیا۔ اُس نے جھک کر فاخرہ کو سینے سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگی۔ پھر اُس نے خود کو سنبھالا اور بولی۔ ”بس اب یہاں سے نکل چلو۔ بابا جی مر چکا ہے' ویسے تو نظام ہمارے خلاف کچھ نہیں کر سکتا کیوں کہ اُسے معلوم ہے کہ اگر اُس نے ہمارے خلاف کچھ کرنے کی کوشش کی اور بات پولیس تک پہنچ گئی تو وہ خود بھی پھنس سکتا ہے' پھر بھی وہ کسی قسم کا ردعمل ظاہر کر سکتا ہے اس لیے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

وہ دونوں تیزی سے کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑیں۔ ذرا دیر بعد وہ تیز تیز قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھیں۔

”سلمیٰ!...... تم نے مارا ہے بابا جی کو یا وہ جن کے ہاتھوں مارا گیا ہے؟“

”اُسے مارا تو میں نے ہی ہے لیکن اُسے مروانے والا جن ہی تھا' جو مجھ پر نہیں بلکہ اُس پر سوار تھا اور وہ تھا ہوس کا جن اس کے علاوہ وہاں کوئی اور جن نہیں تھا۔“ سلمیٰ نے جواب دیا۔

فاخرہ نے مزید کچھ نہ کہا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ دونوں اپنی مطلوبہ بس میں بیٹھ گئیں اور بس چل پڑی۔ سلمیٰ کے ذہن میں انجم کے یہ الفاظ گونج رہے تھے کہ اس دنیا میں جگہ جگہ بھیڑیے بیٹھے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں عورتوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں لیکن سلمیٰ مطمئن تھی کہ اُس نے کم از کم ایک بھیڑیے کو تو مار ڈالا ہے۔

☆☆☆



غلط فیصلہ

پرکاش کمار سرکش

"شہزادی بیوہ ہے۔ اس کا شوہر اور والد دونوں ایک حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی سسرال والوں سے نبھ نہ سکی اور اب وہ اپنے والدین کے گھر میں رہتی ہے لیکن ہے پیسے کی بہت بھوکی۔"

غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک معصوم لڑکی کو دولت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا

سفینہ کے لیے اونچے گھرانے کے لڑکے کا رشتہ کیا آیا سب اچھلنے لگے۔ ان کے قدم زمین پر ہی نہ پڑ رہے تھے۔ خاص طور پر اس کی بڑی بہن شہزادی۔ وہ تو کسی کو خاطر میں ہی نہیں لا رہی تھی۔ ایک مرتبہ ماموں نے اس کو سرزنش کی تو وہ اکڑ کر ان سے کہنے لگی۔ "ماموں! آپ تو چاہتے ہی نہیں کہ ہماری بھی معاشرے میں حیثیت ابھرے۔ کچھ مان مرتبہ بڑھے؟"

"یہ کیسی بے وقوفی کی بات کر رہی ہو تم شہزادی؟" ماموں غصے سے کہنے لگے۔ "یہ تمہیں کس نے سکھایا ہے کہ اونچے گھرانے میں رشتہ کرنے سے معاشرے میں مان و مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ رشتے ہمیشہ خاندان دیکھ کر کیے جاتے ہیں۔ دولت کے نشے میں اندھے ہو کر نہیں۔"

"بس ماموں......!" وہ تنک کر کہنے لگی۔ "ہم لوگوں نے غربت کے بہت ستم دیکھے ہیں۔ اب تو ہمیں چین سے رہنے دیجیے۔"

"تو جاؤ۔ مرو...... اگر تم خود اندھے کنویں میں گرنا چاہتی ہو تو بے شک اس رشتے کے لیے اپنی بہن کی زندگی جہنم بنا لو۔" وہ کہنے لگے۔ "لیکن یہ مت بھولو کہ تمہاری بہن کے بھی کچھ ارمان ہوں گے۔ کم از کم اس سے تو رضامندی لے لو۔"

"اس کی فکر مت کریں ماموں!" وہ ناگواری سے کہنے لگی۔ "وہ میری چھوٹی بہن ہے اور میرے فیصلے سے کبھی انحراف نہیں کرے گی۔"

"فیصلے سے انحراف کی بات نہیں ہے احمق لڑکی۔" ماموں کا ماتھا ٹھنکتے ٹھنکتے رہ گیا۔ "اس کی زندگی کا سوال ہے۔"

"ماموں!......" وہ چیخ کر کہنے لگی۔ "مجھے احساس ہے اس بات کا۔ بڑے گھر میں جائے گی تو اس کی ساری محرومیاں ختم ہو جائیں گی۔"

"تمہاری تو مت ہی ماری گئی ہے۔" ماموں غصے میں اسے برا بھلا کہہ کر کمرے سے نکل آئے۔ باہر دالان میں اس کی بہن چارپائی پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی جب کہ سفینہ کالج سے واپس ہی نہیں لوٹی تھی۔ اسے تو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کی مرضی معلوم کیے بنا ہی اس کی زندگی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

"تمہاری لڑکی کی تو مت ہی ماری گئی ہے......" وہ اپنی بہن کے قریب آ کے بولے۔

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا بھائی صاحب۔" وہ روتے ہوئے کہنے لگیں۔ "بار بار اس سے کہہ رہی ہوں کہ جلد بازی کی ضرورت نہیں لیکن وہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے۔"

"لیکن بہن جی۔ یہ گڈے گڑیا کا کھیل نہیں۔ عمر بھر کا ساتھ ہے۔" احمد علی کہنے لگے۔ جہاں تک میری معلومات ہے تو وہ لڑکا سفینہ بیٹی کے قابل نہیں ہے۔"

"یہی بات تو میں شہزادی کو بارہا سمجھا چکی ہوں بھائی صاحب، لیکن وہ اپنی ضد پر اکڑی ہوئی ہے۔" صغریٰ کہنے لگی۔

"میں تو کہتا ہوں کہ سب سے پہلے سفینہ کی مرضی معلوم کریں۔" احمد علی کہنے لگے۔

"کہتے تو آپ ٹھیک ہیں لیکن شہزادی کا کہنا ہے کہ ہم اس رشتے کو کسی صورت میں ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔" صغریٰ بے بسی سے کہنے لگی۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر خاندان کے دیگر افراد سے مشورہ کیا لینا؟" وہ بوجھل دل کے ساتھ کہنے لگے۔ "جب آپ لوگوں نے اپنی من مانی ہی کرنی ہے تو خاندان کے لوگوں کو جمعے کے دن اکٹھا کرنے کا کیا مقصد؟" وہ بڑبڑاتے ہوئے بہن کے گھر سے باہر نکل آئے۔

......☆......

کوئی بھی ماں اپنی اولاد کو کبھی غلط نہیں کہتی۔ چاہے وہ ان کے کرتوتوں سے واقف کیوں نہ ہو۔ ایسا ہی کچھ امیر علی کی والدہ آسیہ بیگم کر رہی تھیں۔ امیر علی غلط دوستوں کی صحبت میں آ کے بگڑ گیا تھا۔ دولت کے نشے میں اس کی حرکتیں رکنے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔ آئے دن اس کی شکایتیں گھر پہنچتیں لیکن پھر شکایت کرنے والوں سے معذرت کر لی جاتی لیکن امیر علی کو کبھی سرزنش نہیں کی گئی۔ ایسی صورتِ حال میں اس کا دماغ مزید خراب ہوتا گیا۔ آگے چل کر غلط قسم کی عورتوں کے ساتھ روابط نے بالآخر اس کے والدین کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا۔

ایسے میں ایک رشتے دار خاتون نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "ارے آسیہ بیگم! میری مانو تو اپنے امیر علی کی کسی جگہ فوراً شادی کر دو۔ شادی کے بعد خود ہی سدھر جائے گا۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو بانو بیگم! لیکن پورے شہر میں سبھی اس کی حرکتوں سے آگاہ ہیں۔" وہ فکر مندی سے کہنے لگیں۔

"تو شہر میں ضروری ہے کیا؟" بانو بیگم کہنے لگیں۔ "کسی دوسرے شہر میں کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ راضی ہوتے ہوئے کہنے لگیں۔ "میں کوشش کرتی ہوں لیکن......"

"لیکن کیا......؟"

"ڈرتی ہوں۔ اگر شادی کے بعد بھی وہ سدھر نہیں سکا تو......" اس نے خدشے کا اظہار کیا۔

"ارے۔ ڈرنے کی ضرورت بالکل نہیں آسیہ بی۔" بانو غرور سے کہنے لگی۔ "شادی کے بعد بڑے بڑے پھنے خان سدھر جاتے ہیں۔ یہ تو کوئی بڑی بات ہی نہیں۔"

"لیکن اگر لڑکی والوں کو اس کی حرکات کا پتا چل گیا تو......" آسیہ بیگم پھر پوچھنے لگیں۔

"دیکھو آسیہ بی۔ جب تک ڈرتی رہو گی کچھ نہیں کر سکو گی۔" بانو نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ایک گُر کی بات سنو۔ رشتہ اپنی حیثیت سے غریب لوگوں میں کرو۔ پھر اگر خدانخواستہ انہیں پتا چل بھی گیا تو تمہاری یہ دولت' یہ امارت ان سب کے منہ بند کر دے گی۔"

اس کی یہ بات آسیہ کے دل کو لگی۔ کہنے لگیں۔ "ہاں۔ ٹھیک ہے۔ میں امیر علی کے باپ سے بات کرتی ہوں۔"

"بالکل بات کرو۔" وہ کہنے لگیں۔ "لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضرور یاد رکھو کہ بات کر کے ان سے یہ کسی بھی صورت میں منوانا ہے۔"

"ہاں۔ میں کوشش کرتی ہوں۔" آسیہ بیگم کہنے لگیں۔

......☆......

امیر علی اپنے دوستوں کے ساتھ موج مستی میں مشغول تھا۔ ساتھ دینے کے لیے دو کال گرلز بھی تھیں۔ رات کے گہرے ہوتے ہی ان کے ذہن بھی خمار سے بوجھل ہونے لگے۔ شعیب نے آگے بڑھ کر سی ڈی پلیئر بند کیا۔ موسیقی کی آواز خاموش ہوتے ہی کمرے میں صرف ان کی سانسوں کی بے ترتیب آوازیں ابھرنے لگیں۔

"آج تو مزہ آ گیا۔" نگہت آہستگی سے بولی۔

"ہاں جانِ من! زندگی سے لمحہ لمحہ مزہ کشید کرنا ہی ہماری کوشش ہوتی ہے۔" ارسلان نے بے تکلفانہ انداز میں اس کے عریاں شانے پر ہاتھ رکھا۔

"اوہ ارسلان۔ تم تو اب ڈانس میں ماہر ہوتے جا رہے ہو۔" اس نے مخمور انداز میں اس کی تعریف کی تو امیر علی ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔ "یار۔ کیا زمانہ آ گیا۔ پہلے مرد عورتوں کی تعریف کرتے تھے' دل جیتنے کے لیے اور اب لڑکیاں مردوں کی تعریف کر رہی ہیں۔"

"تم کیوں بلاوجہ جیلس ہو رہے ہو؟ تمہاری تعریف کوئی نہیں کر رہا کیا اس لیے؟" نگہت اسے چڑانے کی غرض سے کہنے لگی۔

"ارے میری تعریف۔" وہ ہنسنے لگا۔ "میری تعریف کے لیے یہ شازیہ کیا کم ہے؟" اس نے اپنے پہلو میں کھڑی شازیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچا اور کمرے میں قہقہے گونج اٹھے۔

"میری جان۔ کل کس نے دیکھا ہے۔ پل بھر کی زندگی ہے آج ہی جی لو۔" نگہت شازیہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے کہنے لگی۔ "کیوں شازیہ......؟"

"ہاں اور کیا۔" اس نے تائید کی۔

"تو ٹھیک ہے تمہاری بات مان لیتے ہیں اور آج ہی جی لیتے ہیں۔" امیر علی شازیہ کے چہرے پر جھک گیا اور ساتھ ہی ارسلان نگہت کے چہرے پر۔

تھوڑی دیر کے بعد امیر علی شعیب سے کہنے لگا۔ "شعیب! تم قریبی ہوٹل سے کھانا پارسل کروا کے آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" شعیب باہر نکل آیا۔

وہ کہنے کو تو ان کا ساتھی تھا لیکن نچلے قسم کے تمام کام اس کے ذمے تھے۔ جیسے کہ کھانا لانا' چائے بنانا' کمروں کی صفائی ستھرائی۔ غرضیکہ وہ ان کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ پیشہ ور عورتوں کے ساتھ امیر علی اور ارسلان کے تعلقات کا وہ برسوں سے رازدار تھا جس کی بنا پر کبھی کبھار بچے کچے کھانے کے ساتھ ساتھ اسے ان عورتوں کی قربت بھی نصیب ہو جاتی تھی۔

امیر علی کا یہ عیش کدہ شہر کے آخری کونے پر تھا جو کہ یوں تو اکثر و بیشتر بجتا رہتا تھا لیکن کسی خاص موقع پر تو ان کے چند اور ساتھی بھی تقریب میں شامل ہوتے تو پھر محفل کا رنگ ہی مختلف ہوتا۔

......☆......

شہزادی اور اس کی بہن سفینہ کو آسیہ بیگم نے ایک شادی کی تقریب میں دیکھا۔ آسیہ کے ساتھ بانو بیگم بھی تھیں۔ وہ جہاں دیدہ عورت تھیں انہوں نے ایک نظر میں ہی پہچان لیا کہ شہزادی دولت کی بھوکی ہے جب کہ اس کی بہن اس کے برعکس ہے۔

"بانو بیگم۔ یہ دونوں لڑکیاں تو اس شہر کی نہیں لگتیں۔" آسیہ بیگم چپکے سے اس کے کانوں میں کہنے لگیں۔

"ہاں۔ آسیہ بی۔" وہ تائید سے سر ہلانے لگی۔ "یہ دولہا والوں کے قریبی رشتہ دار ہیں۔"

"تو...... کیا خیال ہے؟" آسیہ بیگم کے دماغ میں ایک خیال آیا۔

"کس بارے میں......؟" بانو پوچھنے لگیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ جو بڑی لڑکی ہے' یہ دولت کی بھوکی ہے۔" وہ سرگوشی کرنے لگیں۔ "کیا خیال ہے۔ امیر علی کے لیے مناسب رہے گی؟"

"ارے آسیہ بیگم! تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگیں۔" بانو کہنے لگیں۔ "مجھے ذرا جانچ پڑتال کا وقت تو دو۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہو۔" وہ ذرا مایوس ہو گئیں۔

"مایوس کیوں ہوتی ہو آسیہ بی۔" انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "فکر مت کرو۔ میں تمہیں تمہاری پسند کی بہو لا کے دوں گی۔"

تقریب تو دیر تک جاری رہی اور پوری تقریب میں آسیہ بیگم کی نظریں شہزادی کا طواف کرتی رہیں۔ بانو بیگم دولہا والوں کے اردگرد پھرنے لگیں۔ شاید وہ ان دونوں لڑکیوں کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں۔

دیر گئے جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو بانو بیگم کو ٹہوکا مار کر وہ پوچھنے لگیں۔ "بانو۔ تم نے اس لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم کیا کہ نہیں......؟"

"ہاں ہاں۔ آسیہ بیگم۔" وہ زیرِ لب مسکرا کر کہنے لگیں۔ "تم کہو اور میں تمہارا کام نہ کروں۔ ایسا کبھی ہوا ہے؟"

"وہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ اب بتاؤ بھی......!" آسیہ بیگم اشتیاق آمیز لہجے میں کہنے لگیں۔

"آسیہ بیگم!...... شہزادی...... تمہارے کام کی نہیں۔" بانو بیگم کے اس ایک جملے نے گویا بم پھوڑ دیا۔

"کیا......؟" وہ حیران رہ گئیں۔

"ہاں۔" بانو کہنے لگیں۔ "شہزادی بیوہ ہے۔ اس کا شوہر اور والد دونوں ایک حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے

کے بعد اس کی سسرال والوں سے نبھ نہ سکی اور اب وہ اپنے والدین کے گھر میں رہتی ہے لیکن ہے پیسے کی بہت بھوکی۔"

"حسین تو اتنی ہے کہ شادی شدہ لگتی ہی نہیں۔" آسیہ بیگم ذرا فکر مند ہو گئیں۔

"ارے تم پریشان نہ ہو۔" بانو بیگم کہنے لگیں۔ "ایک اور ہیرے کے بارے میں بھی پتا چلا ہے۔"

"کون ہے وہ......؟" وہ بے تاب سی ہو گئیں۔

"اسی شہزادی کی بہن سفینہ۔" بانو کہنے لگیں۔ "وہی جو اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ کالج میں پڑھتی ہے۔"

"پھر تو وہ بہت نک چڑھی ہوگی۔" آسیہ بیگم نے اسے اپنے خدشے سے آگاہ کیا۔

"ہاں۔ تیز مزاج تو ہے لیکن غربت کے خنجر نے اس کے سارے کس بل نکال دیے ہیں۔" وہ تفصیل سے کہنے لگیں۔ "طبیعت میں شہزادی کے الٹ ہے لیکن گھر میں سب کچھ شہزادی کے کہنے سے چلتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے شہزادی راضی تو سب راضی۔" وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

"ہاں تم ٹھیک سمجھی ہو۔" بانو نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اب تم سب مجھ پر چھوڑ دو۔ شہزادی کو راضی کرنا میری ذمے داری۔"

"اور مجھے یقین ہے کہ تم ناکام نہیں ہوگی۔" آسیہ بیگم نے تعریف کے ڈونگرے برسائے تو وہ شیطانی ہنسی ہنس دیں۔

......☆......

"ڈیڈی! میں پندرہ دنوں کے لیے دبئی جا رہا ہوں۔" امیر علی نے آفس میں عنایت علی کو بتایا۔

"کیوں......؟" انہوں نے فائل سے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

"ڈیڈی!...... تبدیلیٔ آب وہوا کی خاطر۔" امیر علی کہنے لگا۔ "آج کل یہاں بہت بوریت ہوتی جا رہی ہے۔"

"ہنہ...... تبدیلیٔ آب وہوا...... بوریت......" عنایت علی چشمہ سیدھا کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"مجھے پتا ہے تم کس قسم کی تبدیلی کے لیے جا رہے ہو؟"

"ڈیڈ...... جب آپ یہ سب کچھ سمجھتے ہیں تو پھر سوال جواب کیوں؟" وہ بے نیازانہ انداز میں بولا۔

"ساتھ کون کون جا رہا ہے؟" انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

"سبھی دوست۔" وہ کہنے لگا۔

"دیکھو امیر علی! عیاشی بہت ہو گئی۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "اب کچھ توجہ کاروبار پر بھی دو۔"

"ڈیڈی۔ آپ جو ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن اب تمہیں بھی ذمے داری کا احساس ہونا چاہیے۔ میرا ہاتھ بٹانا چاہیے۔" وہ کہنے لگے۔

"ڈیڈی! میں آپ کا ہاتھ ضرور بٹاؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ جب میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا۔" عنایت علی نے خشم گیں نگاہوں سے اسے گھورا۔

"نہیں ڈیڈی۔ ایسی بات نہیں۔" وہ بے اختیار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بات چاہے کچھ بھی ہو۔" ان کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ کہنے لگے۔ "یہ دبئی کا ٹور تم کر کے آؤ۔ اگر پھر تم نے اوباشانہ حرکتیں جاری رکھیں تو اخبارات میں اظہارِ لاتعلقی کا اشتہار دینے سے میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا...... سن لیا تم نے؟"

"جی ڈیڈی۔" وہ نظریں جھکا کر کہنے لگا۔ "آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

"اچھا...... اب جاؤ۔" عنایت علی دوبارہ فائل کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف آسیہ بیگم تھیں۔ کہنے لگیں۔

"سنیں۔ آپ گھر کب آ رہے ہیں؟"

"مجھے تو دیر ہو جائے گی۔ کیا خاص بات ہے؟" وہ پوچھنے لگے۔

"ہے بھی اور نہیں بھی۔" آسیہ بیگم نے گول مول جواب دیا۔

"یہ کیا تم پہیلیاں لے بیٹھیں۔" وہ درشت لہجے میں کہنے لگے۔ "صاف صاف بات کرو۔"

"آپ سے امیر علی کے بارے میں بات کرنی ہے۔" آسیہ بیگم ان کے لہجے کو سمجھ گئیں۔

"امیر علی۔ ارے بیگم۔ ابھی ابھی تو تمہارے اسی لاڈلے سے مغز ماری کر رہا تھا اور تم بھی اس کے بارے میں......" وہ کہنے لگے۔ "اچھا بتاؤ کیا بات ہے؟"

"ایسی باتیں فون پر نہیں کی جاتیں۔ گھر میں بیٹھ کر تسلی سے کریں گے۔" آسیہ بیگم کہنے لگیں۔

"تو اس وقت فون کرنے کا مقصد......؟" وہ چڑ گئے۔

"اوہو۔ آپ تو ناک پر غصہ جمائے بیٹھے ہیں۔" وہ بھی ان کے لہجے سے عاجز آ گئیں۔ کہنے لگیں۔ "کیا کاروبار میں گھاٹا ہوا ہے؟"

"ہوا نہیں تو ہو جائے گا اگر تم اور تمہارا بیٹا یونہی میرا وقت اور پیسہ ضائع کرتے رہے تو......" وہ کہنے لگے۔

"صاحب زادے دبئی جا رہے ہیں اور یہاں میں اکیلا ہی تم دونوں کے لیے پیسہ کمانے کی مشین بن گیا ہوں۔"

"اچھا اپنا موڈ ٹھیک رکھیں۔" آسیہ بیگم نرم پڑ گئیں۔ "آپ تسلی سے کام کریں اور شام کو ذرا جلدی گھر پہنچنے کی کوشش کریں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" انہوں نے فون پٹخ دیا۔

......☆......

بانو بیگم کی توقع کے مطابق ان لوگوں نے رشتے سے انکار نہیں کیا۔ بانو بیگم کے ساتھ ساتھ آسیہ بیگم نے بھی شہزادی کو ایسی پٹیاں پڑھائیں کہ دولت کی چکا چوند سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

آنکھوں میں برسوں سے پلنے والے خواب تعبیریں پانے لگے۔ نوکروں کی فوج، عالی شان گاڑیاں، بیرونی ممالک میں سیر و تفریح کے مواقع، دولت کی ریل پیل، زیورات کا نشہ، غرضیکہ ایسے جال تھے جن میں شہزادی ایسی پھنس گئی کہ باہر نکلنے کا ایک بھی راستہ نہ رہا۔ سفینہ کی عدم موجودگی میں ہی اس کی زندگی کا فیصلہ کیا گیا۔

بانو بیگم اور آسیہ بیگم خوشی خوشی وہاں سے رخصت ہوئیں۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ قدرت ان پر اس قدر مہربان ہو جائے گی اور ان کے بدنام بیٹے کا رشتہ آسانی سے طے ہو جائے گا۔

"واقعی پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔" انہوں نے دل ہی دل میں خیال کیا۔

"اب صرف خدا سے دعا ہے کہ شادی کے بعد میرا بیٹا سدھر جائے تو سمجھوں گی کہ میری محنت اکارت نہیں گئی۔

......☆......

سفینہ کے لاکھ انکار کے باوجود حتیٰ کہ خودکشی کی دھمکی دینے کے باوجود شہزادی نے من مانی کر کے اس کی زندگی کی ڈور امیر علی کے ہاتھ تھما دی۔

حسین بیوی پا کر وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ چند دنوں تک تو سفینہ کی ناز برداریاں سر تسلیم خم کر کے اٹھائی جاتی رہیں لیکن جس طرح پیتل پر سونے کا رنگ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا، اسی طرح امیر علی بھی آہستہ آہستہ اپنی پرانی عادتوں پر واپس آنے لگا۔ پھر وہی زندگی کی رنگینیاں اور ہوش ربا جسموں کے لشکارے اسے لبھانے لگے۔

سفینہ نے پہلے تو ان باتوں پر توجہ نہ دی لیکن آہستہ آہستہ سارے راز عیاں ہونے لگے۔ بالآخر ایک روز اسے آسیہ بیگم اور بانو بیگم کی گفتگو کے دوران پوری سازش کا پتا چل گیا کہ انہوں نے صرف اور صرف اپنے بگڑے ہوئے بیٹے کو سدھارنے کی غرض سے ایک بے رحمانہ رسم تلے اس کے خوابوں کو کچل دیا تھا۔ اسے ان کی ذہنیت پر افسوس ہونے لگا۔ کیونکہ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ شادی کے بعد بگڑی ہوئی اولاد سدھر جائے۔ گو کہ اس کے امکانات ہوتے ہیں لیکن ان موہوم امکانات کی خاطر ایک خوش حال زندگی کو عذاب بنانا کہاں کا انصاف ہے؟

شادی کے چھ ماہ بعد ہی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ بالآخر ایک رات امیر علی سے کہہ ہی دیا۔ "آپ دولت کے بل بوتے پر میری زندگی کے مالک تو بن بیٹھے ہیں لیکن جب

تک ان گندی عادتوں کو چھوڑیں گے نہیں...... میری روح کے مالک کبھی نہیں بن سکو گے۔"

"تو کیا تمہاری روح ضروری ہے؟" وہ استہزائیہ انداز میں پوچھنے لگے۔

"مطلب......؟" وہ پوچھنے لگی۔

"مطلب یہ کہ شادی میرے نزدیک صرف جسموں کا ملاپ ہے اس سے آگے کچھ نہیں۔" وہ کہنے لگا۔ "دوسرے لوگوں کے نزدیک اس بندھن کی اہمیت چاہے کچھ بھی ہو مجھے کوئی غرض نہیں۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ......؟" اسے توقع ہی نہیں تھی کہ امیر علی ایسی اوچھی ذہنیت کا مالک ہوگا۔

"حقیقت پسندی کی باتیں کر رہا ہوں۔" اس نے نیا جام بناتے ہوئے کہا۔ "معاشرے میں شادی اسی ملاپ کے لیے ہی تو کی جاتی ہے اسے قانونی شکل دینے کے لیے...... مقصد تو ایک ہی ہوتا ہے...... ہے نا......؟"

"ایسی گندی ذہنیت صرف کم ظرف لوگوں کی ہوتی ہے۔ شادی تو ایک پاک بندھن ہوتا ہے جو روحوں کو ملاتا ہے تبھی تو جوڑے اوپر بنتے ہیں۔" سفینہ تنک کر کہنے لگی۔

"اب زیادہ اکڑنے کی ضرورت نہیں۔ بیوی ہو تو حد میں رہو۔" امیر علی سے کوئی جواب بن نہ پایا۔

سفینہ اسے گھور کر رہ گئی۔ وہ بہ دستور پینے میں مشغول تھا۔ اس لیے یہ سوچ کر کہ ایسی حالت میں بات کر کے وقت ہی ضائع ہوتا۔ وہ کمرے سے نکل کر چھت پر آ گئی۔

تازہ ہوا اس کے جسم کے ایک ایک انگ سے کمرے کا حبس اور گھٹن نکالنے لگی۔ وہ بے اختیار آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

اس کے بعد امیر علی اور سفینہ کے درمیان پلنے والی خلیج بڑھتی گئی۔ بیٹے کی پیدائش پر اسے گمان ہونے لگا کہ شاید اب حالات تبدیل ہو جائیں۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ نہ امیر علی نہ اس کی حرکتیں۔

اس نے بارہا اپنی بہن شہزادی اور ماں عنبری کو بتایا لیکن وہ غریب ان امیروں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

شہزادی کو اب اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہونے لگا لیکن اپنی سبکی کے احساس کی وجہ سے کھلم کھلا اظہار نہ کر سکی اس لیے وہ سفینہ سے کہنے لگی۔ "دیکھو سفینہ! میاں بیوی میں نوک جھونک ہوتی رہتی ہے لیکن پھر بھی شوہر کو صحیح راستے پر لانے کے لیے بیوی کو ہمت اور درگزر سے کام لینا پڑتا ہے۔ تم بھی ایسا کرو۔"

"لیکن باجی۔ وہ کسی کی نہیں سنتا۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"اب تو مجھ پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا ہے۔"

یہ سن کر اسے بہت افسوس ہونے لگا کہ اس کے ایک غلط فیصلے کے باعث اس کی بہن کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے لیکن اب گئے وقت کو کون واپس لا سکتا ہے۔ آج اسے اپنے ماموں کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ واقعی وہ کتنے سچے اور جہاندیدہ آدمی تھے جنہوں نے بارہا اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ دولت کے سراب میں اندھی ہو گئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ دولت سے ہر نعمت، زندگی کا ہر سکھ خریدا جا سکتا ہے، لیکن یہ سب اسی کی خام خیالی تھی۔ وہ کس قدر غلط تھی اور اس کی غلطی کی سزا اس کی سگی بہن کو عمر بھر بھگتنی تھی۔

اس نے سمجھا بجھا کر سفینہ کو سسرال بھیج دیا لیکن امیر علی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی۔ بیٹے کی پہلی سالگرہ کی موقع پر اس میں اور امیر علی میں زبردست جھگڑا ہوا۔

جھگڑا کیا تھا ایک طوفان تھا جو پھٹ پڑا۔ اس طوفان کی لپیٹ میں آسیہ بیگم اور بانو بیگم بھی آ گئیں۔ دل میں برسوں سے پلنے والے لاوے کو راستہ مل گیا اور سفینہ نے سب کو کھری کھری سنا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ آسیہ بیگم اور بانو بیگم مجرموں کی طرح ایک طرف سر جھکائے کھڑی تھیں جنہوں نے سفینہ کو اپنی خواہش کے دہکتے الاؤ میں دھکیل دیا تھا...... لیکن وہ اپنی تمام زندگی دوسروں کی خواہش کی نذر نہیں کر سکتی تھی۔

اگلے چند دنوں میں اس نے نئی زندگی کی آس میں عدالت میں خلع کی درخواست دے دی۔

☆☆☆

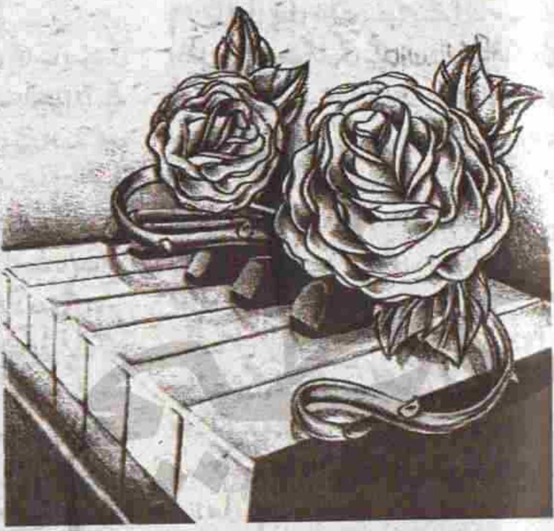
براز یل کی کہانی

گھر کے سامنے درختوں کے جھنڈ میں بیگر وؤں کے آج کی محنت کا معاوضہ لینے کے لیے جمع تھے۔ رات کی تاریکی میں انہیں انفرادی طور پر شناخت کرنا ممکن نہیں تھا لیکن سب نے آج بھی دل لگا کر کام کیا تھا اور وہ اپنی مزدوری کے حق دار تھے۔ اچانک اس گروہ سے ایک سایہ الگ ہوا اور اعتماد سے آگے بڑھا۔ سائے نے گھر کا پھاٹک کھول کر اندر قدم رکھا تو جوڈی اسے پہچان گیا۔ وہ سرخ بالوں والا شخص تھا جو ان کے گھر پہلے بھی آ چکا تھا۔

پیانو

کتاب: سہ ماہی ادبیات

اینی مل میکاڈو / صغیر ملال



ایک ناسٹیلجیا | ایک دل گداز کہانی

"روزیلا! سن رہی ہو؟" جوڈی نے چیخ کر کہا۔ "میں نے اسے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ کم بخت کو شرم بھی نہیں آئی۔ کہنے لگا یہ تو پانچ سو میں بھی مہنگا ہے۔"

"اچھا کیا۔" روزیلا نے اوپر کے کمرے سے جھانک کر جواب دیا۔ "مفت لینا چاہ رہا ہوگا تاکہ کسی شوقین کو بیچ دے۔ اسی طرح تو یہ لوگ امیر بن جاتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" جوڈی بڑبڑایا۔ "یہ ان کی پرانی ترکیب ہے۔"

روزیلا اور سارا نیچے آ کر پیانو پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے ساز کی بے عزتی کی گئی ہے۔

"تم دیکھنا ہمیں اس کی کتنی زبردست قیمت ملے گی۔" جوڈی نے اپنی بیوی اور بیٹی کے اعتماد میں اضافہ کیا۔ "اس طرح کے پیانو بنانے والے کاریگر دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔"

"اخبار میں چھوٹا سا اشتہار دے دو۔" روزیلا نے کہا۔ "خریداروں کی فوج جمع ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہمیں بالآخر اس سے جدا ہونا پڑے گا۔"

"یہ تو فن کا نمونہ ہے۔" جوڈی نے تائید میں سر ہلایا۔ "اس پر صرف نظر پڑ جائے تو کانوں میں موسیقی گونجنے لگتی ہے۔"

لیکن انہیں معلوم تھا کہ پیانو فروخت کیے بغیر چھوٹے کمرے کو سارا کے حجلہ عروسی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور پیانو کی قیمت ہی سے سارا کی شادی کا جوڑا تیار ہونا تھا۔

تین دن بعد اخبار میں اشتہار آ گیا اور اس دن صبح سے پیانو کو جھاڑ پونچھ کر اس پر پھولوں بھرے گل دان سجا دیے گئے۔

سب سے پہلے ایک عورت اپنی بیٹی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ لڑکی نے پیانو کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ کر ایک دھن کے مطابق انگلیاں چلائیں۔

"اس کے سب سر ڈھیلے ہیں امی۔" لڑکی نے کہا۔ "یہ اندر سے ہل گیا ہے۔"

عورت نے فوراً لڑکی کا ہاتھ تھام کر دروازے کا رخ کیا۔ "ذرا سوچو۔" عورت ناگواری سے بولی۔ "ایک

بے کار چیز کے لیے اتنا فاصلہ طے کیا۔“

جوڈی اور اس کی بیوی کے پاس جواب دینے کی فرصت نہیں تھی کیونکہ تین امیدوار بہ یک وقت اندر آ چکے تھے۔ سرخ بالوں والا ایک شخص، عینکیں پہنے ہوئے سنجیدہ چہرے والی ایک لڑکی اور ایک عورت جو اپنی نشست و برخاست سے کوئی دولت مند بیوہ معلوم ہوتی تھی۔

”میں آپ سے پہلے آئی تھی۔“ لڑکی نے دولت مند بیوہ سے کہا جو پیانو کا معائنہ کرنے آگے بڑھ رہی تھی۔

”کمرے میں پہلے داخل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ عورت کے لہجے میں تکبر تھا۔ ”میری کار گھر کے دروازے پر رک چکی تھی، محترمہ جب میں نے تمہیں سڑک پار بس سے اترتے دیکھا تھا۔“

گاہکوں کے درمیان یہ بحث گھر والوں کے لیے بہت خوش کن تھی۔ روزیلا نے مسکرا کر سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ان کے لیے کافی بنانے کچن میں چلی گئی۔ کافی پینے کے دوران عینکوں والی لڑکی پیانو کے گرد گھوم کر اسے آگے پیچھے سے دیکھتی رہی پھر یک لخت اس نے کسی ماہر فن کی طرح پیانو بجانا شروع کر دیا، لیکن پیانو سے نکلنے والی آواز واضح طور پر دل خراش تھی۔ ساز کن سرا تھا اور اس کی بنیادی ہم آہنگی یکسر بگڑ چکی تھی۔ جوڈی نے فوراً خواہش مندوں کے چہروں کی جانب دیکھا۔ دولت مند بیوہ کی پیشانی شکن آلود ہو چکی تھی۔ سرخ بالوں والا شخص جامد و ساکت بیٹھا رہا۔ اسی دوران ایک اور عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوئی اور ایک کونے میں بیٹھ کر پیانو کی آواز پر ہمہ تن گوش ہو گئی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے لوگ کمرۂ عدالت میں بیٹھے ہوں اور پیانو ملزم کی حیثیت سے اپنا دفاع پیش کر رہا ہو۔ لڑکی اس طرح انگلیاں چلا رہی تھی جیسے وہ ساز سے اس کے جرم کا اعتراف کروانا چاہتی ہو۔ کچھ کنجیوں سے بہت تیز اور ٹیڑھی آوازیں نکل رہی تھیں جب کہ کچھ کنجیاں پوری دبنے کے باوجود بالکل خاموش رہتی تھیں۔ اچانک گھر کی پالتو کتیا ڈولی پوری طاقت سے بھونکنے لگی۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی یہ بھی ان کا احسان تھا کہ کوئی قہقہہ مار کر نہیں ہنسا۔ جوڈی کو محسوس ہوا جیسے اب لڑکی کو ساز سے ذاتی ضد سی ہو گئی ہے۔ وہ مردہ کنجیوں پر دیر تک انگلیاں رکھ کر خاموشی کے وقفے کو بھی طویل کر رہی تھی اور تیز آواز والی کنجیوں پر ارادۃً زور سے ہاتھ مار کر دردناک حد تک اونچی گونج پیدا کر رہی تھی۔ یہ انتہائی غیر متوقع صورت حال تھی۔

”دراصل بات یہ ہے۔“ جب شرمندگی ناقابل برداشت ہو گئی تو جوڈی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ”کہ یہ ساز موسم کے سلسلے میں بہت حساس ہے، درجۂ حرارت میں ذرا سی کمی بیشی اس پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔“

لڑکی نے یک دم پیانو سے ہاتھ اٹھا لیے، اپنے ہونٹوں پر از سر نو لپ اسٹک کی تہ جمائی اور کندھے اچکا کر بولی۔ ”مجھے نہیں معلوم آپ لوگوں نے کیا سوچ کر اس ”معذور“ کا اخبار میں اشتہار دے دیا۔“ یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ چند لمحوں کے لیے جوڈی بھی خالی الذہن ہو کر فرش پر پڑے ایک دھبے کو گھورنے لگا۔ پھر اچانک اسے ہوش آیا اور اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ ”بات یہ ہے۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”اس طرح کے پیانو اب نہیں بنائے جاتے...... اس طرح کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔“

ماحول پر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ بالآخر بالوں والے شخص نے سب کی مشکل آسان کر دی۔ ”تم نے اس کی قیمت کیا لگائی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”پانچ ہزار۔“ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے پیش نظر جوڈی نے خود ہی قیمت آدھی کر دی تھی۔

سناٹا مزید گہرا سا ہو گیا۔

”میں سوچ کر بتاؤں گی۔“ دولت مند بیوہ نے اٹھلا کر کہا اور اس کے ساتھ ہی سب لوگ اٹھ کر چل پڑے۔

جب وہ کمرے سے نکل رہے تھے تو ایک نیا شخص پیانو پر نظریں گاڑے اندر داخل ہو رہا تھا۔

”آپ بھی پیانو خریدنے آئے ہیں؟“ جانے والوں میں کسی نے پوچھا۔ ”بات یہ ہے کہ......“

”آیئے، آیئے۔ خوش آمدید۔“ جوڈی نے رخصت ہونے والے کی بات مکمل ہونے سے پہلے بلند آواز میں کہا۔ ”بات یہ ہے کہ صبح سے لوگ آ رہے ہیں جا رہے ہیں اور بولیاں لگا رہے ہیں۔ آپ بھی آ گئیں۔ خوش آمدید۔“

ادھیڑ عمر نووارد کے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی کی جھلک تھی۔ وہ شکل سے بہت سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ساز کا ڈھکن اٹھا کر اسے نہایت غور سے دیکھا۔

”غالباً یہ شخص موسیقی کا استاد ہے۔“ جوڈی کو خیال آیا۔

نووارد نے پیانو کی قیمت نہیں پوچھی۔ ”شکریہ۔“ اس نے کہا اور خود ہی دروازہ کھول کر چلا گیا۔

سارا اپنے کمرے میں لوٹ گئی۔ روزیلا اور جوڈی نے ایک دوسرے کو مایوس نظروں سے دیکھا۔

”اس کی قدر کرنے والے لوگ کم ہیں۔“ جوڈی نے اداسی سے کہا۔ ”اگر صحیح قیمت نہ ملی تو میں اسے نہیں بیچوں گا۔“

”لیکن سارا کا عروسی جوڑا؟“ روزیلا آہستگی سے بولی۔

”میں قرض لے سکتا ہوں۔“

”تم اپنی تنخواہ سے قرض نہیں چکا پاؤ گے۔“

”ہم شادی ملتوی کر سکتے ہیں۔“

”جوڈی، وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ جوڑا ہو یا نہ ہو وہ شادی کرنا چاہیں گے۔ یہ ان کا مسئلہ نہیں ہے، ہماری عزت کا سوال ہے۔“

”جوڈی خاموش ہو گیا۔

”اور پھر اصل مصیبت جوڑا نہیں ہے۔“ روزیلا نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا مکان ماچس کی ڈبیا جتنا ہے۔ سارا اور اس کے خاوند کو صرف یہ کمرا دیا جا سکتا ہے اور جب تک یہاں سے پیانو نہیں ہٹے گا کمرے میں گندم کا دانہ بھی نہیں سما سکتا۔“

دوسرے دن جونہی جوڈی کام سے واپس آیا اس نے پیانو ہی کے بارے میں سوال کیا۔ ”آج کتنے لوگ اسے دیکھنے آئے؟“

”کچھ ٹیلی فون آئے۔“ روزیلا نے بتایا۔ ”ایک بوڑھا آدمی بھی آیا اور ہاں...... وہ سرخ بالوں والا شخص دوبارہ آیا تھا۔“

”کسی نے دلچسپی بھی ظاہر کی۔“

”ہاں۔ دلچسپی تو ظاہر کی مگر کوئی خریدنے پر آمادہ نہیں ہوا۔“

”دلچسپی تو لی۔“ جوڈی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”غور سے دیکھ رہے ہوں گے۔ ہے نا؟ تعریفی نظروں سے...... یہ فن کا نمونہ ہے۔ اس سے کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”بوڑھا آدمی تو اس سے بہت متاثر ہوا۔“ سارا نے کہا۔ ”ہر زاویے سے دیکھتا رہا۔ اس کا بس چلتا تو اسے آنکھوں میں سمیٹ کر گھر لے جاتا۔“

”بس آدمی کا باذوق ہونا ضروری ہے۔“ جوڈی فرطِ مسرت سے کھل گیا۔ ”پرانی چیزوں میں ایک ماورائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے...... ایک طرح کی روحانی صورتِ حال...... اس کی پہچان کے لیے صاحبِ نظر ہونا لازمی ہے۔ یہ قدرت کا عطیہ ہے، جسے مل گیا اس کی قسمت۔“

روزیلا اور سارا اسے خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ جوڈی اپنے باپ سے ورثے میں ملنے والے ساز کے سلسلے میں بہت حساس تھا۔ ”وہ اپنا پتا چھوڑ گیا، سارا؟...... وہ بوڑھا شخص جسے پیانو پسند آیا۔“ ”نہیں؟“ ”اوہ اچھا! اس کا دوبارہ آنے کا ارادہ ہوگا۔“ جوڈی ایک لمحے کے لیے بجھ گیا تھا، مگر فوراً ہی اس کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت واپس آ گئی اور وہ پیانو کے گرد چکر لگانے لگا۔

"میرا پیانو۔" اس نے پیار بھرے لہجے میں سرگوشی کی اور پیانو کی لکڑی پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے کسی جانور کی کمر سہلا رہا ہو۔

تیسرے دن کوئی نہیں آیا۔ ٹیلی فون پر ایک آواز نے دریافت کیا کہ پیانو نیا ہے یا پرانا؟ "پرانا ہے۔" روزیلا نے کہا۔ "مگر جس طرح ہم نے اس کی حفاظت کی ہے......" روزیلا کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے فون بند ہو گیا۔

"کل چھٹی کا دن ہے۔" جوڈی کو خیال آیا۔ "کل بہت لوگ آئیں گے۔"

ایک آدمی اپنی بیٹی کے ساتھ بہت بڑی کار میں آیا۔ وہ جوڈی کا خستہ حال مکان دیکھ کر باہر ہی سے واپس جانے لگا' مگر اپنی بیٹی کی ضد سے مجبور ہو کر نیم دلی سے دروازے تک آیا اور پیانو کے بارے میں چند بنیادی سوالات کر کے تیزی سے پلٹ گیا۔ "مجھے دراصل کسی اچھے ساز کی ضرورت ہے۔" اس نے جاتے ہوئے کہا۔

جوڈی کے چہرے کے نقوش غم و غصے کی شدت سے ابتر ہونے لگے تھے۔ اس نے ہمیشہ اپنے اجداد کی نشانی کو سینے سے لگائے رکھا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن اسے اپنے بزرگوں کے ورثے سے یوں جدا ہونا پڑے گا اور یہ بات تو اس کے لیے قیامت سے کم نہ تھی کہ پورے شہر میں کوئی اس فن پارے کی اصل حیثیت سے آشنا نہیں تھا۔ لوگ اسے عام سی چیز سمجھ رہے تھے اور یہ جوڈی کی توہین تھی۔

روزیلا کو ناامید ہونے میں دیر نہیں لگی لیکن وہ بہرحال اپنے شوہر کو مایوسی سے بچانا چاہتی تھی۔

"آج کتنے آئے؟" شام کے وقت اس کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا۔ "دو ٹیلی فون۔ انہوں نے اپنے نام نہیں بتائے۔ شاید ان کا خود آنے کا ارادہ ہو۔ ظاہر ہے نوادرات کی قیمت کا اندازہ انہیں دیکھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تو وہ بھی سمجھتے ہیں۔" روزیلا کی آواز ہموار اور لہجہ تسلی بخش ہوتا تھا۔

"سرخ بالوں والا نہیں آیا؟"

"وہ بھی آئے گا۔ مجھے یقین ہے۔"

چند دنوں بعد ٹیلی فون آنے بھی بند ہو گئے۔ جوڈی کے احساسات اس شخص جیسے تھے جس کا عزیز دوست ٹرین پر سوار ہونے کے لیے وقت پر نہ پہنچ پائے تو اسے دوست کی صورتِ حال پر افسوس ہونے کے باوجود اس بات کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ اب وہ مزید کچھ وقت اپنے دوست کے ساتھ گزار سکتا ہے۔ جوڈی پیانو کے پاس بیٹھ کر پہروں اسے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے خاندان کی تین نسلیں اس ساز پر موسیقی بجاتی جوان ہوئی تھیں۔ ہر نسل کے چند افراد تو زندگی کے آخری ایام تک اس پر اپنی پسندیدہ دھنیں بجاتے رہے تھے۔ اس پیانو نے کتنے لوگوں کا دل بہلایا تھا۔ اس کے آس پاس کتنے رقص ہوئے تھے۔ کتنی محبتیں پروان چڑھی تھیں۔ کتنے خواب دیکھے گئے تھے۔ محفلیں اجڑ گئی تھیں' نسلیں گزر گئی تھیں' مگر پیانو اپنی جگہ موجود تھا۔ اس کے بزرگوں کی نشانیوں میں سے واحد چیز تھی جو زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئی تھی۔ پیانو ایک لحاظ سے لازوال ثابت ہوا تھا۔

"سارا۔" اس نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔ "نیچے آؤ۔ ذرا چاپن کی دھن بجا کر سناؤ۔ دیکھوں تمہیں یاد ہے یا بھول گئی ہو۔"

"رہنے دیں پاپا۔" سارا نے اوپر سے جواب دیا۔ "اب پیانو کی آواز کانوں کو چبھتی ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو۔" روزیلا نے سرگوشی کی۔ "تمہیں اپنے ابا کے جذبات کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" سارا نے ناگواری سے کہا۔ "جب تک یہ کھٹارا گھر سے نہیں نکلتا' میرے اور لیفٹیننٹ کے لیے جگہ نہیں بنے گی...... ہمارا پلنگ کہاں سمائے گا؟"

دن پر دن گزرتے گئے لیکن موسیقی کا کوئی شوقین پیانو کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل کرنے بھی نہیں آیا۔ ایک روز سرخ بالوں والے شخص نے فون کر کے ساز کے بارے میں یوں پوچھا جیسے کوئی ڈاکٹر کسی قریب المرگ مریض کا حال دریافت کر رہا ہو۔

"جوڈی' کچھ سوچا؟ اب ہم کیا کریں گے؟" بالآخر روزیلا پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"کس سلسلے میں کیا کریں گے؟" جوڈی نے حیرت سے دریافت کیا۔

"یہی...... پیانو!"

"میں اسے نہیں بیچوں گا۔" یک لخت جوڈی کی آواز اونچی ہو گئی۔ "ان کیڑے مکوڑوں کو معلوم ہی نہیں کہ پیانو ہوتا کیا ہے۔ یہ تو ہر چیز میں منافع کمانا چاہتے ہیں کوئی موسیقی کا سچا شوقین ہو تو اسے یہ مفت دینے کو تیار ہوں۔ کم از کم وہ اس کی عزت تو کرے گا۔ اس کا مقام تو پہچانے گا۔"

جوڈی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ مٹھیاں بھینچ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ "سنو روزیلا' تجویز کا میں اپنے رشتے داروں کو فون کرتے ہیں۔"

روزیلا اس کے فیصلے سے خوش ہو گئی۔

"ہیلو' کون؟ ماسیا؟ یاہر گیا ہوا ہے۔ تم کون؟ اوہ موکٹیا! میں جوڈی' سنو' ہم تمہیں اپنا پیانو دینا چاہتے ہیں...... ہاں تحفہ...... نہیں بھئی مذاق کیوں کریں گے...... ہاں ہاں واقعی...... بالکل مفت...... کیا؟ ظاہر ہے تحفے کی قیمت کون لیتا ہے...... کیونکہ اس طرح یہ خاندان ہی میں رہے گا۔ گھر کی چیز گھر میں رہے تو اچھا ہے۔ بس آدمی بھیجو اور اٹھوا لو۔ شکریے کی کیا بات ہے...... تم اور ہم ایک ہی تو ہیں...... ہاں' ہمیں بھی خوشی ہوئی۔"

فون بند کر کے وہ روزیلا کی جانب رخ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ یقین ہی نہیں کر رہی تھی۔ کہنے لگی اپریل سے پہلے ہی اپریل فول بنا رہے ہو؟ احمق!"

روزیلا عرصے کے بعد اتنی خوش دلی سے ہنسی تھی۔ جوڈی پیانو کے اتنے نزدیک چلا گیا جیسے اس سے باتیں کرنا چاہ رہا ہو۔

"میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔" اس نے زیرِ لب کہا۔ "میں تمہاری توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارا ان سے خون کا رشتہ ہے' تم خاندان ہی میں رہو گے۔ میرے بچوں کے بچے بھی تمہیں پہچانیں گے۔ تمہاری عزت کریں گے۔ تم انہیں بھی دل کش دھنیں سناؤ گے۔ مجھے معلوم ہے میں نے جو کچھ کیا ہے تمہاری بہتری کے لیے کیا ہے۔ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو گے۔"

"وہ اپنا آدمی کب بھیج رہے ہیں؟" روزیلا بیچ میں بول پڑی۔ اسے دولہا' دلہن کے لیے کمرا سجانے کی جلدی تھی۔

دوسرے دن ماسیا کا فون آیا۔ وہ دیر تک روزیلا سے باتیں کرتا رہا۔ کیا وہ واقعی پیانو انہیں تحفتہً دے رہے تھے؟ جب اس کی بیوی نے اسے خبر دی تو اسے یقین نہیں آیا۔ وہ سب ان کی فراخ دلی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ آج کل کون اپنے رشتے داروں کا اتنا خیال رکھتا ہے۔

"تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے' ماسیا۔" روزیلا بولی۔ "تمہیں معلوم ہے ہمارے گھر میں کتنی کم گنجائش ہے اور کمرے تو مضحکہ خیز حد تک تنگ ہیں۔ ہم سارا اور اس کے خاوند کے کمرے کو کشادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں پیانو یہاں سے ہٹانا ہو گا اور جوڈی اپنے خاندانی ساز کو اجنبیوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ پیانو تمہیں دینے کا مطلب ہے گھر کی چیز گھر ہی میں رہے گی۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے؟ تم فوراً آدمی بھیجو۔"

کئی دن گزر گئے۔ کوئی نہیں آیا۔ جوڈی اور روزیلا کو اپنے رشتے داروں کی خاموشی پر تعجب ہوا۔

روزیلا نے انہیں فون کیا۔ وہ بہت شرمندہ تھے۔ ویگن کے کرائے اور مزدوروں کے معاوضے نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ "کچھ دن ٹھہر جاؤ۔" ماسیا نے کہا۔ "ہم کوئی

سستا طریقہ ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہم خود پیانو لانے کے لیے بہت بے چین ہیں۔ ہم دن رات اسی کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔"

ایک ہفتے بعد جوڈی نے ان سے رابطہ قائم کیا۔

"تمہیں پیانو چاہیے یا نہیں چاہیے' ماسیا۔" اس نے دو ٹوک انداز اختیار کیا۔

"جوڈی تم سوچ نہیں سکتے ہم پر کیا گزر رہی ہے۔" کسی نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ "تم ایک تحفہ دے رہے ہو اور ہم اسے قبول نہیں کر پا رہے۔ مزدور اور ویگن والے تو کھال اتارنے پر تلے ہوئے ہوئے ہی ہیں' لیکن ہمیں یہ خیال نہیں آیا کہ ہمارا گھر جو پہلے بہت بڑا تھا اب اتنا بڑا نہیں رہا۔ میرا مطلب ہے جتنا سامان ہم گزشتہ برسوں میں خریدتے رہے ہیں اس کے بعد تو ہمارے گھر میں بھی اب پہلی جیسی گنجائش نہیں رہی ہے۔ یقیناً ہمیں یہ بات پہلے ہی سوچنی چاہیے تھی مگر...... خدایا اس قدر شرمندگی ہو رہی ہے کہ......"

"تو تمہیں پیانو نہیں چاہیے۔"

"کیسی بات کر رہے ہو۔ ہمیں چاہیے۔ میرا مطلب ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کو اپنے پاس رکھیں لیکن کیسے رکھیں؟ رکھ بھی نہیں سکتے۔"

جوڈی نے ٹیلی فون بند کر کے روزیلا کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ "تم نے دیکھا' روزیلا۔ ہم پیانو مفت بھی نہیں دے سکتے۔ ہم اسے کسی کو دے بھی نہیں سکتے۔"

کمرے میں چھانے والی سنگین خاموشی کو سارا کی سسکیوں نے توڑا۔ وہ یک لخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"فکر نہیں کرو بیٹی۔" اس کی ماں نے تسلی دی۔ "اب ہم اس کی قیمت پر بحث ہی نہیں کریں گے' جس نے جتنی قیمت لگائی ہم قبول کرلیں گے۔"

"اسے اسی وقت دفع کریں' امی۔" سارا نے تلخی سے کہا۔ "اسی وقت۔ ابھی۔ چند دنوں میں میری شادی ہونے والی ہے اور میرا کمرا ابھی تیار نہیں ہوا۔ کوئی چیز نہیں آرہی۔ صرف اس لیے کہ یہ...... یہ منحوس پیانو یہاں سے نکل نہیں رہا۔"

"آہستہ بولو بیٹی۔ تمہارے ابا سن لیں گے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ وہ سنیں۔ انہیں سننا چاہیے۔ وہ کب تک کان بند کیے رکھیں گے۔"

اس رات جوڈی بہت کم سویا۔ وہ انسانی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آدمی زندہ کیوں رہنا چاہتا ہے۔ صبح کے قریب وہ زندگی اور پیانو کے خلاف ہو چکا تھا۔ وہ کام پر جانے کی بجائے محلے کے شراب خانے میں چلا گیا۔

روزیلا حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کا خاوند شرابی نہیں تھا۔

دوپہر کے وقت وہ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تین مزدوروں کے ہمراہ گھر واپس آیا مزدوروں نے پیانو کو اچھی طرح ناپنے تولنے کے بعد صاف کہہ دیا کہ اتنا بڑا ساز اٹھا کر لے جانے کے لیے تین سے زیادہ مزدور چاہیے ہوں گے۔

"کوئی گاہک مل گیا؟" ماں اور بیٹی نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ اسے کوئی نہیں خریدنا چاہتا۔"

"تو مفت دینے کا فیصلہ کرلیا؟"

"نہیں' میری پیاری بیوی۔ اسے کوئی مفت نہیں لینا چاہتا۔"

"تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

جوڈی کی آنکھیں نم ہو گئیں' مگر اس کی آواز ہموار رہی۔ "میں اسے سمندر میں پھنکوا رہا ہوں۔"

"نہیں' پاپا' نہیں۔" سارا چیخ پڑی۔ "یہ پاگل پن ہے۔"

سمندر ان کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ انہیں رات کی خاموشی میں کبھی کبھی بپھرے ہوئے سمندر کی لہروں کی گونج سنائی دیتی تھی۔ ان کے گھر سے ساحل تک پہنچنے

کے لیے مکانوں کی تین قطاریں عبور کرنی پڑتی تھیں۔

"لیکن' جوڈی۔" روزیلا نے گہری سوچ سے نکل کر کہا۔ "ہمیں پہلے بات کر لینی چاہیے تھی۔ شاید کوئی اور راستہ نکل آتا۔ لوگ اس بات کا بہت مذاق اڑائیں گے۔ پیانو سمندر میں پھینکتے دیکھ کر محلے والے بہت ہنسیں گے۔"

"ہم اور کیا کر سکتے ہیں' روزیلا؟ یوں بھی کتنے جہاز سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی پر پیانو بھی ہوتے ہیں۔"

لیکن پیانو ان تین مزدوروں کے بس سے باہر تھا۔

"ٹھیک ہے۔" جوڈی نے مزدوروں کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ "کل ہم زیادہ آدمی لائیں گے۔"

تینوں مزدور کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے پھر ان میں ایک ڈرتے ڈرتے آگے آیا اور جھجکتے ہوئے تینوں کی نمائندگی کرنے لگا۔ "بات یہ ہے جناب کہ اتنی قیمتی چیز کا سمندر میں پھینک دینا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ اتنی اچھی حالت میں ہے۔ آپ اس کے لیے اخبار میں اشتہار کیوں نہیں دیتے؟"

"کیا؟" جوڈی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ہاں' اخبار میں اشتہار ٹھیک ہے۔ تم جاؤ' شکریہ۔"

مزدوروں کے جانے کے بعد روزیلا نے اپنے خاوند کے سینے پر سر رکھ دیا اور آنسو روکنے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لیں۔

"اوہ' جوڈی تم نے کتنا عجیب فیصلہ کیا ہے۔"

"لیکن اگر یہ یہاں نہیں رہ سکتا اور اسے کوئی دوسرا گھر بھی میسر نہیں آرہا تو کیا اسے گلی میں رکھ دوں؟ گلی میں تو......"

"مجھے معلوم ہے' جوڈی۔ میں سمجھتی ہوں پیارے۔ مگر میرے دل پر بوجھ ہے۔ اس نے ہمارے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ان کے احساسات کی ترجمانی کی ہے اور اب...... اتنے عرصے بعد ہم اسے سمندر میں پھینکنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ذرا اس پر نظر ڈالو۔ کیسے چپ چاپ کھڑا ہے۔ اپنے انجام سے بے خبر...... بیس سال سے تو یہ اسی کونے میں موجود ہے...... بے ضرر اور معصوم۔"

"ہمیں جذباتی ہونے سے بچنا چاہیے' روزیلا۔"

روزیلا نے اپنے خاوند کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ وہ واقعی مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ "تمہارا جو جی چاہے کرو' جوڈی۔" اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

ان کے گھر کے عقب میں سیاہ فام آبادی کے نشیبی علاقے تھے' جہاں کالے بچے صبح سے شام تک خاک میں لوٹیں لگاتے' راہ گیروں سے ان کی ادھ کھائی آئس کریمیں مانگتے اور سینما گھروں کے باہر لگی تصویروں کو دیکھ کر فحش حرکتیں کرتے تھے۔ جوڈی نے نشیبی علاقے سے نیگرو بچے جمع کیے اور انہیں طرح طرح کے لالچ دیتا گھر تک لے آیا۔

آج ہوا کی تندی سے بحر اوقیانوس کی لہریں خطرے کے نشان تک جھاگ کے ڈھیر لگا رہی تھیں لیکن کمرے کے نیم تاریک کونے میں پرانا پیانو حسب دستور خاموش تمکنت اور وقار کے ساتھ اپنی نمایاں حیثیت پر فائز تھا۔

جوڈی نے کمرے میں داخل ہو کر ایک لمحے کے لیے پیانو کو نظر بھر کر دیکھا۔ "آجاؤ' بچو۔" اس سے پہلے کہ اس کے دل میں اٹھنے والا غبار اس کی بینائی کو دھندلا کرتا وہ دروازے سے باہر جھانک کر چیخا۔ "شاباش آجاؤ۔ آج معلوم ہو جائے گا تم کتنے طاقت ور ہو۔"

چار بجے سہ پہر جوڈی کے گھر سے پیانو کا جنازہ گلی میں نمودار ہوا۔ لوگوں نے دائیں بائیں ہو کر پیانو کے لیے بیچ کا راستہ کھلا چھوڑ دیا۔ کچھ لوگ نزدیک آکر اسے دیکھتے رہے اور کچھ اسے چھونے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ روزیلا اور سارا اپنے دروازے پر کھڑی اسے گلی عبور کرتے دیکھ رہی تھیں۔ دونوں اپنی ڈبڈباتی آنکھیں ایک دوسرے سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

“کس طرف؟” گلی کے کونے پر پہنچ کر نیگرو بچوں نے پوچھا۔

“سمندر کی طرف۔” جوڈی نے نیوی کے کمانڈر کی طرح تحکمانہ لہجے میں کہا اور چند لمحوں تک بحر اوقیانوس کی جانب انگلی لہراتا رہا۔

“سمندر کی طرف۔ سمندر کی طرف۔” بچوں نے یک زبان ہو کر کہا اور جوش میں اتنی تیزی سے ہاتھ بدلے کہ پیانو ڈگمگا گیا۔

لڑکے سمجھ گئے تھے کہ پیانو کو پانی میں ڈبو دیا جائے گا۔ اس انکشاف سے وہ مزے میں آ گئے تھے۔ اب انہوں نے گنگنانا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ یک لخت اتنا ہنگامہ برپا ہو گیا کہ جوڈی کی پالتو کتیا ’ڈولی‘ جواب تک اس کے قدموں کے ساتھ خاموشی سے چل رہی تھی‘ ہوا میں اچھل اچھل کر بھونکنے لگی۔

جہاں جہاں سے جلوس گزرتا‘ دروازے اور کھڑکیاں کھل جاتیں۔ بالکونیوں پر زیادہ تر نوجوان لڑکیاں جمع ہو جاتی تھیں‘ جنہیں دیکھ کر پیانو بردار نیگرو لڑکے اور زور سے گنگنانے لگتے تھے۔ عجیب عجیب آوازیں سنائی دیتیں۔

“خداوندا‘ یہ کیا ہے!” ایک عورت بولی۔

“پیانو ہے!” دوسری نے جواب دیا۔

“پیانو؟”

“ہاں‘ ہاں پیانو ہے۔” ایک نیگرو بچہ جسے بڑی عمر کے لڑکے ساز کو ہاتھ نہیں لگانے دے رہے تھے ہر مکان کے سامنے جا کر پورے خاندان کو مطلع کرتا تھا۔ “پیانو ہے۔ ننانوے نمبر والوں کے ہاں سے آیا ہے۔”

“وہاں تو سارا رہتی ہے۔” کوئی لڑکی کہتی ہے۔

“رہتی ہوگی‘ مگر یہ تو سمندر میں ڈوبنے جا رہا ہے۔”

“تم اسے بیچ کیوں نہیں دیتے‘ جوڈی۔” کوئی آشنا جوڈی کے کان میں سرگوشی کرتا۔

“بیچ دیا۔” جوڈی نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ “سمندر کو بیچ دیا۔ بحر اوقیانوس سے بڑا خریدار کون ہو سکتا ہے؟” پھر وہ جوش میں آ کر نیوی کے کمانڈر کا روپ دھار لیتا۔ “شاباش لڑکو‘ شاباش‘ چلتے رہو‘ ذرا بائیں جانب حوصلے سے‘ چلتے رہو‘ سمندر کی طرف‘ شاباش۔”

وقفے وقفے سے کوئی لڑکا مستی میں آ کر بازو بڑھاتا اور پیانو کی کنجیوں پر ہاتھ چلانے لگتا۔ ایسے موقعوں پر پیانو سے آخری ہچکیوں جیسی آوازیں آتیں۔

“بیچو گے؟” ایک عورت نے بالکونی سے آواز لگائی۔

“نہیں مادام!” جوڈی نے اتنی ہی بلند آواز میں جواب دیا۔ “بیچوں گا نہیں‘ مفت دوں گا‘ تحفہ...... چاہیے؟”

عورت جھینپ گئی۔ اس نے پاؤں پٹخ کر کچھ کہا اور گھر کے اندر چلی گئی۔

پولینڈ کے مہاجروں کا ایک خاندان جوڈی کی بات سنتے ہی پیانو کے قریب آ گیا۔ “ہمیں چاہیے۔” خاندان کے سربراہ نے کہا۔

“ٹھیک ہے تمہارا ہو گیا۔ لے جاؤ۔” جوڈی نے لڑکوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔

“ہاں ہمیں چاہیے مگر...... اس کے لیے گھر میں جگہ بنانی پڑے گی۔ یہ کوئی چھوٹی چیز تو ہے نہیں کہ...... کل شام تک......”

“ابھی...... یا کبھی نہیں......” جوڈی نے ان کی بات کاٹی۔ “یہ تمہارے گھر کے سامنے رکھا ہے۔ چاہے تو اٹھا کر لے جاؤ۔ ابھی۔ اسی وقت۔ نہیں؟ چلو بچو شاباش چلو۔”

پیانو آہستہ آہستہ سمندر کے قریب پہنچتا جا رہا تھا۔ بالکونیوں سے دیکھنے والوں کو یوں لگ رہا تھا جیسے مردہ کاکروچ کو چیونٹیاں اٹھائے لے جا رہی ہوں۔

“یہ تو پاگل پن ہے۔” ایک کھڑکی سے آواز آئی۔

“پاگل پن؟” جوڈی نے کہا۔ “تو تم لے لو۔ آؤ۔ لے جاؤ۔” کھڑکی بند ہو گئی۔

یہ واقعہ کئی بار پیش آیا۔ بہت سے لوگوں کو پیانو کو یوں لے جا کر پانی میں بہا دینا احمقانہ عمل محسوس ہوا اور انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ ساز کا مالک اسے اونے پونے بیچ کیوں نہیں دیتا؟ مگر جونہی جوڈی نے انہیں پیانو مفت پیش کیا وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اتنی بڑی چیز کو کھڑے کھڑے گھر لے جانا بھی تو ممکن نہیں تھا۔

بالآخر جوڈی اس طرح کی باتوں اور تبصروں سے بے نیاز ہو کر چلنے لگا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دخل در معقولات کرنے والوں سے لاتعلق رہے گا اور ان کے سوالوں کا جواب نہیں دے گا۔

ساحلی سڑک پر موٹر سائیکلوں پر سوار پولیس والوں نے جلوس کا راستہ روک لیا۔ جوڈی کو اپنے ارادے اور منصوبے کی تفصیلات بیان کرنی پڑیں۔ ملک حالت جنگ میں تھا اور ساحلی علاقوں کی غیر معمولی نگرانی کی جا رہی تھی۔ جوڈی نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ پولیس والوں نے پیانو کو حیرت اور حقارت سے دیکھا تو جوڈی کا دل درد سے بھر گیا۔

“یہ ایک ایسا پیانو ہے جس پر برازیل کو فخر ہونا چاہیے۔” اس نے پیانو پر یوں ہاتھ رکھا جیسے کوئی بیمار دوست کی پیشانی پر ہاتھ رکھتا ہے۔ “اس جیسا ساز تیار کرنے والا فن کار آج ملک بھر میں دستیاب نہیں ہے۔ عظیم ترین موسیقار اس کی خوبیوں کے معترف رہے ہیں۔ چوپن جیسا ماہر فن اس کے سوا کسی اور پیانو کے سامنے بیٹھنے پر رضامند ہی نہیں ہوتا تھا لیکن ہر چیز کی ایک معیاد ہوتی ہے۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ اس پیانو کا وقت بھی گزر گیا۔ میری بیٹی سارا کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔ کمرے میں اتنی گنجائش نہیں ہے اور اس پیانو کا اب کوئی پرستار...... کوئی خریدار نہیں...... اس کے لیے یہی ایک راستہ ہے۔” جوڈی نے سمندر کی جانب اشارہ کیا۔

نیگرو لڑکے اور راستے میں جمع ہونے والے بچے اور ساتھ آ جانے والی عورتیں اور مرد جوڈی کی طویل گفتگو سے اکتا گئے۔ وہ جلد از جلد پیانو کو لہروں کے سپرد ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔

پولیس والوں نے پیانو کو ٹھوک بجا کر دیکھا‘ مگر کوئی قابل اعتراض چیز نہ پانے پر انہوں نے بھی جوڈی کو تیز چلنے کی ہدایت کی کیونکہ جلوس کی سست رفتاری کے باعث سڑک کی ٹریفک متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔ انہوں نے اپنی رفتار بڑھا دی مگر وہ گھر سے نکلے ہی دیر میں تھے کچھ ہی دیر میں اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ ایک ساحلی گارڈ نے انہیں بتایا کہ شام چھ بجے کے بعد انہیں سمندری حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ انہیں کل صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔ نیگرو لڑکوں نے پیانو کو وہیں رکھ دیا اور بددلی سے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اب انہیں اپنا بقیہ کام کل مکمل کرنا تھا جس کے باعث ان کا معاوضہ بھی رہ گیا تھا۔

جوڈی انتہائی شکستہ دل اور خستہ حال گھر واپس پہنچا۔

آدھی رات کو میاں بیوی تیز بارش کی آواز سے اٹھ بیٹھے۔ بجلی چمک رہی تھی اور طوفان باد و باراں اپنی انتہا پر تھا۔ انہوں نے بتی روشن کی اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

“میں پیانو کے بارے میں سوچ رہا تھا‘ روزیلا۔”

“میں بھی...... بے چارہ...... باہر بارش میں اور اتنی ٹھنڈ اور ہوا۔”

“ہر چیز میں پانی چلا گیا ہوگا۔ ہر چیز میں۔ پانی کو تو بس ذرا سی جگہ چاہیے ہوتی ہے اور پیانو میں ایسی بہت سی جگہیں ہوتی ہیں‘ ہے نا‘ روزیلا؟”

“ہاں جوڈی۔ پیانو نے ہماری نسلوں کو تسکین پہنچائی تھی لیکن ہم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟”

“چپ ہو جاؤ‘ روزیلا۔ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔” جوڈی کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

وہ ایک دوسرے کے چہرے سے نظریں ہٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ بجلی کی چمک میں درخت نمایاں ہوتے تو شاخیں رقص کرتے مستانوں کی طرح سر جھٹکتی

دکھائی دیتیں۔ جوڈی نے خوف زدہ ہوکر دوبارہ آنکھیں موند لیں، لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ چونک کا اٹھ بیٹھا۔

''روزیلا۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ہر وہ دھن سنی جو کبھی اس پر بجائی گئی۔ بہت سے ہاتھ...... ان گنت انگلیاں۔ میری دادی کے ہاتھ۔ میری امی کے۔ تمہاری امی کے۔ سارا کے ہاتھ اور ہماری وہ خالہ جو نیند میں چلتی تھیں، ان کی ابھری ہوئی رگوں والی انگلیاں...... اور...... اور بیک وقت بیس سے زیادہ ہاتھ۔ سو سے زیادہ انگلیاں پیانو بجارہی تھیں۔ یقین کرو میں نے اس سے زیادہ دل کش موسیقی زندگی میں کبھی نہیں سنی۔ یہ روح پرور موسیقی تھی، روزیلا۔ مردہ انگلیاں زندہ انگلیوں سے زیادہ مہارت سے حرکت کررہی تھیں۔ لڑکیوں نے ان نوجوانوں کے ہاتھ تھام رکھے تھے جن سے ان کی زمانہ آئندہ میں شادی ہونی تھی۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے مجھے حقارت سے دیکھا۔ میرے لیے ان کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پیانو بجانے والے ہاتھ رک گئے۔ انگلیاں سمٹ گئیں...... لیکن پیانو خاموش نہیں ہوا۔ اس میں تابوت کے پیچھے بجائے جانے والی دھن ابھرنے لگی۔ پھر کمرے میں پانی بھرنے لگا اور پیانو لہروں کے ساتھ بہنے لگا۔ سمندر کی طرف...... میں اس کے پیچھے دوڑا مگر وہ میرے ہاتھ نہیں آیا۔ میں نے اسے آوازیں دیں۔ اس کی منتیں کیں لیکن وہ مجھ سے ناراض تھا، روزیلا، اوہ روزیلا۔ وہ بہتا چلا گیا......'' جوڈی کا سانس ناہموار ہوگیا تھا۔ اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ وہ دھاڑیں مارنے والا تھا۔

صبح کی روشنی پھیلتے ہی جوڈی بستر سے چھلانگ مار کر اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ سیاہ فاموں کے علاقے تک دوڑتا چلا گیا۔ وہ اب جلد از جلد اس مسئلے سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی پہلی آواز پر لڑکے اس کے گرد جمع ہوگئے۔

بارش تھم چکی تھی، مگر ہوا کی تندی میں کمی نہیں آئی تھی جس کے باعث سمندر غیر معمولی طور پر بپھرا ہوا تھا۔ آج لڑکوں کے ساتھ سیاہ فاموں کی جھونپڑیوں سے بہت سے بڑی عمر کے مرد بھی نکل آئے تھے۔ ''شاباش، چلو چلیں۔'' جوڈی نے حسبِ سابق تحکمانہ لہجے میں کہا۔ مگر آج اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

ساحل پر لڑکوں کے پاؤں ریت میں دھنسنے کے باعث پیانو کی رفتار سست اور بے ڈول ہوگئی۔ بالآخر جھاگ بناتی بپھری ہوئی لہریں اس کو چھو کر پلٹنے لگیں۔ لیکن لڑکے جوڈی کی حوصلہ افزائی پر پانی کے اندر دور تک چلے گئے یہاں تک کہ پیانو کا بوجھ موجوں کے سپرد ہوگیا اور اس کی چاروں ٹانگیں زمین کی سطح سے اٹھ گئیں۔ دو بڑی لہروں نے اس کا رخ پھیر دیا۔ تیسری لہر نے اسے الٹا کردیا اور چوتھی لہر اسے سمندر کی وسعتوں کی جانب بہالے گئی۔

جوڈی گھٹنوں تک پانی میں کھڑا تاحدِ نظر پیانو کو دیکھتا رہا۔ اس کا منہ غیر اختیاری طور پر کھل گیا تھا اور آنکھیں نم آلود ہورہی تھیں۔ اگر لہروں کے چھینٹوں سے سب کے چہرے تر نہ ہوجاتے تو تمام تماشائیوں کو معلوم ہوجاتا کہ جوڈی رو رہا ہے۔

ساحل پر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔ ہر شخص اصل واقعہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ پہلی افواہ یہ پھیلی کہ پولینڈ کے مہاجروں کا ایک پورا خاندان ڈوب گیا ہے۔ دوسری خبر تھی کہ صرف ایک آدمی تند لہروں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ چند افراد کا کہنا تھا کہ ڈوبنے والا ایک بچہ تھا جو خطرناک حد تک آگے چلا گیا تھا جب کہ دوسروں کا اصرار تھا کہ انہوں نے خود اس عورت کو دیکھا تھا جس نے محبت میں ناکام ہوکر خود کو پانی کے سپرد کردیا تھا۔ بہرحال شام تک سارے علاقے کو معلوم ہوگیا کہ یہ محض ایک پرانے ساز کا غیر معمولی انجام تھا۔

جوڈی زمین پر نظریں گاڑے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر واپس آگیا۔ اسے راستے میں طرح طرح کی باتیں

سننی پڑیں، مگر وہ خاموش رہا۔

کچھ لوگوں نے اسے طعنے دیے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اس کی دانش مندی اور فیصلے کی تعریف کر رہے تھے۔

وہ چلا گیا ہے، روزیلا۔'' اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔ ''ہمیشہ کے لیے۔''

''جاؤ، جوڈی۔'' اس کی بیوی پیار بھری آواز میں بولی۔ ''پہلے اپنے کپڑے بدل لو۔''

''اب ہم اسے کبھی نہیں دیکھیں گے، روزیلا۔''

''ظاہر ہے۔ اسی لیے تو ہم نے اسے سمندر میں پھنکوایا ہے۔''

''کیا پتا۔'' سارا نے انگلی نچا کر کہا۔ ''وہ کسی جزیرے پر پہنچ جائے۔''

''اب اس کے بارے میں مزید کچھ سوچنا بے سود ہے۔'' روزیلا نے فیصلہ کن انداز اپنایا۔ ''جو کچھ ہونا تھا، ہوچکا۔ تم جاؤ، سارا اپنے کمرے کی صفائی شروع کرو۔''

سارا کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی، مگر جوڈی کا اضطراب کم نہیں ہوا تھا۔ ''میں نے لہروں کو اسے نگلتے دیکھا۔''

''بس کرو، جوڈی۔ بس کرو۔ بہت ہوگیا۔''

''ڈوبنے سے پہلے وہ دوبارہ سطح پر نمودار ہوا تھا۔''

''مگر اب وہ بہرحال تہ میں بیٹھ چکا ہے۔''

''آخری لمحوں میں وہ جنازے کی دھن بجارہا تھا۔''

''یہ دھن تم نے رات کو خواب میں سنی تھی۔''

''ہاں۔ لیکن آج تو میں نیند میں نہیں تھا۔ میں پوری طرح بیدار تھا۔ وہ عجیب سوگوار موسیقی تھی۔ جب تک وہ پوری طرح غرقاب نہیں ہوا۔ وہ اسی غم زدہ انداز میں کائنات سے مخاطب رہا۔ آخری وقت تک......'' جوڈی سر جھکا کر گہری سوچ میں چلا گیا۔ پھر وہ خود کلامی کرنے لگا۔ ''اب تو وہ بہت دور جاچکا ہوگا۔ پانی کی تہ میں...... اسے عجیب مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ ڈوبے ہوئے جہاز...... آبدوزیں...... مچھلیاں...... ڈھانچے۔ کل تک وہ کبھی اپنے کمرے سے نہیں نکلا تھا اور آج...... ممکن ہے طویل عرصے بعد وہ دنیا کی دوسری طرف، کسی دور دراز جزیرے پر جانکلے۔ ہم دنیا میں موجود نہیں ہوں گے، مگر وہ اس گھر کو اور ہمارے خاندان کے افراد کو یاد کرے گا۔''

سارا کمرے کے کونے میں اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں سالہا سال تک پیانو موجود رہا تھا مگر اب وہاں اس کا عروسی پلنگ بچھتا تھا۔ ان کی پالتو کتیا، ڈولی کمرے میں داخل ہوئی اور اس جگہ کو سونگھ کر بھونکنے لگی۔ وہ پیانو کے ساتھ سویا کرتی تھی اور آج پیانو کی غیر موجودگی اسے بے چین کررہی تھی۔ سارا کو خوشی کے ساتھ ہلکا سا احساسِ جرم ہوا اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ ابھی کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ جوڈی نے دروازہ کھولا تو سامنے بندرگاہ کے کپتان کے نمائندے کو کھڑے پایا۔ اس نے جھک کر اپنے بریف کیس سے چند کاغذات نکالے۔

''تمہارا نام جوڈی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں۔''

''تم نے آج سمندر میں کیا پھینکا ہے؟''

جوڈی کا سر چکرا گیا۔ ''بندرگاہ والوں کا اس سے کیا تعلق ہے؟''

اس نے حیرت سے کہا۔ ''ہم تو کھلے سمندر کی طرف گئے تھے۔''

''مسٹر جوڈی اولیورا۔'' نمائندے نے سختی سے کہا۔ ''مجھے بندرگاہ اور کھلے سمندر کا فرق مت سمجھاؤ۔ یہ بتاؤ تم نے سمندر میں کیا پھینکا؟''

''کیا سمندر میں کوئی چیز پھینکنا کسی قانون کی خلاف ورزی ہے؟'' جوڈی نے مودبانہ لہجے میں دریافت کیا۔

ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔ ہنگامی حالات میں ہمیں اپنے ساحلوں اور بندرگاہوں پر زیادہ کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ دشمن ہر وقت تاک میں رہتا ہے۔''

''مگر وہ تو ایک معمولی سا پیانو تھا سر، ایک پرانا

خاندانی ساز۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ محض ایک پیانو تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ پیانو ہی تھا۔" جوڈی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ پھر وہ کمرے کے اندر جھانک کر باآواز بلند بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے روزیلا وہ محض ایک پیانو ہی تھا؟ کیوں سارا؟ وہ ایک معمولی سا پیانو ہی تھا نا؟؟"

روزیلا دروازے تک دوڑتی چلی آئی۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے جوڈی۔" اس نے اپنے خاوند کو کندھوں سے پکڑ کر یوں جھنجھوڑا جیسے اسے ہوش میں لانا چاہ رہی ہو۔ پھر اس نے سرکاری نمائندے سے دھیمے، مگر واضح لہجے میں کہا۔

"جی ہاں جناب، وہ محض پیانو ہی تھا۔"

"میں تو سمجھتا تھا کہ آدمی جو چاہے سمندر میں پھینک سکتا ہے۔" جوڈی یوں بولا جیسے نیند میں بڑبڑا رہا ہو۔

"اندر آ جاؤ جوڈی۔" روزیلا کو محسوس ہوا کہ اس کے خاوند پر ہذیانی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

"ٹھہرو۔" اس نے روزیلا سے بازو چھڑایا اور دوبارہ کپتان کے نمائندے کی جانب گھوم گیا۔ "فرض کرو میں خود کو سمندر میں پھینکنا چاہوں تو..... تو کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے؟"

"ممکن تو ہے۔" نمائندے نے کہا۔ "مگر یہ بھی اتنا آسان نہیں ہے۔"

"آسان کیسے نہیں ہے؟" جوڈی کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "میں اپنی زندگی کا مالک ہوں۔ چاہوں تو زندہ رہوں۔ چاہوں تو......"

سارا کے منگیتر کو اندر آتے دیکھ کر روزیلا نے جوڈی کو اندر کھینچ لیا۔

"ہمارا کمرا دیکھا!" سارا نے لیفٹیننٹ کو ایک ایک چیز دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں ہم اپنی زندگی کی ابتدا کریں گے۔"

"بہت اچھا ہے۔" لیفٹیننٹ نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر ہم نیا پیانو کہاں رکھیں گے؟"

"نیا پیانو؟"

"پیانو کے بغیر تو میں رہ ہی نہیں سکتا۔" لیفٹیننٹ چاروں جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں معلوم نہیں کہ پیانو کی آواز مجھے کتنی تسکین پہنچاتی ہے۔ جو شخص سارا دن بندوق اور توپوں کے درمیان رہے، اسے شام کے وقت ہلکی سی کیف آور موسیقی کی کس قدر ضرورت ہو گی...... تم جانتی ہو کہ گولیوں کی گونج اور......"

سارا کو اپنے منگیتر کی گفتگو کے درمیان کھانسی کا دورہ پڑا۔ جوڈی گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا۔ وہ تقدیر کی مزید ستم ظریفی نہیں سہ سکتا تھا۔

"اس وقت تک وہ کتنا فاصلہ طے کر چکا ہو گا...... کتنی گہرائیاں...... کیسے کیسے نشیب و فراز...... وہ نجات پا گیا ہے۔ کم از کم وہ مجھ سے اور سارا سے اور روزیلا سے زیادہ خوش و خرم اور آزاد ہے۔ اب وہ کسی کا پابند نہیں ہے۔ تمام محتاجیوں اور محرومیوں سے ماورا وہ چلتا چلا جا رہا ہے...... اندیشوں سے بے نیاز، وسوسوں سے لاتعلق، ہر طرح کے خدشے سے بالاتر وہ لامحدود کے سفر میں سرشار ہے...... احساسِ زندگی سے لبریز وہ سات سمندروں کو عبور کرے گا۔ سربلند و سرفراز، اپنی خواہش، اپنی مرضی، اپنی تقدیر کا......"

گھر کے سامنے درختوں کے جھنڈ میں نیگرو لڑکے آج کی محنت کا معاوضہ لینے کے لیے جمع تھے۔ رات کی تاریکی میں انہیں انفرادی طور پر شناخت کرنا، ممکن نہیں تھا۔ اب ان سب نے آج بھی دل لگا کر کام کیا تھا اور وہ اپنی مزدوری کے حق دار تھے۔ اچانک اس گروہ سے ایک سایہ الگ ہوا اور اعتماد سے آگے بڑھا۔ سائے نے گھر کا پھاٹک کھول کر اندر قدم رکھا تو جوڈی اسے پہچان گیا۔ وہ سرخ بالوں والا شخص تھا جو ان کے گھر پہلے بھی آ چکا تھا۔

"میں پیانو کے سلسلے میں واپس آیا ہوں۔" سرخ بالوں شخص نے اطمینان سے کہا۔ "تم نے اس کی جو قیمت لگائی تھی...... مجھے منظور ہے۔"

☆☆☆



اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

گلابوں کی جنگ

شاہانِ ٹیوڈر کے تاریخی عہد پر لکھے گئے خوں رنگ اور آگ
اس عہد کی کہانی جب انگلستان غیر ترقی یافتہ تھا اور
طاقت سے بھرپور عہد ٹیوڈر پر لکھی گئی تاریخی کہانی

قدیم انگلستان کے واقعات پر مبنی سلسلہ وار تاریخی کہانی

گلابوں کی جنگ

اشتیاق فاطمہ اعظمی



وہ ایک محبت کرنے والا مہذب اور شائستہ اور اعلیٰ عادات واطوار کا مالک اعلیٰ نسب انسان تھا۔ دیکھنے میں بھی وہ شاندار اور وجیہہ شخصیت کا مالک تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ پارلیمنٹ اور عوام کا ووٹ کورٹنی کے ساتھ تھا۔ اب فیصلہ میری کو کرنا تھا کہ اس کا انتخاب کون ہوگا؟ کورٹنی یا فلپ اور وہ اس وقت اسی ادھیڑبن اور کشمکش میں مبتلا تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وہ الزبتھ کو بلا کر یا خود اس کے پاس جا کر اس موضوع پر اُس سے ڈسکس کرے۔ الزبتھ اُس سے عمر میں بہت چھوٹی تھی مگر شعور ذہانت معاملہ فہمی اور تدبر میں اُس سے کہیں آگے تھی' ہیری جیسے ذہین ہم جماعت اور جون لیور جیسے کہنہ مشق اطالیق اور استاد کی تعلیم و تربیت سے الزبتھ کی شخصیت میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئی تھی اور رینارڈ کا کہنا تھا الزبتھ کا یہی پختہ پن اور تدبر ہی میری کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ میری کے بعد الزبتھ انگلستان کی ہونے والی متوقع حکمران تھی۔ عوام بدکتی تو وقت سے پہلے ہی میری کو ہٹا کر الزبتھ کو تخت پر بیٹھا سکتی تھی۔

اس خیال کے آتے ہی میری کے منہ کا ذائقہ خراب ہوگیا تھا اور وہ منہ بناتے ہوئے دریچے کے پاس سے ہٹ کر بستر پر آ بیٹھی تھی۔

ملکہ عالیہ! آپ کے لیے کوئی مشروب یا قہوہ پیش کیا جائے؟"

اس کی خادمہ خاص...... لیزا! اس کے قریب آ کر مہذب اور مودب لہجے میں بولی! میری نے چونک کر لیزا کی طرف دیکھا۔ وہ ایک نو جوان اور خوش شکل خادمہ تھی اس کی آنکھوں سے سنجیدگی اور تدبر جھلکتا تھا...... وہ انداز و اطوار سے قابل بھروسہ اور باعتبار دکھائی دیتی تھی۔

"نہیں!" میری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں ایک الجھن کا شکار ہوں...... اُسی گتھی کو سلجھانا چاہتی ہوں۔"

ملکہ عالیہ! اگر آپ اس خادمہ کو اس قابل سمجھیں تو اپنی اُلجھن مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں...... ہو سکتا ہے یہ ناچیز کوئی مناسب مشورہ دے سکے۔"

"اوہ......" میری نے چونک کر لیزا کی طرف دیکھا۔ درحقیقت اس وقت اسے کسی بھی خواہ ہمدرد اور مشیر کی ضرورت تھی جو غیر جانبداری سے اس کا مسئلہ سن کر اسے بہتر مشورہ دے سکتا۔ "لیزا...... کیا واقعی میں تم سے پریشانی شیئر کر سکتی ہوں؟ میری نے نرم اور تحیر خیز لہجے میں سوال کیا۔

"اگر آپ اس ناچیز کو اس قابل سمجھیں تو...... ضرور...... آپ کو یقیناً مایوسی نہیں ہوگی۔"

"اوہ لیزا" میری سیدھی ہو کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "اس وقت واقعی میں کوئی ایسا شخص چاہ رہی تھی جس سے یہ مسئلہ ڈسکس کر سکتی...... مسٹر ایم سیمور اپنی جاگیر پر چلے گئے ہیں ورنہ ایسے لمحوں میں وہ بہت ہی کارآمد ثابت ہوتے تھے۔"

"جی!" لیزا نے تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ میری سوچ رہی تھی کہ کہاں سے اور کس طرح لیزا کو اپنے مسئلے میں شامل کرے۔ کئی لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد اُس نے نگاہیں اُٹھا کر لیزا کی طرف دیکھا وہ منتظر نظروں سے اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "میرا خیال ہے...... جب تک آپ لفظوں کا انتخاب کر رہی ہیں میں آپ کے لیے لذیذ خوشبودار قہوہ لے ہی آؤں اسے پی کر یقیناً آپ زیادہ بہتر طور پر سوچنے کے قابل ہو جائیں گی۔"

"OK" ملکہ مسکرائی۔ لیزا کی ذہانت اسے پسند آئی تھی۔ اُس نے فوراً بھانپ لیا تھا کہ ملکہ اسے مسئلہ بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہے۔ لیزا تیزی سے مڑ گئی تھی۔ "سنو! اپنے لیے بھی لانا...... آج تم میری ساتھ قہوہ پیو گی...... اور ہم دیر تک اس موضوع کو ڈسکس کریں گے۔"

"شکریہ ملکہ عالیہ!" لیزا مشکور انداز میں مسکرائی تھی اور تعظیم پیش کرتی کمرے سے باہر چلی گئی تھی اور چند ہی لمحوں بعد وہ ایک ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ٹرے میں دو پیالے گرما گرم لذیذ خوشبودار اور بھاپ اڑاتے قہوے سے لبالب رکھے تھے۔

قہوہ پینے کے دوران خاموشی رہی تھی۔

قہوے کا پیالہ خالی کر کے واپس ٹرے میں رکھتے کے ساتھ ہی میری نے دھیمی آواز میں بات کا آغاز کیا تھا۔

"لیزا! اس وقت عوام اور خواص یعنی پارلیمنٹ کے سامنے سب سے اہم مسئلہ میری شادی کا ہے...... پارلیمنٹ جلد از جلد یہ معاملہ نمٹا دینا چاہتی ہے اور عوام خوش خبری سننے کے لیے بے چین ہے۔"

"جی!" لیزا پوری توجہ انہماک اور سنجیدگی سے میری ٹیوڈر کی بات سن رہی تھی۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں اب عمر کی اس منزل پہ پہنچ چکی ہوں جہاں شادی ہوئے بھی برسوں گزر چکے ہوتے ہیں...... مگر شاید میری زندگی میں شادی ہونے کا

وقت اب آیا ہے...... اور میں اب اس وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتی۔"

"جی!" ملکہ کے خاموش ہوتے ہی لیزا نے اسی سنجیدگی اور تدبر بھرے انداز میں ہنکارہ بھرا۔

اب تک میرے سامنے صرف ایک ہی پرپوزل تھا۔ مسٹر فلپ کا کل جب میں محض ایک شہزادی تھی تو شاید فلپ سے میری شادی اتنا اہم ایشو نہ ہوتا مگر اب جبکہ میں انگلستان کی حکمران بن چکی ہوں تو شاید عوام و خواص کے لیے ایک غیر ملکی حکمران کے بارے میں غور کرنا مشکل امر ہو۔"

اور دوسرا پرپوزل؟ میری کے رکتے ہی لیزا نے دھیمی آواز میں سوال کیا اور میری نے دل ہی دل میں ایک بار پھر اس کی ذہانت کی داد دی۔

"دوسرا پرپوزل کل مسٹر گارڈنر لائے تھے۔" میری نے گہرا سانس لیتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ "مسٹر ایڈورڈ کورٹنی کا پرپوزل ہے۔ وہ ایک بہترین انسان ہیں اور عوام و خواص سب ہی اُن کے حق میں ہیں۔"

"میں بھی انہیں جانتی ہوں۔" لیزا نے سنجیدگی سے کہا۔ "بے شک وہ ایک اچھے اور شاندار انسان ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ملکہ عالیہ کو ان دونوں میں سے کون سا پرپوزل پسند ہے۔ کیا مسٹر فلپ مسٹر کورٹنی کے مقابلے میں زیادہ اچھی پرسنیلٹی کے مالک ہیں؟

"مسئلہ تو یہی ہے۔" ملکہ الجھن بھرے لہجے میں بولی۔ "میں اب تک مسٹر فلپ سے ایک بار بھی نہیں ملی...... میں نہیں جانتی وہ کیسے ہیں۔"

"اوہ تو پھر تو اس طرح آپ کے لیے فیصلہ کرنا بے حد مشکل ہوگا۔"

لیزا نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔ "جہاں تک میں نے محسوس کیا بنا دیکھے ہی آپ کا جھکاؤ مسٹر فلپ کی طرف ہے؟

ہاں...... شاید؟ ملکہ نے سادگی سے اعتراف کیا۔ پہلے ایم سیمور اور رینارڈ نے اُن کی اتنی باتیں کیں...... اُن کے دل میں میرے لیے موجود احساسات و جذبات کو اس طرح بیان کیا کہ...... میں اُن کی طرف راغب ہوئے بنا نہ رہ سکی...... اب تو کبھی کبھی مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ شاید اُن سے مجھے عشق ہو گیا ہے۔"

"ایسا ممکن ہے۔" لیزا نے نہایت سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "پھر تو بہتر ہوگا کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ مسٹر رینارڈ سے کہیے کہ وہ آپ کی مسٹر فلپ سے ایک ملاقات کا موقع نکالیں......"

"مگر اس طرح......" ملکہ حیران ہوئی۔ "بھلا اس طرح ملاقات کیونکر ممکن ہوگی۔"

"ملکہ عالیہ یہ زندگی بھر کا سوال ہے۔" لیزا اُسی انداز میں گویا ہوئی اور آپ کوئی عام عورت نہیں انگلستان کی ملکہ ہیں...... اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ آپ جس شخص کے لیے اپنے دل میں محبت اور انسیت کے احساسات محسوس کر رہی ہیں اس کے حق میں فیصلہ دینے سے پہلے اُس کو ایک نظر دیکھنا اور اُس سے ایک بار ملنا بے حد ضروری ہے اگر وہ دیکھنے میں اس قابل ہی نہ ہوا کہ انگلستان کی ملکہ کا شریک حیات بن سکے تو اس وقت آپ کے پاس انکار کا آپشن ہے اور آپ کے پاس ایک اور اچھا رشتہ موجود ہے۔ آپ رینارڈ سے کہیے وہ خفیہ طور پر اس ملاقات کا انتظام کرے۔ اگر شاہ فلپ کے دل میں بھی آپ کے لیے ایسے ہی جذبات ہیں تو ایک بار تو کیا وہ دس بار آپ سے ملنے آئیں گے۔ اب آپ فیصلہ اُن سے ملنے تک موقوف کر دیجیے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو......" میری نے پرسوچ

نظروں سے لیزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں کل ہی رینارڈ سے اپنا موقف بیان کردوں گی۔ ہفتے کو پارلیمنٹ کے اجلاس میں مجھے اپنا فیصلہ دینا ہے۔ ہفتے سے پہلے پہلے یہ ملاقات ہو جانی چاہیے۔“

”جی بالکل!“ لیزا نے پرزور انداز میں سر ہلایا۔

”شکریہ لیزا!“ ملکہ نے تشکر بھرے انداز میں لیزا کے بازو کو چھوتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم نے میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کردیا ہے۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں...... تھینکس آ لوٹ......“

اگلے دن صبح ناشتے کے بعد ہی میری ٹیوڈر نے رینارڈ کو طلب کرلیا تھا۔ کل رات گارڈنر کا ملکہ کے ساتھ تخلیے میں ملنا پہلے ہی رینارڈ کو کھٹک رہا تھا۔ اس لیے جیسے ہی ملکہ کا پیغام ملا وہ فوری طور پر اس کی خدمت میں آ حاضر ہوا۔

”ملکہ عالیہ کی خدمت میں اس خادم کا صبح کا سلام۔“ پھر اُس نے ملکہ کے سامنے سرخ پھولوں کا ایک انتہائی خوبصورت اور تروتازہ گلدستہ رکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”اور پھولوں جیسی حسین ملکہ کی خدمت میں شاہ فلپ کی طرف سے تازہ پھولوں کا یہ تحفہ بھی قبول ہو......“

شاہ فلپ کے نام پر حسب عادت ملکہ کے زرد رخسار تمتما اٹھے تھے۔

”کل رات مسٹر گارڈنر غالباً کسی بے حد ضروری مسئلے پر آپ سے ڈسکس کے لیے تشریف لائے تھے۔“

”ہاں!“ ملکہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

کل وہ مجھ سے میری شادی کے مسئلے پر ڈسکس کرنے آئے تھے۔

آپ کی شادی؟ رینارڈ اچھل پڑا۔ ”کیا انہیں پتہ نہیں کہ آپ شاہ فلپ سے شادی کا فیصلہ کرچکی ہیں۔

”نہیں!“ ملکہ نے سنجیدہ اور باوقار لہجے میں کہا۔

”اور دوسرے یہ کہ ابھی میں نے یہ فیصلہ بھی نہیں کیا کہ شادی کس سے کرنی ہے؟

کیا مطلب؟ رینارڈ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔

”مطلب صاف ظاہر ہے۔“ ملکہ نے سرد لہجے میں کہا۔ کورٹنی جیسے شاہی خاندان کے رشتے کی موجودگی نے اس کے اعتماد میں بلا کا اضافہ کردیا تھا۔ ”عوام اور خواص کی خواہش ہے کہ...... میری شادی ملک میں ہی کسی اچھے انسان سے جو انگلستان کی ملکہ کا شایانِ شان ہو سے ہو جانی چاہیے۔

اور ایسا کون شخص ہوسکتا ہے؟ رینارڈ کی دھیمی آواز سے غیر محسوس سا طنز اور ہلکا سا حسد بھی جھلک رہا تھا وہ کئی ہفتوں سے ملکہ کو فلپ سے شادی کرنے کے لیے شیشے میں اُتار رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ تقریباً کامیاب ہوگیا ہے...... مگر اس بوڑھے گارڈنر نے لمحہ بھر میں بازی پلٹ دی تھی۔

”مسٹر ایڈورڈ کورٹنی۔“ ملکہ نے دھیمی آواز اور پرسکون لہجے میں کہا۔ ”مگر میں کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ایک بار شاہ فلپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“

آپ شاہ سے ملنا چاہتی ہیں؟ رینارڈ قدرے حیرانی سے بولا۔ ”مگر...... یہ کس طرح ممکن ہوگا۔“

”اسے کسی بھی طرح ممکن بنایا جائے۔“ میری نے شاہانہ انداز میں جواب دیا۔ ”اور میں چاہتی ہوں یہ ملاقات خفیہ رکھی جائے...... ہفتے کو مجھے پارلیمنٹ کے سامنے اپنا فیصلہ دینا ہے...... یا تو مجھے مسٹر کورٹنی کے لیے یس کہنا ہوگا...... یا پھر مسٹر فلپ کے لیے، پارلیمنٹ کو راضی کرنا ہوگا اور دوسری صورت کے لیے ضروری ہے کہ کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے قبل

میں مسٹر فلپ سے ملنا چاہوں گی...... اور شاید...... وہ بھی ایسا ہی چاہیں گے۔“

”نہیں اُن کے لیے تو آپ کا نام اور آپ کا تصور ہی کافی ہے۔“

رینارڈ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”لیکن اگر آپ کی یہ خواہش ہے تو اس کا بہرحال احترام کیا جائے گا...... آپ کی اجازت ہو تو میں آج ہی اسپین کے لیے جانا چاہوں گا تاکہ بادشاہ سلامت کے روبرو پہنچ کر میں انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کروں اور انہیں آپ سے ملنے کے لیے نا صرف آمادہ کروں بلکہ ملاقات کی صورت بھی پیدا کی جاسکے۔“

”میں نے آپ کو بتا دیا ہے مسٹر رینارڈ میرے پاس صرف ہفتے تک کا ہی وقت ہے...... اس دوران تمہیں خفیہ ملاقات کا اہتمام اور انتظام کرلینا ہے۔“

”بالکل ملکہ عالیہ!“ رینارڈ مری ہوئی آواز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے یہ ملاقات 3 روز بعد بدھ کی رات کو لندن سے باہر اسکاٹ لینڈ کے جانب کی پہاڑی سلسلے میں ایک مقام ہے۔“ ”مقام محبت“ اُس مقام پر رکھی جائے تو بے حد اچھا رہے گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ ملکہ کے لبوں پر مسکراہٹ لرزی اور ملاقات کے تصور سے ہی یکا یکی اس کا دل دھڑک اُٹھا تھا۔

مسٹر رینارڈ ایک چھوٹے حفاظتی دستے کے ساتھ اسپین کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ لیکن جوں ہی وہ اسپین پہنچا تو......!

یہ تھا گزشتہ قسط کا خلاصہ اب آگے پڑھیے

سیاہ و سرمئی بادلوں نے اسپین کے نیلے آسمانی کی نیلاہٹوں کو چھپا لیا تھا۔ ہوا کے نم اور خنک جھونکے بارش کے پیامبر محسوس ہو رہے تھے۔ غالباً سہ پہر میں بارش ہوچکی تھی۔ جب ہی سرخ لکھوری اینٹوں کی پختہ سڑکیں اور سڑکوں کے دونوں جانب ایستادہ اونچے چنار پیڑ دھلے دھلائے، نکھرے ستھرے نظر آرہے تھے۔ سڑکوں کے آس پاس موجود چھوٹے بڑے گڑھوں میں بھی پانی بھرا ہوا تھا۔ جن میں ننھی ننھی سرمئی چڑیائیں غوطے لگا رہی تھی، اور خوب چہک رہی تھیں۔ شام کے پھیلتے سرمئی سایوں پر بادلوں کی سیاہی غالب تھی تب ہی شام کے ڈھلتے ہی گھروں میں موم بتیاں اور چراغ جل اٹھے تھے۔ سڑک کے کنارے لکڑی کے چوکھٹوں پر دھرے چوکور کیروسین کے لیمپ بھی روشن کردیے گئے تھے۔ جن کے مدہم اجالے رات کی بڑھتی تاریکی کو کم کرنے میں قطعاً ناکام و بے بس دکھائی دے رہے تھے۔

رینالڈ نے اپنے لیدر کوٹ کے کالر کھڑے کر لیے تھے تاکہ گردن کو سرد ہوا کے تھپیڑوں سے محفوظ رکھا جاسکے۔ اس کے سر پر ایک اونی ٹوپ تھا جس کے سائیڈ خاصے لٹکے ہوئے تھے جن سے کان آسانی سے بند کیے جاسکتے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسے ہوئے تھے۔ وہ ایک سفید تنومند گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے ساتھ دو حفاظتی دستے کے سپاہی تھے۔ عام طور پر وہ یوں دو افراد کی نفری کے ساتھ سفر نہیں کرتا تھا۔ مگر اس وقت وہ نہایت راز داری سے لندن سے اسپین آیا تھا۔ وہاں ملکہ میری ٹیوڈر کے سوا شاید کسی کو بھی پتہ نہ تھا کہ رینارڈ اپنے وطن گیا ہے۔ وہ یہاں مختصر دورے پر آیا تھا تاکہ فلپ کو میری کی ملاقات والی شرط کے بارے میں نا صرف بتا سکے بلکہ اسے ملاقات کے لیے آمادہ بھی کرسکے۔

وہ اور اس کے دستے کے گھڑ سوار آہستہ روی سے چلتے مختلف جگہوں اور راستوں سے گزرتے آخر کار شاہی قصر کے سامنے آ ٹھہرے تھے۔ قصر کے اونچے

اور آستادہ پھاٹک کی بغلی کھڑکی سے دربان نے جھانک کر آنے والوں کا نام دریافت کیا تھا۔
”رینارڈ“ رینارڈ نے گھوڑے سے قدرے جھک کر اونچی آواز میں اپنا نام بتایا تھا۔
”شاہ فلپ سے ملاقات کرنی ہے۔“ اس کا جملہ سنے بنا ہی پھاٹک کھل گیا تھا گیٹ پر آویزاں لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ پہنچانتے ہی دربان متحرک ہوگیا تھا۔ رینارڈ فلپ کا بچپن کا دوست اور نہایت قابل اعتماد ساتھی تھا۔ ایک عمر تک وہ قصر میں فلپ کے ساتھ ہی رہا تھا۔ اس لیے قصر کے تمام خدام دربار اور دیگر' متعلقہ لوگ اس سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی حیثیت کو بھی پہچانتے تھے۔ محل کے اندرونی عمارت کے سامنے کئی سائیں لپکتے ہوئے آگے بڑھے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر رینارڈ کے گھوڑے کی لگام تھام لی تھی۔ رینارڈ کے ساتھ آنے والے سپاہی گیٹ پر ہی رک گئے تھے چنانچہ اس نے رکاب پر پاؤں جما کر زمین پر چھلانگ لگائی اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ محل کی اصل عمارت خاصی بلندی پر بنائی گئی تھی اس تک پہنچنے کے لیے گولائی میں خاصی وسیع سیڑھیاں تھیں۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر پہنچ گیا تھا۔ سامنے وسیع دالانوں اور راہ داریوں کا سلسلہ تھا۔ محل کی اونچی چھتوں سے جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے جن میں اس وقت شمعیں روشن تھیں۔ راہ داریوں میں استادہ اونچے سڈول ستونوں پر مشعلیں لگی تھیں۔ جو اس وقت دودھیا روشنی سے راہداریوں کو جگمگا رہی تھیں۔ رینارڈ جونہی راہ داری میں داخل ہوا ایک خادم نے آگے بڑھ کر اس کا اورکوٹ لے لیا تھا۔ دوسری جانب سے دو نوجوان اور خوش شکل خادمائیں لپکتی ہوئی آگے بڑھی تھیں انہوں نے جھک کر رینارڈ کو سلام پیش کیا تھا اور مؤدب انداز میں اس کے پیچھے چل دی تھیں۔

وہ مختلف راہداریوں سے گزرتا آخر شاہ فلپ کے خصوصی ایوان کے سامنے آٹھہرا تھا۔ رینارڈ اس محل کے ہر گوشے ہر کونے سے واقف تھا اس کا بچپن اسی قصر میں فلپ کے ساتھ کھیل کود کر گزرا تھا۔ وہ جب اس محل میں لایا گیا تھا اس وقت اس کی عمر صرف 9 سال تھی۔

وہ اسپین کے ایک دور افتادہ اور چھوٹے سے گاؤں' سیونز میں پیدا ہوا تھا، اس کا باپ ایک کسان تھا۔ وہ ایک محنتی دیانت دار اور محب الوطن انسان تھا۔ اس کا نام ملٹن تھا۔ اسے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک بار قریبی گھنے جنگل میں شکار کے دوران اس کی ملاقات' شاہ رچرڈ سے ہوئی تھی اس کے ساتھ فلپ بھی تھا۔ فلپ اس وقت 8 نو سال کا بچہ تھا۔ اسے سرسبز جنگل بے حد پسند تھا اور وہ اکثر اپنے باپ کے ساتھ جنگل میں آتا تھا۔ یہاں پر ہر طرف سبزہ' اونچے گھنے پیڑ اور نت نئے انواع و اقسام کے پرندے اور جانور دیکھ کر وہ حیرت بھری مسرت محسوس کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رچرڈ اپنے بیٹے فلپ سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور چند لمحوں کے لیے ہی اس سے دوری اور جدائی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس لیے میدان جنگ میں ہوتا یا شکار کے لیے کسی جنگل میں فلپ کو اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا۔

اس شام ملٹن نے شکار پر جانے کا پروگرام بنایا تو نو سالہ رینارڈ نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش کی تھی۔
”ڈیڈ! کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟“
”کیوں نہیں“ ملٹن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مگر ذرا سوچو اس گھنے جنگل میں تم میرے ساتھ چل کر کیا کرو گے؟“
گھر میں بھی اکیلے رہ کر میں کیا کرلوں گا؟“ رینارڈ نے افسردہ سے لہجے میں جواب دیا۔ چند ماہ قبل اس

کی ماں جیسی کا پھیپھڑوں کے مرض میں انتقال ہو چکا تھا۔ جیسی بچپن سے ہی اس مرض میں مبتلا تھی۔ آخر کار 27 سال کی عمر میں اس مرض نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کا شوہر ملٹن اور اکلوتا بیٹا رینارڈ بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ جیسی کی موت کے بعد ملٹن کی ذمے داریوں میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔ جیسی گو کہ برسوں سے بیمار تھی اس کے باوجود گھر اور بچے کی دیکھ بھال میں کوئی لاپرواہی یا کوتاہی نہ کرتی تھی۔ وہ ایک اچھی بیوی اور ایک بے حد اچھی ماں تھی۔ اس کی موت نے اس گھر کو ویران اور ملٹن و رینارڈ کو بے حد اداس اور دکھی کر دیا تھا۔

اب ملٹن کو کھیتوں کی دیکھ بھال ہل چلانے بیج بونے اور فصل کاٹنے کے ساتھ گھر کی بھی پوری دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی۔ صفائی ستھرائی سے لے کے کھانا پکانے تک اور پھر ننھے رینارڈ کا پوری طرح خیال رکھنا بھی اب اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔
”ملٹن میری مانو تو اب تم دوسری شادی کر ہی لو۔“ اس کی بے پناہ پریشانی بھری مصروفیات دیکھ کر اس کا پڑوسی اور دوست رینی اس سے کہتا۔
”کہتے تو تم ٹھیک ہو......“ ملٹن نے پرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”میرا خیال ہے اب میں تھکتا جا رہا ہوں۔ اس گھر کو اور رینارڈ کو ماں کی ضرورت ہے۔“
”ہرگز نہیں۔“ رینارڈ کمرے سے باہر آتا ہوا جارحانہ انداز میں بولا۔ ”ماں صرف ایک ہوتی ہے۔ میری ماں جیسی تھی اور اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ مجھے اب کسی اور ماں کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ ملٹن اس کے اس جارحانہ ایکشن سے حیرت زدہ اور قدرے افسردہ ہوگیا تھا۔ مگر رینی رساں بھرے انداز میں بولا تھا۔
”اوکے ...... اوکے...... تمہیں ماں کی ضرورت نہیں...... مگر اس گھر کو تو ایک عورت کی ضرورت ہے اور پھر تمہارے ڈیڈ کو بھی ایک بیوی چاہیے جو اس کا خیال رکھ سکے۔ اس کے ساتھ باتیں کر سکے اور جب وہ شکار پر جائے تو ساتھ جا سکے......“
”ٹھیک ہے اگر ڈیڈ کو دوسری بیوی کی ضرورت ہے تو وہ شوق سے دوسری شادی کریں۔ مگر اس سے پہلے وہ مجھے' نانا کے پاس' اسپینڈی بھیج دیں۔ میں وہاں رہ لونگا۔“

جیسی کا باپ لوگوٹا' قریبی گاؤں اسپینڈی میں رہتا تھا اور رینارڈ کبھی کبھار بوڑھے نانا سے ملنے جاتا تھا۔ وہ ایک نیک طبیعت محبت کرنے والا اور تعلیم یافتہ انسان تھا۔ رینارڈ کی سنجیدگی اور ذہانت میں اس کی تربیت کا بھی حصہ تھا۔
رینارڈ کے فیصلے نے ملٹن کو خاموش کر دیا تھا۔
”ملٹن کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ تم بھی بچے کی بات میں آگئے۔“
اس کا دوست رینی اب بھی اکثر اسے سمجھاتا بجھاتا رہتا تھا۔ ”رینارڈ بچہ ہے۔ جب ماں آجائے گی اور اس سے پیار محبت سے پیش آئے گی تو وہ خود ہی نارمل ہو جائے گا۔“
”نہیں رینی۔“ ملٹن نے افسردہ مگر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”میں ایسا کوئی بھی قدم نہیں اٹھانا چاہتا جس سے رینارڈ کو تکلیف ہو۔ قدرت نے اس سے چھوٹی سی عمر میں ماں چھین لی' میں دوسری شادی کر کے اس سے باپ کا رشتہ دور نہیں کرنا چاہتا۔“
”رینی' تم نے ملٹن سے بات کی؟ رینی کی کزن کیپالا شوہر کی وفات کے بعد آج کل رینی کے گھر میں ہی رہ رہی تھی۔ وہ اس کی بیوی کیلا کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ ایک خوش شکل ذہین اور اچھی عورت تھی' شوہر کی موت کے بعد وہ لڑکی بہن کے کہنے پر اس کے گھر چلی آئی تھی کیونکہ اس کے شوہر کے بعد وہ بالکل اکیلی

رہ گئی تھی۔

"کمپالا! تم اپنے گھر میں اکیلی رہ کر کیا کرو گی۔ ہمارے گھر کیوں نہیں چلی آتیں...... یہاں بچوں میں تمہارا دل بھی بہلا رہے گا۔ بہن کے بار بار اصرار پر وہ راضی نہ ہوئی تو ایک دن رینی نے اس سے کہا تھا۔

"یہ تمہاری بہن کا ہی نہیں تمہارے کزن کا بھی گھر ہے۔ شاید تم بھول رہی ہو میں تمہارے پیارے چچا کا بیٹا ہوں۔ اس حوالے سے مانو...... تو تمہارا بھائی بھی ہوں۔"

رینی کے اصرار پر کمپالا انکار نہ کر سکی تھی اور اس طرح پچھلے سات مہینوں سے وہ رینی اور کمیلا کے ساتھ رہ رہی تھی۔ یہاں آنے کے بعد پہلے ہی دن رات کے کھانے پر اس کی ملاقات ملٹن سے ہوئی تھی۔

ملٹن کی بیوی کے انتقال کے بعد رینی اکثر اسے اور رینارڈ کو رات کے کھانے پر انوائیٹ کر لیتا تھا۔

"ایک وقت تو ڈھنگ کا کھانا کھا لیں۔" وہ سوچتا۔ "بیوی کے بعد تو وہ لوگ طریقے کا کھانا کھانا بھی بھول چکے ہیں۔"

اس رات کو بھی وہ ملٹن اور رینارڈ کو بلا لایا تھا۔

"کمیلا" اس نے بیوی کو پیار سے پکارتے ہوئے کہا تھا۔ "کھانے کی ٹیبل پر ایک نہیں دو اور پلیٹیں لگا دینا۔ آج تمہاری بہن کی آمد کی خوشی میں، میں نے بھی اپنے دوست اور اس کے بیٹے کو مدعو کر لیا ہے۔"

"موسٹ ویلکم" کمیلا مسکراتی ہوئی کچن سے نکلی تھی۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو ملٹن اور رینارڈ کو بھی بلا لیا۔ میں ابھی تم سے کہنے ہی والی تھی۔ کیونکہ آج میں نے رینارڈ کی پسند کی سویٹ ڈش اور ملٹن کی پسندیدہ چاپیں بنائی ہیں۔"

کھانے کی ٹیبل پر کمپالا نے ملٹن کو دیکھا تھا۔ وہ لانبے قد کا ایک خوبصورت انسان تھا۔ تعلیم اور بہتر تربیت نے اسے بے حد مہذب اور شائستہ بنا دیا تھا۔ جانے اس میں کیا بات تھی کہ پہلی نگاہ پڑتے ہی وہ نگاہوں کی راہ سے کمپالا کے دل میں اتر گیا تھا۔

"کمیلا! تمہارا یہ پڑوسی، ملٹن کیسا انسان ہے؟ ملٹن کے جانے کے بعد رینی اپنی خواب گاہ میں چلا گیا تھا۔ دونوں بچے بھی سونے کے لیے اپنے میں چلے گئے تھے۔ مگر کمپالا اسی طرح ٹیبل پر بیٹھی کمیلا کو چیزیں اور برتن اٹھا کر کچن میں لے جاتے دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی تھی۔

"بہت اچھا سلجھا ہوا اور پڑھا لکھا انسان ہے۔" کمیلا نے سرسری سے انداز میں جواب دیا۔ "محنتی کسان اور ایک بہترین شکاری ہے ہفتے دو ہفتے میں قریبی جنگل میں جا کر، پرندے اور چھوٹے موٹے گوشت والے جانور لے آتا ہے...... اور ہم پورے ہفتے اسی گوشت سے کام و دہن کا سامان کرتے رہتے ہیں۔"

"اچھا" کمپالا نے اسی پرسوچ انداز میں سر ہلایا مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ اچانک ہی کمیلا کو یال آیا تھا۔

"بس ویسے ہی......" کمپالا نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"کمپالا" کمپالا اس کے قریب آ بیٹھی۔ "کہیں تم اس کے بارے میں کچھ اور تو نہیں سوچ رہی ہو۔"

"ہاں" کمپالا نے بنا کسی پس وپیش کے جواب دیا۔

"اب دیکھو نا" میں آخر تمہارے گھر میں کب تک رہ سکتی ہوں۔ مجھے بہرحال اپنا گھر بسانا تو ہوگا۔ تو کیوں نا تمہارے پڑوس میں بھی، میں آ بسوں۔ دونوں بہنیں ساتھ ساتھ رہیں گی۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" کمیلا نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا دیکھو، میں آج ہی رینی سے بات کرتی ہوں۔"

بیوی کے کہنے پر رینی کے اگلے دن ہی ملٹن سے

عندیہ لیا تھا۔

"ملٹن! اس طرح اکیلے کب تک رہو گے۔ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"شادی کی تو تھی" ملٹن نے اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "اب قدرت نے اسے واپس بلا لیا تو میں کیا کروں؟"

تو تم اب دوسری شادی کر لو؟ رینی کے کہنے پر ملٹن نے سختی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ "ناممکن ...... اب میری زندگی صرف اور صرف میرے بیٹے ...... رینارڈ کے لیے ہے...... میں دوسری شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

اور رینی نے گھر آ کر بیوی سے سارا حال کہہ سنایا تھا۔ "ابھی نئی نئی بات ہے نا...... اس لیے وہ اس طرح کہہ رہا ہے۔" کمیلا نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "ذرا چند مہینے اور گزر جانے دو پھر خود سے ہی بیوی تلاش کرتا پھرے گا اور اس طرح 4 مہینے بیت گئے تھے ان چار مہینوں میں کمپالا نے بڑی باریک بینی سے ملٹن کے کردار و اخلاق کا مطالعہ کیا تھا اور ہر گزرتا ہوا لمحہ اسے ملٹن کے قریب کرتا چلا گیا تھا۔

"کمیلا اب تو میں ملٹن کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی" وہ بہن سے ہر بات کہہ کر دل کا بوجھ کم کر لیتی تھی۔

"تم فکر مت کرو آج نہیں تو کل ملٹن ضرور شادی پر آمادہ ہو جائے گا۔ دیکھو آج میں خود اس سے بات کرتی ہوں؟"

اور اس شام انڈوں کی پڈنگ کا پیالہ تھامے وہ خود ملٹن کے گھر جا پہنچی تھی۔

"ارے کمیلا تم؟" ملٹن اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا۔

"میں چائے بنانے ہی جا رہا تھا اچھا ہوا تم آ گئیں اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"تمہاری چائے ساتھ کھانے کے لیے انڈوں کی لذیذ پڈنگ ہے۔"

کمیلا مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس نے پڈنگ کا پیالہ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

"اوہ بہت شکریہ۔" ملٹن مشکور انداز میں مسکرایا۔

"جیسی کے انتقال کے بعد سے اب تک تو ہم ان تمام چیزوں کا ذائقہ بھی بھول چکے ہوتے۔ مگر تمہاری مہربانیوں کی وجہ سے نا صرف ہمیں ذائقہ یاد ہے بلکہ وقتاً فوقتاً تم ان چیزوں سے ہمیں روشناس بھی کرواتی رہتی ہو۔ اس کرم نوازی کے لیے تمہارا شکریہ۔"

"کیسی بات کرتے ہو ملٹن۔" کمیلا نرم لہجے اور شیریں آواز میں بولی۔ "تم کوئی غیر تو نہیں ہو جو تمہیں ان معمولی باتوں کے لیے شکریہ ادا کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ تم رینی کے دوست ہی نہیں ہمارے پڑوسی بھی ہو اور سب سے بڑی بات تم جانتے ہو، ہم صرف دو بہنیں ہی ہیں ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ اس ناطے تم مجھے اپنے بھائی لگتے ہو۔ بس آج کے بعد تم کسی بھی بات کا شکریہ ادا نہیں کرو گے۔"

"OK......" ملٹن تشکر بھرے انداز میں مسکرایا۔

"میں تمہیں اپنا بھائی سمجھتے ہوئے، تم سے ایک اور بات بھی کہنا چاہتی تھی۔"

ذرا توقف کے بعد کمیلا قدرے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ "اگر تم مانو تو......"

"کمیلا ایسی بھی کیا بات ہے جو تم اتنی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہی ہو۔" ملٹن حوصلہ دلانے والے لہجے میں بولا۔ "پلیز جو بھی کہنا ہے کہہ دو۔"

"ملٹن! تمہیں یوں تنہا زندگی گزارتے دیکھ کر مجھے اور رینی کو بہت دکھ ہوتا ہے۔"

کمیلا نے تمہید کا آغاز کیا۔ "جیسی اب دنیا میں نہیں

ہے۔ تو تمہیں اور تمہارے بیٹے کو کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ تمہیں اب شادی کر لینی چاہیے۔

”دیکھو کیلا......“

”میں کچھ نہیں سنوں گی۔“ کمیلا نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے ضدی لہجے میں کہا۔ ”تم جانتے ہو ایک اچھی اور مخلص لڑکی تمہیں بے حد پسند کرتی ہے اور شاید تمہاری محبت میں بھی گرفتار ہو چکی ہے۔“

کیا؟ ملٹن نے چونک کر کمیلا کی طرف دیکھا۔

”ہاں“ کمیلا پر یقین انداز میں مسکرائی۔ ”اس کے لیے کئی رشتے موجود ہیں۔ مگر اسکا کہنا ہے کہ وہ شادی کرے گی تو صرف تم سے ورنہ ایسے ہی بیٹھی رہے گی۔“

ملٹن نوجوانی میں ایک شاندار نوجوان تھا اور ایک نہیں کئی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں۔ خود جیسی نے بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کی تھی مگر جیسی سے شادی اور رینارڈ کی پیدائش کے بعد تو گویا وہ خود کو ہی بھول گیا تھا پھر جیسی کی مسلسل بیماری نے اسے سانس لینے کی بھی فرصت نہ دی تھی وقت گزرتا گیا اور اب جیسی اس دنیا میں نہیں تھی اور اب وہ خود بھی کوئی بانکا‘ سجیلا جوان نہیں رہا تھا اب وہ 37 سال کا ایک ذمے دار اور سنجیدہ مرد تھا اور سات سال کے ایک بچے کا باپ تھا۔ مگر آج اتنے برسوں بعد یہ بات سن کر اسے حیرت بھری مسرت ہوئی تھی۔ کسی بھی مرد کے لیے یہ بات مسرت اور خوشی ہوتی ہے کہ کوئی عورت اسے پسند کرتی ہے یا اس کے عشق میں گرفتار ہو چکی ہے۔ ایک مرد ہونے کے ناطے‘ ملٹن کو بھی ایک انجانی سی خوشی ہوئی تھی مگر اگلے ہی لمحے رینارڈ کے خیال نے آ کر اس کی اس خوشی کو مایوسی اور افسردگی میں بدل دیا تھا۔ وہ خود بھی تنہا زندگی سے عاجز آ چکا تھا۔ گھر کی ابتر حالت بھی کسی سگھڑ عورت کی متقاضی تھی مگر رینارڈ کی ضد اپنی جگہ تھی وہ اپنی ماں کی جگہ کسی اور کو دینے کو تیار نہ تھا اور ملٹن اس کے دل پر پاؤں رکھ کر اپنی دنیا بسانے کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے اس پل‘ وہ لمحاتی خوشی حقیقی حالات کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ گئی تھی۔

”تم اس کا نام نہیں پوچھو گے؟“ کمیلا اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو بغور دیکھتے ہوئے پر تجسس لہجے میں بولی تھی۔

”کیا کرونگا نام پوچھ کے۔“ ملٹن نے ایک افسردہ سی سانس لیتے ہوئے‘ مایوس لہجے میں جواب دیا۔ ”شاید تم نہیں جانتیں‘ رینارڈ میری شادی کے سخت خلاف ہے اور میں اس کا دل توڑ کر اپنا گھر نہیں بس سکتا۔“

”جانتی ہوں“ کمیلا رسان بھرے لہجے میں بولی۔ ”اور یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ محض 7 سال کا معصوم اور نا سمجھ بچہ ہے اسے کسی بھی طرح پیار محبت سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو صرف اپنی بات کرو۔“

”میں اپنی کیا بات کروں؟ ملٹن ہنوز مایوسی اور اداسی کے گرداب میں گھرا ہوا تھا۔“

”تم میری اور میرے گھر کی حالت تو دیکھ ہی رہی ہو...... مگر اس کے باوجود...... میں رینارڈ کی مرضی کے خلاف کسی دوسری عورت کے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ کمیلا کرسی سے اٹھتے ہوئے‘ گہرا سانس لے کے بولی۔ ”میں کمپالا کو جا کر بتا دونگی...... کہ تم اس کی محبت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔“

”کمپالا......؟“ ملٹن یوں اچھلا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

”ہاں کمپالا۔“ کمیلا اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھتے ہوئے

بولی۔ ”اس نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد کبھی بھی دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر تمہیں دیکھتے ہی اس کا یہ فیصلہ ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ تم پہلی ہی نظر میں نگاہوں کی راہ سے اس کے دل میں سما گئے تھے اور اب وہ تمہارے بغیر زندگی گزارنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔“

ملٹن کو ایک مدت بعد اپنے رگ و پے میں ایک نیا سا احساس جاگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دل میں عجب سرور آمیز لہریں سی اُٹھ رہی تھیں۔ کمپالا ایک حسین سگھڑ اور با کردار لڑکی تھی۔ کوئی بھی شخص بخوشی اس سے شادی کے لیے آمادہ ہو سکتا تھا۔ مگر وہ ملٹن کے عشق میں گرفتار تھی اور اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی یہ خبر اس کے لیے حیرت انگیز ہی نہیں مسرت خیز بھی تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے رینارڈ کا خیال آتے ہی اس کے سارے احساسات صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

”مجھے معاف کر دینا کمیلا۔“ وہ دکھی اور ملول آواز میں بولا۔ ”کمپالا‘ یقیناً ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ مگر اس کا انتخاب صحیح نہیں ہے۔ میرے ساتھ میری مجبوری نہ ہوتی تو شاید اس کی محبت پا کر میں خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھتا...... مگر کیا کروں...... میرے پاؤں میں میرے ذمے داریوں کی بیڑیاں ہیں۔ تم کمیلا سے بھی کہہ دینا مجھے بھول کر اپنے لیے کوئی اور راستہ منتخب کرے۔“

”یہ ناممکن ہے ملٹن۔“ دروازے کے باہر سے کمپالا کی احتجاج بھری آواز ابھری۔ کمیلا اس سے کہہ کر آئی تھی کہ وہ ملٹن سے اس کی بات کرنے جا رہی ہے۔ مگر جب کافی دیر گزر گئی اور وہ واپس نہ آئی تو کمپالا سے برداشت نہ ہوا اور وہ خود بھی ملٹن کے گھر کی طرف چل دی۔ ابھی وہ دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے کمیلا اور ملٹن کی آتی ہوئی آوازوں نے اس کے قدم وہیں روک دیے تھے اور وہ وہیں رک کر ان دونوں کی باتیں سننے لگی تھی اور اب ملٹن کا فیصلہ سن کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور آہستگی سے اندر داخل ہو گئی۔

ملٹن نے گھبرائے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس نے ایک گہرے عنابی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ جس پر نارنجی رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس کے سنہری بالوں میں ایک نارنجی رنگ کا رومال بندھا تھا اور اس کے گلابی رخسار غصے سے تمتما رہے تھے۔

”میں نے زندگی کے سفر کے لیے صرف اور صرف تمہیں چنا ہے۔ تمہیں یہ حق تو ہے کہ مجھے ہم سفر بنانے سے انکار کر دو۔ مگر تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ مجھے کسی اور جانب جانے کا مشورہ دے کر میرے ٹوٹے ہوئے دل کو مزید تکلیف دو۔“

کمیلا فوری طور پر کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ بھی دل سے چاہتی تھی کہ کمپالا کا دوبارہ سے گھر بس جائے اور جہاں تک ملٹن کا تعلق تھا وہ جانتی تھی کہ کمپالا کے لیے ملٹن سے اچھا شوہر مل بھی نہیں سکتا تھا۔

اب کمرے میں ملٹن اور کمپالا ہی موجود تھے۔ رینارڈ آج صبح ہی اپنے نانا سے ملنے اس کے گاؤں گیا تھا۔ جاتے وقت کمیلا دروازہ بھڑکا گئی تھی‘ کمرے میں بلر کے ساتھ لٹکتی قندیل کا مدہم سا اجالا بکھرا ہوا تھا اور فضا بے حد خوابناک سی ہو رہی تھی۔

کمپالا چلتی ہوئی‘ عین ملٹن کے سامنے آ ٹھہری تھی۔

”تم مجھے بے شک قبول نہ کرو۔“ وہ دکھ بھری جذباتی آواز میں بولی۔ ”مگر میں مرتے دم تک تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”مگ...... مگر...... کمپالا۔“ کمپالا کو اپنے سامنے پا

کر ملٹن کے ہوش اڑ گئے تھے اور اس کی باتیں سن کر اسے عجب سا سکون اور فخر کا احساس ہو رہا تھا۔ دل عجب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

"تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" کمپالا ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہاری تمام تعویلیں سن چکی ہوں۔ مجھے اب کچھ نہیں سننا۔ تمہیں فیصلہ کرنے کا حق ہے مگر تم مجھ سے محبت کرنے کا حق نہیں چھین سکتے میں تم سے محبت کرتی ہوں اور مرتے دم تک کرتی رہوں گی۔"

"کمپالا سمجھنے کی کوشش کرو۔" کمپالا کی گرم مہکتی سانسیں ملٹن کو اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے اپنے رگ و پے میں ایک عجب سی سنسناہٹ جاگتی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ایسا نہیں ہے کہ تم اچھی نہیں ہو...... یا...... مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ......"

"ملٹن" کمپالا نے اپنے نرم و نازک ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"پہلے تو مجھے کچھ خبر ہی نہ تھی۔" ملٹن ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ "مگر جب کیلا نے بتایا کہ...... تم...... تب سے بالکل اچانک مجھے بھی ایسے ہی لگا کہ جیسے...... میں بھی...... مگر میں کیا کروں۔"

"تم کچھ مت کرو۔" کمپالا کی آنکھوں میں مسرت بھرا سرور جاگ اٹھا تھا۔ اسے ملٹن کا جواب سن کر خوشی ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے اپنے دہکتے لب ملٹن نے خشک لبوں پر رکھ دیے۔ ملٹن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اسے کیلا سے اس حرکت کی توقع نہ تھی، مگر یہ حیرت لمحاتی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ بھی اس سرور کی لہر میں بہہ گیا تھا جسے کمپالا محسوس کر رہی تھی۔ دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے اور جذبات کی نئی سی لہریں پورے وجود کو گھیرے ہوئے تھیں......

تب ہی کوئی آہٹ ہوئی تھی۔

شاید دروازے کے باہر کوئی آیا تھا...... یا کوئی چیز کہیں گری تھی۔ کوئی پتہ کھڑکا تھا یا کوئی غنچہ چٹخا تھا۔ کچھ بھی تھا وہ دونوں چونک کر اس سرور و مستی کی دنیا سے باہر نکل آئے تھے۔ دونوں نے نظریں چرا کر شرمیلی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا اور دونوں کے لبوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"تم بیٹھو میں تمہارے لیے قہوہ بناتا ہوں۔" ملٹن دھیمی آواز میں بولا اور تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گیا۔

کمپالا نے نگاہ گھما کر کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ آج پہلی بار ملٹن کے گھر آئی تھی۔ یہ ایک کشادہ اور پختہ گھر تھا۔ مگر عورت نہ ہونے کے باعث گھر کی حالت سخت ابتری کا شکار تھی۔ کمپالا نے سامنے دالان کے کونے میں کھڑے جھاڑن کی طرف دیکھا اور لپک کر اسے اٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد جب ملٹن دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو کمرے کی حالت ہی تبدیل ہو چکی تھی۔

دیواروں کے کونوں اور چھت پر تنے مکڑی کے جالے صاف ہو چکے تھے فرش سے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر اسے گیلے کپڑے سے رگڑ کر چمکا دیا گیا تھا۔ ادھر ادھر بکھری چیزیں قرینے سے رکھ دی گئی تھیں اور اس وقت وہ کمرہ ایک صاف ستھری بیٹھک کا منظر پیش کر رہا تھا۔

"شکریہ کمیالا۔" ملٹن نے قہوے کے پیالے درمیان میں دھری تپائی پر رکھتے ہوئے حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے کہ تم جادوگرنی ہو...... یوں لمحوں میں میرے دل

کو ہی نہیں میرے گھر کو بھی تم نے بدل کر رکھ دیا ہے۔"

"یہ کوئی جادو نہیں ہے ملٹن۔" کمیالا مسکرائی۔ "یہ صرف محبت ہے...... محبت جو چاہے کر سکتی ہے۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج رات کا کھانا۔ میں تیار کروں گی۔ تاکہ تم دیکھ سکو کہ میں کتنا اچھا کھانا بناتی ہوں۔"

"کھانا تو میں بھی بنا لیتا ہوں۔" ملٹن جلدی سے بولا۔ "اگر تم کھا سکو تو یہ کام کر کے مجھے بے حد خوشی ہوگی۔"

"نہیں" کمپالا قہوے کا پیالا اٹھاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "آج رات کا کھانا میں ہی بناؤں گی۔ مگر...... وہاں...... کیلا اور...... رینی...... کیا سوچیں گے؟"

ملٹن کے دل میں اٹھتا ہوا خیال آخر لبوں پر آ ہی گیا تھا۔

رینی آج رات گھر پر نہیں ہے۔ وہ بیج اور کھاد خریدنے قریبی قصبے گیا ہے وہاں اس کے ایک انکل رہتے ہیں آج رات وہ وہیں ٹھہرے گا۔ کیلا کو تو پتہ ہے کہ میں یہاں ہوں۔ اس لیے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تم پلیز کھیتوں پر جا کر مجھے کچھ تازہ سبزیاں لا دو۔ تب تک میں کچن کی حالت درست کرتی ہوں۔"

"OK" ملٹن نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور قہوے کے خالی پیالوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کمپالا بولی۔ "انہیں تم رہنے دو...... بس جلدی سے سبزیاں لے آؤ...... انہیں میں اٹھا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" ملٹن اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا تھا۔

کمپالا خالی پیالے اٹھائے کچن میں آ گئی تھی۔ کچن کی حالت بھی بے حد ابتر تھی۔ اس کی حالت درست کرنے میں اسے کافی وقت لگ گیا تھا۔ تب ہی ملٹن کو بھی مٹر اور گاجریں لے کر آ گیا تھا۔ دونوں نے مل کر سبزی کاٹی تھیں اور کمپالا نے بے حد لذیذ کھانا تیار کیا تھا۔ پھر دونوں نے کھانا میز پر لگایا تھا اور بے حد رومینٹک ماحول میں موم بتی کی مدہم خوابناک سی روشنی میں کھانا کھایا تھا۔

"تم نے بیٹھک اور کچن کی حالت تو سدھار دی ہے۔ کیا میرے بیڈروم پر توجہ نہیں دو گی۔" کھانے کے بعد کمپالا کو جانے کے لیے پر تولتے دیکھ کر ملٹن نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ کمپالا کی اپنے گھر میں موجودگی اسے بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ عجب سی اپنائیت اور خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ برسوں سے سنسان پڑے دل کے ایوانوں میں عجب سی چہل پہل اور ہلچل سی جاگ اٹھی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ کمپالا کچھ دیر اور رک جائے اسی لیے اس نے اس کی توجہ بیڈروم کی طرف مبذول کروائی تھی۔

OK۔ کمپالا دلنشین انداز میں مسکرائی۔ "مگر ایک شرط ہے کہ تم میرے ساتھ بیڈروم میں نہیں چلو گے۔"

"ٹھیک ہے" ملٹن اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ "میں تمہارے لیے کچن میں جا کر قہوہ تیار کرتا ہوں۔ جب تیار ہو جائے گا میں تمہیں آواز دوں گا تم باہر آ کر قہوہ پی لینا۔"

"ٹھیک ہے۔" کمپالا اٹھتے ہوئے بولی۔

سامنے ہی بیڈروم تھا۔ اس کے بالکل ساتھ ایک چھوٹا بیڈروم تھا۔ یہ رینارڈ کا بیڈروم تھا۔ جو اس وقت خالی پڑا تھا۔ کمپالا ملٹن کے بیڈروم میں جانے کی بجائے پہلے رینارڈ کے بیڈروم میں چلی گئی تھی۔ کمرے کے بیچ میں ایک سنگل بیڈ رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ایک گول آئینہ لگا تھا اور دائیں جانب لکڑی کی ایک چھوٹی الماری تھی۔ جو غالباً کپڑے

...ے کے کام آئی تھی۔ بیڈ کے بائیں جانب ایک کرسی اور لکڑی کی سپاٹ سی میز رکھی تھی جس پر کچھ کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ غالباً یہ رینارڈ کے پڑھنے کی ٹیبل تھی بیڈ پر کمبل چادر اور تکیے آڑے ترچھے پڑے تھے دروازے کے بالکل سامنے ایک پاجامہ الٹا پڑا تھا اور ادھر ادھر جوتے اور چپل بکھرے ہوئے تھے کمرے کی دیواروں کے کونوں اور چھت پر جالے تنے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ایک مدت سے کمرے کی صفائی ستھرائی کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی۔

کمپالا نے سب سے پہلے رینارڈ کے اترے ہوئے میلے کپڑے سمیٹے تھے پھر جھاڑن سے دیواروں اور چھت کے جالے اتارے تھے۔ فرش رگڑ کر صاف کرنے کے بعد اس نے رینارڈ کے کپڑوں کی الماری کی صفائی کی تھی اور دھلے ہوئے کپڑے تہہ کر کے ترتیب سے رکھے تھے اور تمام میلے کپڑے باہر دالان میں ڈال دیے تھے تاکہ وہاں سے اٹھا کر میل دان میں ڈالے جاسکیں۔ بستر کو درست کر کے اس نے ایک صاف ستھری چادر بچھا دی تھی۔ تکیے پر بھی ستھرا غلاف چڑھا دیا تھا۔ پھر اس نے رینارڈ کے جوتے اور چپلیں ترتیب سے رکھ دی تھیں۔ کتابوں کی میز صاف کر کے اس نے اس پر ایک سفید براق میز پوش بچھا کر کتابیں ترتیب سے رکھ دی تھیں۔ کونے میں دھری تپائی پر شیشے کا ایک گلدان دھرا تھا۔ اس میں جانے کب کے چند سوکھے ہوئے پھول اٹکے ہوئے تھے۔ کمپالا نے ان پھولوں کو نکال کر ہاتھ بڑھا [illegible] ڑکی کے تلے کھلے گلاب کے پھولوں مر [illegible] لیاں اور پھول توڑ کر گلدان میں سجا د[illegible]ے۔ ذرا سی دیر کی محنت سے کمرہ ایک دم سے جگ[illegible] اٹھا۔ کمپالا کو رینارڈ کا کمرہ سجا کر ایک عجب سی [illegible] خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے پہلے شوہر [illegible] کے ساتھ پانچ سال رہی تھی۔ نک ایک عمر رسیدہ اور بیمار شخص تھا۔ اس کے ساتھ کمپالا کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اسے اولاد کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی مگر آج رینارڈ کا کمرہ سجا کر اسے عجب الوہی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی اور دل میں اس کے لیے عجب محبت بھرے احساسات سر اٹھا رہے تھے۔

"جناب قہوہ تیار ہے۔" باہر کمرے سے ملٹن کی آواز آئی تھی اور کمپالا ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر آگئی تھی۔ اس کے چہرے سے ہلکی تھکن کا احساس اجاگر ہو رہا تھا۔

"تم بہت تھک گئی ہو؟" ملٹن نے پر تشویش لہجے میں کہا تھا۔

"نہیں ایسی کوئی خاص تو نہیں۔" کمپالا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کی بجائے میں نے پہلے رینارڈ کا بیڈ روم صاف کر دیا۔"

"اوہ واقعی۔" ملٹن کو یہ بات اچھی لگی تھی اور وہ اضطراری طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کر رینارڈ کے بیڈ روم میں جھانکنے چلا گیا تھا۔ صاف ستھرا سلیقے سے سجا سنورا کمرہ بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ کونے میں دھری تپائی پر کانچ کے گلدان میں سرخ گلاب مسکرا رہے تھے اور ان کی بھینی خوشبو سے کمرے کی فضا معطر ہو رہی تھی۔

"اوہ کمپالا۔" ملٹن نے خوشی سے پلٹ کر کمپالا کی طرف دیکھا جو اس کے بالکل پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔ "تم واقعی جادوگرنی ہو......" اس نے اسے شانوں سے تھام کر پر مسرت لہجے میں کہا' کمپالا ایک قدم بڑھ کر اور آگے چلی آئی' اور اگلے ہی لمحے اس نے اپنا سر ملٹن کے کشادہ سینے پر رکھ دیا تھا۔

"اگر اس جادو کی داد دینا چاہتے ہو تو اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے پن کا احساس دلا دو" اس نے اس کے سینے پر سر دھرے سرگوشی کی اور ملٹن نے بے اختیارانہ اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں لے کر سینے سے بھینچ لیا۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"آنٹی کمپالا۔" باہر سے کیلا کی 9 سالہ بیٹی کی آواز سنائی دی تھی۔ "آپ کہاں ہیں۔" "ممی آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"اوہ" کمپالا ملٹن کے بازوؤں کے حلقے سے باہر نکل آئی۔ پھر وہ دونوں رینارڈ کے بیڈ روم کے دروازے سے پلٹ کر بیٹھک میں آگئے تھے۔

"آپ کا بیڈ روم اب کل صاف ہوگا۔"

کمپالا نے مسکرا کر ملٹن کی طرف دیکھا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ملٹن کا دل چاہ رہا تھا کہ کمپالا ابھی نہ جائے۔ بلکہ اس کا دل تو چاہ رہا تھا وہ کبھی نہ جائے مگر وہ جا چکی تھی۔

گھر میں ہر سمت اس کی سحر انگیز شخصیت کی خوشبو رچی ہوئی تھی' اس کی مترنم آواز بسی ہوئی تھی۔ اس کی کھنکتی ہنسی اور ہنر مند ہاتھوں کا ہنر' ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔ وہ یقیناً ایک سلیقہ مند اور سگھڑ عورت تھی اور ملٹن کو یقین تھا کہ اسے اس سے بہتر عورت مل ہی نہیں سکتی تھی اسی لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ جب رینارڈ آئے گا تو وہ اس سے کمپالا کے بارے میں بات کرے گا۔

اگلے دن صبح ہی رینارڈ واپس آگیا تھا اور اس نے اپنے کمرے کی حالت بدلی ہوئی دیکھی تو وہ حیران رہ گیا۔

"ڈیڈ! آج برسوں بعد میرا کمرہ اتنا صاف ستھرا اور خوبصورت لگ رہا ہے جیسے ممی سجاتی تھیں۔ کیا ان کی روح آئی تھی؟"

"نہیں" ملٹن سنجیدگی سے بولا۔ "خداوند کریم نے تمہارے لیے بالکل تمہاری ماں جیسی ایک اور ہستی بھیجی ہے...... جسے تم جانتے ہو...... مگر اب تک اسے پہچان نہیں سکے۔"

تو کیا یہاں' کمپالا آنٹی آئی تھیں؟

لحظہ بھر کو تو ملٹن کو اپنے نو عمر بیٹے کی ذہانت پر حیرت ہوئی۔ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ یہاں آئی ہوگی؟ اس نے حیران لہجے میں سوال کیا۔

"کیونکہ میں کافی عرصے سے ان کی آنکھوں میں آپ کی محبت دیکھ رہا ہوں۔" رینارڈ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ اور اس کا جواب سن کر ملٹن اچھل پڑا' اس سے تو کہیں زیادہ ذہین اور باشعور یہ سات سال کا بچہ تھا جو کافی عرصے سے کمپالا کی آنکھوں میں محبت دیکھ رہا تھا جبکہ وہ آج سے پہلے صحیح معنوں میں کمپالا کو ہی نہیں دیکھ سکا تھا۔

"مگر براہ کرم آپ ان سے کہہ دیجیے ان کی ہمارے گھر میں اور ہمارے دلوں میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے...... وہ آئندہ ایسی کوئی خدمت سرانجام دینے کی زحمت نہ کریں۔"

"اوہ رینارڈ......" دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی کمپالا کی آنکھیں گرم پانی سے لبریز ہو گئی تھیں۔ ابھی ابھی جب اسے پتہ چلا تھا کہ رینارڈ لوٹ آیا ہے تو وہ اس سے ملنے کے لیے آئی تھی مگر دروازے پر پہنچتے ہی اس کے کانوں میں دل توڑنے والی آواز پہنچ گئی تھی اور اس کی پلکیں نم ہو گئی تھیں۔ "آئندہ تم کبھی بھی مجھے اپنے گھر میں نہیں دیکھو گے۔" مگر پلیز اپنے اور اپنے ڈیڈ کے دل میں مجھے ذرا سی جگہ دے دو کیونکہ تمہارے ڈیڈ کے بغیر میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی تھی۔

ت کو کئی دن بیت گئے تھے نہ کیلا نے بلایا نہ خود ملٹن اس طرف گیا۔ کیلا کی بیٹی نے بتایا تھا کہ کمپالا

بیمار ہے۔ یہ خبر سن کر ملٹن کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا تھا۔ اس وقت رینارڈ گہری نظروں سے باپ کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اسی لیے اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

کمپالا یکا یک ایک بہار کے جھونکے کی طرح اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی لمحہ بھر کو اس کی ویران اور اجڑی ہوئی زندگی کو مہکایا تھا اور پھر واپس پلٹ گئی تھی۔ وہ خود سے کب گئی تھی؟ وہ تو رینارڈ کی خوشی کی خاطر خود پر جبر کر کے گئی تھی اور اس واپسی نے اسے بیمار ڈال دیا تھا۔ وہ چارپائی سے لگ گئی تھی۔

رینارڈ ایک ذہین بچہ تھا۔ وہ باپ کے احساسات کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر خاموش رہتا تھا۔ کئی مہینے بیت گئے۔ خبر آئی کمپالا واپس اپنے گھر جا رہی ہے۔ اس خبر نے ملٹن کے دل میں ایک طوفان سا جگا دیا تھا مگر وہ لب سے کچھ نہیں بولا تھا۔

”ڈیڈ کیوں نہ آج ہم شکار کے لیے چلیں؟“

اس نے اسے اداس اور مایوس دیکھ کر اس کی پسندیدہ تفریح کا تذکرہ کیا تھا۔ ”اور آج میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ وقتی طور پر ملٹن خوش ہو گیا تھا۔

پھر دونوں باپ بیٹا شکار کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔“

جنگل میں اسپین کا شہنشاہ اپنے بیٹے فلپ کے ساتھ آیا ہوا تھا ملٹن اور رینارڈ اسی جانب جا نکلے تھے۔ تب ہی بالکل اچانک رینارڈ نے دیکھا تھا کہ ایک اونچے ٹیلے کے پیچھے سے ایک خونخواہ سور شہزادے فلپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کسی کو متوجہ کرنے کا وقت نہ تھا۔ چنانچہ رینارڈ نے خود ہی اس خونخوار جانور سے شہزادے کو بچانے کا فیصلہ کیا تھا اور تیزی سے دوڑتا ہوا آگے بڑھا تھا اور تیزی سے لپکتے سور کے سامنے آگیا تھا اور اس کی فلپ کی طرف لگائی ہوئی جمپ اپنے ناتواں سینے پر روکنے کی کوشش کی تھی۔ سور اس اچانک حملے سے حیران ہی نہیں چراغ پا بھی ہو گیا تھا اور اس نے غصے کے عالم میں اپنے تیز پنجوں اور دانتوں سے رینارڈ کو ادھیڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس دوران بادشاہ کے خدام نے لپک کر سور پر قابو پالیا تھا۔ مگر تب تک رینارڈ بے ہوش ہو چکا تھا۔ رینارڈ تو کچھ دیر بعد شاہی اطباء کی کوششوں سے ہوش میں آگیا تھا اور اس کے زخموں پر مرہم لگا کر پٹیاں کر دی گئی تھیں۔ مگر اس کی یہ بے مثال بہادری اور جذبہ محبت دیکھ کر بادشاہ ہی نہیں خود فلپ بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

رینارڈ! اس نے آنکھیں کھولتے نقاہت میں ڈوبے رینارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے نرم اور محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ”کیا تم مجھ سے دوستی کرو گے۔“

”ہاں، کیوں نہیں،“ رینارڈ نے مسکراتے ہوئے اپنا ننھا سا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا تھا۔

”کیا تم میرے ساتھ میرے قصر میں چل کر رہ سکتے ہو؟ فلپ نے مزید پوچھا۔ اس کی خاطر اپنی جان پر کھیل جانے والے اس جاں نثار دوست کو وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے اس کی خواہش تھی کہ وہ اس کیساتھ ہی چل کر اس کے محل میں رہے۔

”اس کا فیصلہ میرے ڈیڈ کریں گے۔“ رینارڈ نے مسکرا کر ملٹن کی طرف دیکھا تھا۔

”مسٹر ملٹن“ بادشاہ نے پہلی بار اسے مخاطب کیا۔ ”آپ خوش نصیب ہیں کہ خدا نے آپ کو رینارڈ جیسا ذہین اور محبت کرنے والا بیٹا عطا کیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دیدیں۔ فی الحال تو اس کا علاج معالجہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد وہاں شاہی محل کی تعلیم و ترتیب اس ہیرے کو تراش خراش کر چکا چوند کر دیگی۔ آپ جب چاہیں اس سے ملنے آسکتے ہیں۔“

ملٹن جانتا تھا یہ پیشکش نہیں حکم تھا۔ مگر پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ رینارڈ اپنی مرضی اور خوشی سے خود بھی فیصلہ کرے۔

تم کیا کہتے ہو؟ رینارڈ؟ اس نے سوالیہ نظروں سے پٹیوں میں جکڑے رینارڈ کی طرف دیکھا۔

”ڈیڈ! آپ بہت اچھے والد ہیں۔“ رینارڈ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”مگر میں فلپ جیسا اچھا دوست کھونا نہیں چاہتا۔ آپ بھی چاہیں گے کہ میرا کسی اچھے ماحول میں اچھی تعلیم و تربیت حاصل کرسکوں اگر آپ اجازت دیں تو میں پرنس فلپ کے ساتھ جانا پسند کروں گا۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ ملٹن کی آواز بھرا گئی تھی۔ ”تمہاری ماں چلی گئی میں اسے نہ روک سکا......اب تم جانا چاہو تو میں کیسے روکوں گا۔ تم جا سکتے ہو بیٹے۔“

”ڈیڈ“ رینارڈ نے اشارے سے اسے قریب بلایا تھا اور جب وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تو وہ سرگوشی میں بولا تھا۔ ”ڈیڈ ایک بات اور میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ آنٹی کمپالا بہت اچھی ہیں......وہ واپس جانے والی ہیں۔ براہ کرم آپ انہیں روک لیجیے۔ میرے جانے کے بعد آپ بہت تنہا ہو جائیں گے۔ میری آرزو ہے کہ آپ آنٹی کمپالا سے شادی کر لیں۔ وہ بہت اچھی ہیں۔“

اور یوں رینارڈ فلپ کے ساتھ شاہی محل میں چلا گیا تھا۔ جبکہ ملٹن نے کمپالا سے شادی کر کے اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا تھا۔

رینارڈ کو شاہ چارلس نے اپنے ولی عہد فلپ کے ساتھ رہنے اور پڑھنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ رینارڈ کے لیے اور اس کے باپ ملٹن کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ ملٹن جانتا تھا رینارڈ ایک ذہین، بہادر اور قابل بچہ ہے اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ شاہی محل میں شہزادے کے ساتھ رہ کر شاہانہ انداز میں پرورش پا کر اپنی تمام ذہانتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ترقی کرنے کا اہل بن جائے گا۔ اسی لیے اس نے خوشی خوشی اسے فلپ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

شروع شروع وہ شاہی محل کے ٹھاٹھ باٹھ اور رکھ رکھاؤ سے کچھ کنفیوژ رہا پھر جلد ہی اس ماحول سے مانوس ہو گیا۔ سال میں ایک بار وہ اپنے باپ ملٹن اور سوتیلی ماں کمپالا سے ملنے آجاتا تھا۔ دھیرے دھیرے وقت گزرتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی برس بیت گئے اور فلپ و رینارڈ اکٹھے کھیلتے پڑھتے ہنستے مسکراتے ساتھ ساتھ چلتے بچپن کی پگڈنڈی کو عبور کر کے عنفوان شباب میں داخل ہو گئے فلپ ایک درمیانی قامت کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ لمبا آنکھیں کتھئی مائل بھوری ستواں ناک اور باریک گلابی لب تھے۔ اس کے بال سرخی مائل بھورے تھے۔ مونچھیں اور داڑھی بھی اسی رنگ کی تھیں۔ اس کا چہرہ قدرے لمبوترا تھا اور نوکیلی داڑھی کے باعث کچھ اور لمبا لگتا تھا۔ لیکن اس کے انداز و اطوار میں شاہانہ وقار اور تمکنت تھی۔ رینارڈ اس کی نسبت زیادہ لمبا اور خوش شکل تھا۔ مگر وہ فلپ کی بے حد عزت کرتا تھا اس کے دل میں اس کے لیے شدید محبت اور وفا کے جذبات تھے۔ وہ اس کے پسینے پر اپنا خون ٹپکانے کا جذبہ لے کر بڑا ہوا تھا۔ اس کی نس نس میں فلپ سے وفاداری اور خیر سگالی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ وہ فلپ کا سب سے اچھا سب سے قریبی رازدار اور دلدار دوست تھا۔ وہ دونوں ہردم ساتھ رہتے تھے۔ ان دونوں میں غضب کی ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ دونوں ایک ہی انداز سے سوچنے اور چیزوں کو ایک ہی انداز سے دیکھنے کے عادی تھے۔ دونوں نے تعلیمی مدارج بھی

ایک ساتھ ہی طے کیے تھے اور اب خیر سے فارغ التحصیل ہونے کے قریب تھے۔

اس شام وہ دونوں پائیں باغ میں شام کی سیر کے لیے گئے تھے۔

"ہماری تعلیم ختم ہونے کو ہے۔" ٹہلتے ٹہلتے رینارڈ نے برسبیل تذکرہ کیا تھا۔ "اس کے بعد ہم کیا کریں گے؟"

"شادی کریں گے اور کیا کریں گے؟" فلپ نے قدرے شوخ لہجے میں جواب دیا تھا' اور رینارڈ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ جب سے وہ بیسویں برس میں لگا تھا' اسے بار بار شادی کا خیال آنے لگا تھا۔ "ذرا سوچو...... اس کے علاوہ ہمیں اور کرنا بھی کیا ہے۔"

"خیر یہ تو مت کہو۔" رینارڈ نے ہاتھ اٹھا کر بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ "تم شہزادے ہو اور وہ بھی ولی عہد کل کو اسپین جرمنی آسٹریلیا نیدر لینڈ میلان' نیپلز' سسلی' شمالی افریقہ' امریکہ اور جزائر عرب لہند کے اسپینی مقبوضات اور فلپائن پر حکومت کرو گے۔ سوچنا تو مجھے چاہیے کہ میرا کیا بنے گا۔"

"کیسی بات کرتے ہو رینارڈ" فلپ نے خفگی بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم بچپن سے میرے ساتھ ہو مرتے دم تک میرے ہی ساتھ رہو گے میں بادشاہ بنوں گا تو تم وزیر یا میرے مشیر خاص ہو۔ میرے لیے اہم ترین مہمات میں میرے سفیر ہو گے۔ میں تم سے زیادہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔ حتیٰ کہ اپنے بھائی فرڈی ننڈ پر بھی نہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ فرڈی ننڈ...... آپ کو اور مجھے پسند نہیں کرتا۔ آپ کو کیسا لگتا ہے؟ رینارڈ نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔" فلپ نے جواب دیا۔

"میں اس پر اعتماد اور بھروسہ چاہے نہ کرسکوں مگر بہرحال اس سے محبت کرتا ہوں اور میں نے سوچا ہے کہ برسر اقتدار آنے کے بعد اس وسیع سلطنت کے کچھ حصے میں اسے دے دوں گا۔ تا کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہ رہے اور وہ بھی حکومت کرنے کی تمنا پوری کرسکے۔"

کیا مطلب؟ رینارڈ نے حیران لہجے میں سوال کیا۔

"مطلب یہ کہ......" فلپ شاہانہ انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔ "میں نے سوچا ہے کہ جرمنی اور آسٹریلیا کے ممالک میں فرڈی ننڈ کو دے دوں گا۔"

ابھی رینارڈ کوئی جواب نہیں دینے پایا تھا کہ ایک خادمہ بھاگتی ہوئی قریب آئی تھی' اور وہ دونوں اپنی باتیں بھلا کر خادمہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

کیا بات ہے؟ فلپ نے قدرے ناگواری سے خادمہ کو مخاطب کیا تھا۔

شہزادے عالم...... ادھر...... مسٹر رینارڈ کے گاؤں سے ایک پیغامبر آیا ہے۔ اور وہ فوری طور پر رینارڈ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔"

"اوہ" رینارڈ چونک کر خادمہ کی طرف پلٹتا ہوا بولا۔ "کیا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔"

"یقیناً" فلپ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "پیغامبر' پیغام کے سوا اور کیا لائے گا۔ آؤ چلو۔ دیکھتے ہیں...... کیا مسئلہ ہے۔"

"ہاں چلو۔" رینارڈ فلپ کے ساتھ عمارت کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہ دونوں سرخ بجری سے مزین' سرخ اینٹوں کی منڈیروں والی راہ داری سے گزر کر مرمر کی سیڑھیاں چڑھتے برآمدے میں آگئے تھے۔ اگلی راہ داری مڑتے ہی سامنے بیرونی نشست گاہ تھی۔ پیامبر نشست گاہ کے دروازے پر بے تابانہ کھڑا تھا۔

"مسٹر رینارڈ" ان دونوں کو آتے دیکھ کر وہ تیزی سے رینارڈ کی طرف لپکا تھا۔ "آپ کے والد مسٹر ملٹن کی طبیعت سخت خراب ہے اور انہوں نے فوراً آپ کو بلوایا ہے۔"

کیا ہوا ہے انہیں؟ رینارڈ نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔ "وہ خیریت سے تو ہیں نا۔"

"خیریت سے ہی ہوں گے۔" فلپ نے اسے کندھے سے پکڑ کر دھیمی آواز میں کہا۔ "لیکن تمہیں فوری طور پر چلے جانا چاہیے۔ بلکہ سنو میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

"تم......؟ رینارڈ نے حیران نظروں سے شہزادے کی طرف دیکھا۔ "بھلا تم وہاں کیا کرو گے۔؟" وہاں سب لوگ پریشان ہو جائیں گے۔"

"بھئی تم کسی کو بتانا بھی نہیں کہ میں کون ہوں۔ کوئی پریشان نہیں ہوگا ویسے بھی تمہارے بنا یہاں میرا دل نہیں لگے گا۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں شاہ چارلس کے حضور اجازت طلب کرنے کے لیے موجود تھے۔ اجازت ملتے ہی' وہ دونوں ایک تیز رفتار بگھی میں ایک چھوٹے حفاظتی دستے کے ساتھ روانہ ہو گئے تھے۔ دو دن کے مسلسل سفر کے بعد آخر تیسرے دن شام کے وقت وہ دونوں رینارڈ کے چھوٹے سے گھر کے سامنے پہنچے تھے۔ رینارڈ تیزی سے بگھی سے اتر کر اندر کی طرف بھاگا تھا۔ مگر بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اسے ایک حسین ورعنا لڑکی نے روک لیا تھا۔

"ہے...... اس طرح سر اٹھا کر کہاں گھسے جارہے ہو؟ اس نے اس کے سامنے بازو پھیلا کر راستہ روکتے ہوئے کہا تھا۔ اندر انکل ملٹن آرام کررہے ہیں اور ڈاکٹر نے منع کیا ہے کہ ان کے کمرے میں کوئی بھی یوں سر اٹھا کر داخل نہ ہو...... وہ ڈسٹرب ہوں گے۔"

"ارے...... میں ان سے ملنے لندن سے آیا ہوں۔" رینارڈ نے غصے سے کہا۔ "میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"تم ان کے بیٹے ہوتے تو انہیں اس طرح اکیلا چھوڑ کر چلے نہ گئے ہوتے۔" وہ نخوت سے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی۔ "خیر' تم اندر چلے جاؤ مگر 10 منٹ سے زیادہ ہرگز نہ رکنا...... سمجھے......"

ارے تم ہو کون؟ رینارڈ زچ ہو کر بولا۔ "مجھے اس طرح حکم دینے والی...... یہ میرا گھر ہے...... اور تم......"

"میں آنٹی کمپالا کی بھانجی۔ ازابیلا ہوں۔" لڑکی شوخ لہجے میں بولی۔ "تمہیں یاد تو رہتا نہیں یاد نہیں' پچھلی بار تم آئے تھے تو ہمارے گھر بھی آئے تھے اور میں نے تمہارے لیے قہوہ بنایا تھا اور تم نے تعریف بھی کی تھی۔"

"او...... مائی گاڈ...... تم کس قدر باتونی ہو...... یہاں دروازے پر بھی تم نے کتنی دیر لگا دی۔ مجھے اب اندر جانا چاہیے۔" رینارڈ تنگ آئے ہوئے انداز میں سر ہلاتا اندر چلا گیا تھا اور ازابیلا ہونٹوں میں ہنسی چھپائے اسے اندر جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ تب ہی فلپ اندر داخل ہوا تھا۔

تم کون......؟ ازابیلا آہٹ پر پلٹی تھی اور اپنے سامنے ایک شاندار اور باوقار لڑکے کو دیکھ کر قدرے حیرانی سے بولی تھی۔ "اور اس طرح' کہاں اندر گھسے چلے آرہے ہو؟"

کیا مطلب؟ فلپ نے حیرت سے پوچھا تھا۔ "کیا تم یہاں دربار ہو؟"

دربان؟ اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں پھیلا کر فلپ کو غصے سے دیکھا تھا۔ "تمہیں میں دربان دکھائی دے رہی ہوں...... ارے میں یہاں کی مالکن

کی بھانجی ہوں۔ بلکہ سمجھو یہاں کی مالکن ہی ہوں۔"

"اوہ اچھا......" فلپ نے دلچسپی بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی ایک بے حد حسین و دلکش لڑکی تھی۔ چہرے پر بھول پن اور آنکھوں میں شوخی، کلیوں کے سے گداز و گلابی لبوں پر دھیمی مسکراہٹ اور نقرئی گھنٹیوں کی سی کھنکتی آواز فلپ نے اب تک اتنا مکمل اور بھرپور حسن نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنی جگہ تھم کر اسے سرتاپا تکنے لگا تھا۔

ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ ازابیلا نے بھنویں سکیڑ کر غصے سے پوچھا تھا۔ "اس سے پہلے کبھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی کیا؟"

"تم جیسی نہیں دیکھی۔" وہ لبوں سے شوخ مسکراہٹ دبا کر دھیمی آواز میں گویا ہوا۔ "اب ذرا مجھے بتاؤ گی کہ رینارڈ کے فادر کس کمرے میں ہیں میں رینارڈ کا دوست ہوں اور اس کے ساتھ اس کے والد کی عیادت کرنے آیا ہوں۔"

"اوہ اچھا۔" ازابیلا نے کمر پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے سر ہلاتے ہوئے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تو وہ تم جیسے فضول دوستوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ تب ہی تو اسے ماں باپ کا خیال نہیں آتا۔"

"ارے عجیب بدتمیز لڑکی ہو...... میرے منہ پر مجھے فضول کہہ رہی ہو۔" فلپ حیرت بھری خفگی سے بولا۔ آج زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ کسی لڑکی نے اسے اس انداز میں مخاطب کر کے اس طرح کی باتیں سنائی تھیں۔ یہ سب اس کی حیثیت اور شان کے خلاف تھا مگر وہ جانتا تھا یہ معصوم اور دلکش سی لڑکی اس کے مقام سے ناواقف ہے۔ اسی لیے اس کا یہ انداز اور یہ تیور اسے برے نہیں لگ رہے تھے بلکہ وہ لڑکی اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ شاہی تقریبات میں لارڈز ڈیوکس اور ارلرز کی فیملیز بھی مدعو ہوتی تھیں۔ اس کا باپ چارلس کئی ممالک کا شہنشاہ تھا ملکوں ملکوں سے لوگ آتے تھے اکثر ان کے ساتھ ان کی فیملیز بھی ہوتی تھیں۔ اس نے اب تک بے شمار حسین لڑکیاں دیکھی تھیں۔ ایک سے ایک طرحدار اور باوقار مگر اس سادہ معصوم اور شوخ لڑکی جیسی اس نے آج تک ایک لڑکی بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ دنیا کی ہر لڑکی سے مختلف تھی۔ جدا اور منفرد...... دلکش و رعنا...... وہ اسے پلکیں جھپک جھپک کر تکے جا رہا تھا۔

ابھی کچھ ہی دیر قبل ازابیلا کی خالہ کمپالا اسے یہ ذمے داری سونپ کر کہ، ملٹن کے کمرے میں زیادہ لوگوں کو نہ جانے دینا، خود ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ ملٹن ایک نیک خو، ملنسار اور محبت کرنے والا انسان تھا۔ اس لیے پورے گاؤں میں اس کی بڑی عزت تھی اور لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ جب سے لوگوں کو ملٹن کے صاحب فراش ہونے کی خبر ہوئی تھی صبح سے شام تک مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جب کہ ڈاکٹر نے ملٹن کو آرام و سکون کی تاکید کی تھی چنانچہ کمپالا نے یہ طریقہ نکالا تھا کہ دروازے پر خود موجود رہتی اور ایک ایک فرد کو اندر جانے کی اجازت دیتی آج اسے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا تو وہ یہ ذمے داری اپنی بڑی بہن کیلا کی بیٹی ازابیلا کو سونپ گئی تھی۔

ازابیلا رینارڈ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ سال میں صرف ایک بار ہی والدین سے ملنے آتا تھا۔ البتہ ملٹن جب چاہتا لندن جا کر اس سے مل آتا تھا۔ پچھلے دو تین سالوں میں رینارڈ میں بہت تبدیلی آئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دبلا پتلا بڑی بڑی ذہین آنکھوں والا خاموش طبع سا لڑکا ایک لا اسمارٹ اور خوبرو نوجوان بن گیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں بڑی گہرائی تھی اور جا

کیوں ازابیلا کا دل ان آنکھوں میں ڈوب جانے کی آرزو کرنے لگا تھا۔

ازابیلا میں بھی بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ شروع سے ہی ایک خوبصورت بچی تھی مگر شباب نے تو اس پر ایسا نکھار اتارا تھا کہ راہ چلتے لوگ لحظہ بھر کو ٹھٹک کر اسے تکنے لگتے تھے۔ بالکل یہی حال فلپ کا بھی ہوا تھا۔ وہ اپنے دل میں عجب سی سرخوشی محسوس کر رہا تھا۔ ایک نیا سا احساس اس کے رگ و پے میں سرائیت کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

اندر رینارڈ اپنے باپ کے سرہانے بیٹھا تھا۔ آہٹ پر ملٹن نے آنکھیں کھول کر آنے والے کی طرف دیکھا تھا۔

"رینارڈ" اس کی متحیر آواز ابھری۔ "میرے بچے تم آگئے۔"

"جی ڈیڈ" رینارڈ باپ کی طرف جھکتا ہوا مستعدی اور ادب سے بولا۔ "پیغام ملتے ہی میں روانہ ہو گیا تھا۔"

"میں نے پیغامبر کو یہی کہا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر آئے۔"

ملٹن نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ "کیونکہ میں تم سے جانے سے پہلے کچھ باتیں کرنی چاہتا تھا۔"

"ڈیڈ" رینارڈ تڑپ کر بولا۔ "کیسی بات کر رہے ہیں۔ آپ معمولی بیمار ہیں میں آپ کو اپنے ساتھ لندن لے کے جاؤں گا تو...... اعلیٰ سے اعلیٰ معالج سے آپ کا علاج کرواؤں گا۔ آپ دیکھیے گا۔ کتنی جلدی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"خداوند کریم تمہیں خوش رکھے۔" ملٹن نے مسکرانے کی کوشش کی تھی مگر تکلیف اور نقاہت کے باعث وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ وہ بے حد کمزور اور نحیف و نزار ہو چکا تھا۔

"بس میری ایک خواہش ہے۔ میں تمہاری شادی دیکھنا چاہتا ہوں۔" چند لمحوں تک توقف کے بعد گہری سانس لے کر وہ دھیمی آواز میں گویا ہوا۔ میری آرزو ہے...... کہ تم...... مگر پہلے ایک بات سن لو...... اگر تم کسی اور لڑکی کو پسند کر دیا کسی اور سے شادی کرنا چاہو...... تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بس میں نے ایسے ہی سوچ لیا تھا کہ اگر تم ازابیلا سے شادی کر لو تو۔"

"ازابیلا۔" رینارڈ نے چونک کر سوال کیا تھا۔

"ہاں" ملٹن نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی اور اس بار وہ خاصہ کامیاب رہا۔ "وہی لڑکی جو تمہیں ابھی دروازے پر ملی ہوگی۔ تمہاری ماں کمپالا کی بڑی بہن کیلا کی بیٹی ہے۔ بہت ہی اچھی اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔"

"مگر ڈیڈ......" رینارڈ نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں نے کہا نا۔" ملٹن اس کی بات کاٹتا ہوا ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اگر تمہیں وہ سمجھ نہ آئے تو نہ سہی...... تم کسی اور سے شادی کر لو...... مگر میں چاہتا ہوں تم میری زندگی میں ہی اپنا گھر بسا لو...... تم میری واحد اولاد ہو...... میں تمہاری یہ خوشی مرنے سے پہلے دیکھنے کا متمنی ہوں...... باقی جو اوپر والے کی مرضی۔"

رینارڈ ابھی کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ دروازہ دھکیلتے ہوئے کمپالا اندر داخل ہوئی تھی۔

"اوہ...... رینارڈ...... مائی ڈیئر سن...... تم آگئے۔"

"جی، مام" رینارڈ نے کھڑے ہو کر ماں کو تعظیم دی تھی۔ "پیغام ملتے ہی میں روانہ ہو گیا تھا۔"

"تم جیسے اچھے اور سعادت مند بیٹے سے ہمیں یہی امید تھی۔ کیا تمہارا کوئی دوست بھی تمہارے ساتھ آیا ہے؟"

"جی" رینارڈ نے جواب دیا اور ایک دم ہی اسے فلپ کا خیال آیا۔ وہ تو اسے بھول ہی چکا تھا۔ ہڑبڑا

کراپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے کمرے سے جانے کے لیے مڑا۔

"ارے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔" اسے ہڑ بڑاتے دیکھ کر کمپالا مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں نے ازابیلا سے کہہ دیا ہے وہ اسے منہ ہاتھ دھلوا کر بیٹھک میں بٹھا دے گی' اور ہاں تم بھی منہ ہاتھ دھولو۔ میں تم دونوں کے لیے قہوہ بھجوا رہی ہوں اور ہاں جلدی سے بتادو۔ رات کے کھانے میں کیا کھانا پسند کرو گے؟

"جو آپ پسند کریں۔" رینارڈ جلدی سے بول کر کمرے سے باہر نکلا دروازے پر حسب سابق ازابیلا موجود تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی بے ساختہ سے ملٹن کی کہی ہوئی بات یاد آگئی تھی۔ وہ لحظہ بھر کو رک کر حیران نظروں سے اسے دیکھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ ازابیلا قدرے شرما کر کسی قدر خفگی سے بولی۔ "تم لندن والے سارے مڑ کے کیا اسی طرح لڑکیوں کو گھورتے ہو وہ تمہارا فضول دوست بھی مجھے اسی طرح گھور رہا تھا۔ کیا وہاں لندن میں لڑکیاں نہیں ہوتیں؟

"اف تم کس قدر بولتی ہو؟" رینارڈ سر تھام کر بولا۔ "اور ہاں وہ میرا دوست کہاں ہے؟ تم نے اس سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی نا......؟ وہ ایک بہت بڑے رئیس کا بیٹا ہے اور فضول باتوں کا بالکل بھی عادی نہیں ہے۔"

حفاظت کے خیال سے چارلس پنجم نے ان دونوں کو سختی سے منع کیا تھا کہ کسی کو بھی پتہ نہ چلے کہ اس کے ساتھ آنے والا نوجوان سلطنت اسپین کا ولی عہد ہے' حتیٰ کہ اس نے ملٹن اور کمپالا کو بھی بتانے سے منع کر دیا تھا۔ اسی لیے رینارڈ نے یہی ظاہر کیا تھا کہ فلپ اس کا ایک ہم مکتب دوست ہے جو لندن کے مضافات میں رہتا ہے اس کے ساتھ اس کے گاؤں کی سیر اور اس کے بیمار والد کی عیادت کو چلا آیا۔

"بڑا آیا رئیس زادہ۔" ازابیلا نے منہ بنا کر منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر کہا۔ وہ اندر بیٹھک میں بیٹھا ہے۔ تم بھی اس کے پاس چلے جاؤ۔ میں ابھی قہوہ لے کر آرہی ہوں۔"

پھر وہ ایک شان بے نیازی سے چلتی کچن کی طرف چلی گئی۔ رینارڈ اپنی جگہ پر کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔ وہ ایک انتہائی حسین اور دلکش لڑکی تھی۔ اس کا گداز جسم سانچے میں ڈھلا اور بے حد متناسب اور پرکشش تھا اس کی آواز مترنم اور جھرنوں کے گرنے کی مدھر آواز کی سی تھی اور آنکھیں سمندر کی طرح گہری اور نیلی تھیں۔ وہ مسکراتی تو اس کے شفاف گلگوں رخساروں میں گڑھے پڑ جاتے تھے اور دیکھنے والے کا دل بے اختیارانہ ان گڑھوں میں ڈوب جانے کو چاہتا تھا اور جب سے ملٹن نے اس سے' ازابیلا سے شادی کر لینے کی بات کی تھی لحظہ بھر میں اس کی سوچ کے زاویے بھی بدل گئے تھے۔

جب سے فلپ نے جوانی کی وادی میں قدم رکھا تھا۔ وہ اکثر شادی کی بات کرنے لگا تھا۔ مگر رینارڈ نے اب تک اس موضوع کے بارے میں سنجیدگی سے کبھی نہ سوچا تھا۔ مگر آج اس پل' باپ کے کہنے پر اور ازابیلا جیسی حور شمائل لڑکی کو دیکھ کر اس کا دل ایک نئے انداز سے دھڑکنے لگا تھا۔ ازابیلا کچن میں جا چکی تھی۔ وہ اپنی منتشر دھڑکنوں کو سنبھالتا بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں فلپ موجود تھا۔

"معاف کرنا دوست۔" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "دراصل گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے ڈیڈ اور ان کی بیماری کے سوا کچھ یاد نہ رہا میں یہ بھی بھول گیا کہ اسپین کے ولی عہد نے میرے گھر کو یہ عزت بخشی ہے کہ وہ

میرے ساتھ میرے چھوٹے سے گھر میں موجود ہے۔"

"بھول جاؤ کہ میں اسپین کا ولی عہد ہوں۔" فلپ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ "اس وقت میں صرف تمہارا دوست ہوں ...... جو تمہارے ساتھ تمہارے بیمار باپ کی مزاج پرسی کو آیا ہے۔"

"شکریہ فلپ۔" رینارڈ نے جھک کر اس کا ہاتھ تھام کر اس کے پشت پر مہر محبت ثبت کرتے ہوئے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔ "سچ تم دنیا کے سب سے اچھے انسان اور سب سے اچھے دوست ہو...... تمہاری خاطر میں جان بھی قربان کر دوں تب بھی تمہاری دوستی کا حق ادا نہ ہوگا۔"

"چھوڑو یہ باتیں۔" فلپ فراخدلی سے مسکراتا ہوا بولا۔ "اور ذرا دیکھو وہ تیکھا مرچ قہوہ لا رہی ہے کہ نہیں' مجھے یہاں بٹھا کر وہ یہی کہہ کر گئی ہے۔ یہاں اطمینان سے بیٹھو میں تمہارے لیے قہوہ بناتی ہوں۔ آجاتے ہیں جانے کہاں سے منہ اٹھا کر۔"

"اوہ" رینارڈ کچھ شرمندہ ہوا۔ "اصل میں جان! اسے تمہاری پہچان نہیں ہے نا...... وہ...... کچھ منہ پھٹ ...... اور لاپرواہ سی لڑکی ہے۔ اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

"ارے پاگل ہوئے ہو۔" فلپ ہلکا سا ہنسا۔ "میں نے کب کہا کہ مجھے اس کی باتیں بری لگیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے ...... رینارڈ...... اس کا کھرا اور صاف لہجہ منافقت سے عاری باتیں' اور بے ریا آنکھیں مجھے اچھی لگیں۔" اس سے پہلے کہ رینارڈ کوئی جواب دیتا۔ ازابیلا دروازہ دھکیلتی اندر داخل ہوئی اس نے دونوں ہاتھوں سے ایک ٹرے تھام رکھی تھی۔ ٹرے میں گرما گرم بھاپ اڑاتے قہوے کے دو پیالوں کے علاوہ نمکین پستے اور گڑ کی لذیذ ٹکیاں بھی دھری تھیں اس نے ٹرے چھوٹی سی تپائی پر رکھتے ہوئے ان دونوں کی جانب دیکھ کر قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"تم لوگ قہوہ پی لو...... تب تک میں آنٹی کے ساتھ مل کر تم لوگوں کے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

"شکریہ ازابیلا" رینارڈ نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"شکریہ کی کیا ضرورت ہے۔" وہ ٹھنکتے لہجے میں بولی۔ "بس تمہیں اتنا کہوں گی۔ اپنے والد کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے اور ان کی خواہشات کا احترام کرنا ہی تم پر لازم ہے۔"

کیا؟ رینارڈ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ ان کی کیا خواہش ہے؟"

"ارے بابا مجھے کیا معلوم" اس کے یوں اچھلنے پر وہ قدرے سٹ پٹا کر بولی۔ "میں نے تو ویسے بھی کہہ دیا تھا...... چلو اب قہوہ پیو......"

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ رینارڈ خاموشی سے فلپ کے مقابل آبیٹھا تھا۔ اس تمام عرصے میں فلپ بالکل خاموش رہا تھا۔ اور ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق ٹکٹکی باندھ کر اسے تکتا رہا تھا۔

"ازابیلا" رینارڈ کی طرف دیکھ کر وہ دھیمے اور خوابناک لہجے میں بولا۔ "یہی نام لیا تھا نا اس کا؟"

"ہاں" رینارڈ قدرے حیرت سے بولا۔ "کیا اب تک اس نے تمہیں اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا؟"

"بہت خوبصورت اور شاندار نام ہے۔" فلپ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ "بالکل اسی کی طرح' دلکش و دلفریب" رینارڈ نے کوئی جواب نہیں دیا بس پلکیں جھپک کر اس کی جانب دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"رینارڈ" میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس

چھوٹے سے گاؤں میں دنیا کی سب سے حسین لڑکی بھی موجود ہو سکتی ہے۔"

کیا مطلب؟ رینارڈ واقعی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

"مطلب صاف ظاہر ہے۔" فلپ مسکرایا۔ "تم بتاؤ تم کیا سمجھے؟"

"دراصل ہم جس عمر میں ہیں نا......" رینارڈ بھی مسکرایا۔ "اس عمر کے لڑکے ایسے ہی لالچی اور ترسے ہوئے ہوتے ہیں...... بے حد پیاسے...... اتنے کہ پنگھٹ پر موجود ہر لڑکی کو اتنی پیاسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ ان کا بس چلے تو اپنے گھڑے ہمارے سروں پر ہی چھوڑ دیں۔"

اپنی بات مکمل کر کے رینارڈ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

"شاید تمہارا تجزیہ درست ہو۔" فلپ اس کے ساتھ ہنسنے کی بجائے بے حد سنجیدگی سے گویا ہوا تھا۔ "شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ اس عمر میں لڑکوں کی شادی ہو جانی چاہیے تا کہ وہ پنگھٹ کی ہر لڑکی کو پیاسی نظروں سے دیکھنے کی بجائے۔ اپنی شریک زندگی سے اپنی زندگی کی پیاس بجھا سکیں۔"

اور شادی کے تذکرے پر بے ساختہ رینارڈ کو اپنے باپ ملٹن کی بات یاد آ گئی تھی۔ اس نے اس کے لیے ازابیلا کا انتخاب کیا تھا اور ازابیلا کے تصور کے ساتھ ہی اسے اپنی دھڑکنوں میں ایک عجب سا خوشگوار سا احساس جاگتا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں میں ایک بے نام سا خمار اترتا محسوس ہوا تھا۔

فلپ! تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ہماری شادی کی عمریں ہو گئی ہیں اور اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔"

"تمہارا تو پتہ نہیں؟" فلپ شوخ انداز میں مسکرایا۔ "البتہ میں نے آج ابھی بد مصمم ارادہ اور پختہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جلد از جلد شادی کر لوں گا۔"

"اچھا۔" رینارڈ کے لہجے میں حیرت بھرے مسرت در آئی تھی۔ وہ مسرور و محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں چند لمحوں کی خاطر سکوت چھا گیا تھا۔ دونوں گہری سوچوں میں ڈوبے ازابیلا کے ہاتھ تیار کردہ لذیذ قہوہ کی چسکیاں لے رہے تھے۔

"یہ ازابیلا تمہیں کیسی لگی؟" بالکل اچانک ہی فلپ نے رینارڈ سے پوچھا تھا۔

"ازابیلا؟" رینارڈ چونک کر سیدھا ہوتا ہوا بولا۔ "یقین کرو یہی سوال میں تم سے کرنے والا تھا۔

"مجھے تو وہ بہت بہت...... بہت اچھی لگی..... ایسا لگا جیسے عمر بھر کی تلاش پوری ہو گئی شاید میری آنکھوں کو اس جیسے چہرے کی ہی تلاش تھی۔ میرے دل کو ایسی ہی سادہ معصوم اور بے ریا دل کی جستجو تھی۔ وہ ہو بہو ویسی ہی ہے۔ جیسی لڑکی میں چاہتا تھا۔ اس میں سلطنت اسپین کی ملکہ بننے کی تمام خاصیتیں موجود ہیں۔ اس میں شہزادے فلپ کی شریک زندگی بننے کی بھرپور صلاحیت اور لیاقت ہے۔" یہ تمام باتیں فلپ سوچ کر رہ گیا تھا۔ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ بس اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور لبوں دلکش مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ رینارڈ اس سے اپنے سوال کے جواب کے لیے اصرار کرتا کمرے کا دروازہ کھول کر کمپالا اندر داخل ہوئی تھی۔

"بچو! تم لوگ ڈنر کس وقت کرنا پسند کرو گے؟" اس نے نرم اور ممتا بھرے لہجے میں کہا۔ "کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ آج رات ڈنر پر میں اپنی بہن کمیلا اور اس کے شوہر رینی کو بھی مدعو کر لوں۔ کیا تم لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔؟

"کیسی بات کر رہی ہیں آنٹی۔" رینارڈ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فلپ خوش اخلاقی سے بولا۔

"آپ شوق سے انہیں انوائیٹ کر سکتی ہیں اور رہا ڈنر کے وقت کا سوال تو آپ لوگ جس وقت ڈنر کرتے ہیں ہم لوگ اسی وقت ڈنر کر لیں گے۔" پھر وہ حیرت سے منہ کھولے رینارڈ کو مخاطب کر کے بولا تھا۔ "کیوں رینارڈ ٹھیک ہے نا؟"

آں ہاں...... کیوں نہیں؟ وہ گڑبڑا کر جلدی سے بولا تھا اور کمپالا مسکراتی ہوئی واپسی کے لیے مڑ گئی تھی۔

یہ مسز کمیلا اور مسٹر رینی...... ازابیلا کے والدین ہیں نا؟ کمپالا کے جانے کے بعد فلپ نے رینارڈ سے تصدیق چاہی تھی۔

"ہاں شاید......" رینارڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پرسوچ آواز میں جواب دیا تھا۔

رات کے کھانے پر کھانے کی میز پر رینارڈ فلپ اور کمپالا کے علاوہ اس کے بہن بہنوئی بھی موجود تھے۔ جبکہ ملٹن پرہیزی کھانا کھانے کی وجہ سے اور کراہت کے باعث کھانے کی میز پر نہ آ سکا تھا۔ ازابیلا نے اسے اس کے کمرے میں ہی دودھ ملا دلیا کھلا دیا تھا اور اس وقت وہ ایک سگھڑ میزبان کی طرح بھاگ بھاگ کے کھانے پینے کی اشیاء ٹیبل تک پہنچا رہی تھی۔ کھانا بے حد لذیذ تھا۔

"آنٹی کھانا بے حد لذیذ ہے؟" کھانے کے بعد فلپ نے دل سے تعریف کی تھی۔

"اس کا تمہیں کریڈٹ ازابیلا کو دینا ہوگا۔" کمپالا فخر بھرے انداز میں مسکرائی تھی۔ "آج کا سارا ڈنر ازابیلا نے ہی تیار کیا ہے۔"

"اچھا" فلپ کے ساتھ رینارڈ کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ "اس کا کریڈٹ تو آنٹی کمیلا کو جاتا ہے۔" رینارڈ نے دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ ان کی تربیت کا ہی نتیجہ ہے جو وہ اتنی اچھی اور سلیقہ مند ہے۔"

"شکریہ رینارڈ" کمیلا محبت بھری نظروں سے اسے تکتے ہوئے بولی۔ بہت مدت سے اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی ازابیلا کی شادی رینارڈ سے ہو جائے اور آج اس کے منہ سے اپنی اور بلاواسطہ طور پر ازابیلا کی تعریف سن کر وہ خوش ہو گئی تھی۔ کھانے کے بعد ازابیلا گرم گرم لذیذ قہوہ لے آئی تھی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد فلپ اور رینارڈ ملٹن کے کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ بیٹے کو دیکھ کر ملٹن کی طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی اور وہ خاصہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"اب تم لوگوں کو آرام کرنا چاہیے۔" گاؤں کے گھنٹہ گھر سے 10 بجنے کی آواز آئی تو کمپالا نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "رینارڈ تمہارے بیڈ روم میں ازابیلا نے تمہارے دوست کے لیے بھی بیڈ لگا دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے بچپن کی خواب گاہ میں ...... خواب خرگوش کے مزے لوٹو گے؟"

"ہاں کیوں نہیں......" رینارڈ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لیے یہ احساس بڑا خوش کن تھا کہ اس کا بیڈ ازابیلا نے ٹھیک ٹھاک کیا ہے جبکہ فلپ کے لیے بھی یہ بات مسرور خیز تھی کہ اس کا بستر ازابیلا نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے لگایا ہے۔ وہ دونوں ملٹن اور کمپالا کو "گڈ نائٹ" کہہ کر کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ باہر سناٹا تھا۔ ازابیلا کچن سمیٹ کر اور کھانے کے برتن دھو دھلا کر اپنے گھر جا چکی تھی۔

"بھلا اس کے حسین نازک اور نرم و گداز ہاتھ برتن دھونے کے لیے بنے ہیں؟" کچن میں جھانک کر برتن اسٹینڈ پر دھلے ہوئے برتنوں کا ڈھیر دیکھ کر فلپ نے افسوس بھرے انداز میں سوچا تھا۔

"جس قدر پھرتی اور خوش اسلوبی سے وہ تمام کام بنا لیتی ہے۔" رینارڈ نے بھی صاف ستھرے کچن پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا تھا۔ وہ دونوں مختلف انداز میں سوچ رہے تھے مگر ان کی سوچ کا مرکز ایک ہی

تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے انداز میں ازابیلا کے بارے میں سوچتے ہوئے خوابگاہ میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ ایک چھوٹا مگر بے حد صاف ستھرا اور آرام دہ کمرہ تھا۔ ہر چیز سے ازابیلا کے ہنر مند ہاتھوں کا سلیقہ اور قرینہ جھلک رہا تھا۔ وہ دونوں لباس تبدیل کر کے اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے تھے اور دونوں ہی آنکھیں بند کر کے ازابیلا کے خوابوں میں کھو گئے تھے۔ تب ہی ہلکی آہٹ پر رینارڈ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس پر کوئی جھکا ہوا تھا۔

کک...... کون؟ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا تھا۔

"میں ہوں...... ڈینی...... ازابیلا کا بھائی۔" اس پر جھکے ایک نوعمر لڑکے نے سرگوشی میں اپنا تعارف کروایا تھا۔ میں قصبے میں کسی کام سے گیا تھا ابھی واپس آیا ہوں...... دیر ہو گئی تھی...... مگر میرا دل نہیں مانا اور میں آپ سے ملنے چلا آیا۔"

"اوہ اچھا کیا......" رینارڈ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں بات کرنے سے فلپ کی نیند ڈسٹرب ہونے کا خدشہ تھا۔ اسی لیے وہ ڈینی کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ صحن کے اس پار چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ جس میں سبز گھاس کے مخملی فرش کے ساتھ رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں تھیں اور پھل دار اونچے پیڑ تھے وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے باغیچے میں چلے آئے۔ سامنے ہی ایک پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے ازابیلا کھڑی تھی۔

اوپر نیلے آسمان پر چاند کا سنہرا کنول کھلا ہوا تھا۔ ننھے ننھے روپہلے تارے ٹم ٹما رہے تھے۔ سامنے سرسبز و شاداب باغیچے میں ازابیلا اپنے چاند چہرے اور ستارہ آنکھوں کے ساتھ اس کی جانب تک رہی تھی۔

"اوہ تم بھی موجود ہو؟" اسے دیکھ کر رینارڈ کو حیرت بھری مسرت ہوئی تھی۔

"کیوں، کیا تمہیں اچھا نہیں لگا؟" اس نے نروٹھے لہجے میں سوال کیا۔

"ارے نہیں" رینارڈ صلح جو لہجے میں بولا۔ "میرا مطلب تھا کہ دن بھر تم اس قدر مصروف رہی ہو...... رات کا کھانا...... کچن کی صفائی...... وغیرہ وغیرہ...... تو کیا تم تھکیں نہیں؟"

"اپنوں کے لیے کام کر کے تھکن نہیں خوشی ہوتی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "تو اب ...... آپ دونوں باتیں کریں میں چلتا ہوں۔" 13 سالہ ڈینی جماہی لیتے ہوئے بولا۔ "میں بہت تھکا ہوا ہوں اب آپ سے کل صبح ملاقات ہو گی۔"

اس نے مصافحے کے لیے رینارڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور رینارڈ نے لپک کر نہایت محبت اور اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"Good Night" اس نے واپسی کے لیے مڑتے ہوئے ہاتھ ہلا کر رات کا سلام پیش کیا اور رینارڈ اس کا جواب دیتے ہوئے ازابیلا کی طرف مڑ گیا۔

"شکریہ" وہ مسکرا کر بولا۔

کس بات کا شکریہ؟ ازابیلا نے حیرانی سے پلکیں جھپک کر سوال کیا۔

"ہم سب کو اپنا کہنے کے لیے۔" رینارڈ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

تب ہی ہلکی سی آہٹ ہوئی تھی دونوں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ فلپ آنکھیں ملتا چلا آرہا تھا۔ "یار جم گھامڑ ہو...... مجھے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر آ گئے؟"

کیوں کمرے میں اکیلے تمہیں ڈر لگتا ہے؟ ازابیلا کھلکھلا کر بولی اور فلپ کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

اوہ تم بھی موجود ہو؟ وہ حیرانی بھرے انداز میں خوش ہو کر بولا۔

"تمہیں اچھا نہ لگ رہا ہو تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔" ازابیلا تنک کر بولی۔

"ارے نہیں" وہ جلدی سے بولا۔ "آسمان پر وہ پورا روشن دمکتا چاند دیکھ رہی ہو؟ اس نے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ازابیلا سے پوچھا تھا اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے چاند چہرے کی طرف دیکھ کر کھوئے کھوئے لہجے میں بولا تھا۔

"آج میں نے پہلی بار ایسا منظر دیکھا ہے ایک ہی وقت میں دو چاند، ایک آسمان کی وسعتوں میں اور ایک ...... میرے سامنے اس چھوٹے سے باغیچے میں۔"

"تمہارا یہ دوست شاعر تو نہیں ہے۔" ازابیلا نے قدرے بے زاری سے رینارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "جب دیکھو بے تکی باتیں کرتا ہے۔"

"ازابیلا پلیز......" رینارڈ سٹ پٹا کر بولا۔ "میرا دوست ہے...... ذرا عزت و احترام کو ملحوظ رکھو۔ وہ برا بھی مان سکتا ہے۔"

"برا مانے تو مجھے کیا؟" ازابیلا شانے اچکا کر بولی۔ "تو اب تم اسے مناتے بیٹھے رہو۔ میں تو چلی۔" وہ بنا ایک لفظ سنے تیزی سے واپسی کے لیے مڑ گئی تھی اور وہ دونوں بے بسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے تھے۔

"فلپ! وہ تمہیں جانتی نہیں ہے نا...... اسی لیے اتنی بدتمیزی کر گزرتی ہے۔" اس کے جانے کے بعد رینارڈ معذرت خواہانہ لہجے میں گویا ہوا تھا۔ "اس کی طرف سے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

"اس کی طرف سے تم کیوں معافی مانگ رہے ہو؟" فلپ نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "وہ تمہاری کون لگتی ہے؟

"وہ...... اصل میں...... وہ...... ڈیڈ......" رینارڈ کو فلپ سے اس جارحانہ انداز کی توقع نہ تھی۔ وہ بری طرح کنفیوژ ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ وہ فلپ کو بتا دے کہ اس کے ڈیڈ نے اسے اس کے لیے منتخب کیا ہے اور اس کے دل نے بھی یہ رشتہ قبول کر لیا ہے مگر وہ فلپ کے سامنے اظہار نہ کر سکا، محض سٹ پٹا کر خاموش ہو گیا۔

"جانتا ہوں۔" فلپ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "وہ تمہارے ڈیڈ کی سالی کی بیٹی ہے۔ تمہاری اس سے رشتہ داری ہے۔ مگر تم نہیں جانتے میرا اس سے رشتہ ہی کچھ اور ہے۔"

کیا مطلب؟ رینارڈ حیرت زدہ سا بولا۔ "تمہارا اور اس سے رشتہ؟"

"ہاں" فلپ دلنشین انداز میں مسکرایا۔ "میرا اس سے دل کا رشتہ ہے۔"

پھر لحظہ بھر چپ رہ کر وہ رینارڈ کو شانوں سے تھام کر دھیمی آواز میں بولا۔ "رینارڈ تم میرے سب سے اچھے اور قابل بھروسہ دوست ہو میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا...... اور چھپا سکتا بھی نہیں...... تو ابھی اسی وقت میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ...... آج شام...... میں نے ازابیلا کو جس پل دیکھا تھا...... اسی پل اسی لمحے وہ نگاہوں کی راہ سے میرے دل میں اتر گئی تھی...... میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

رینارڈ کے منہ سے کئی لمحوں تک کوئی آواز نہ نکل سکی تھی وہ سکتے کی سی کیفیت میں آنکھیں پھاڑے منہ کھولے فلپ کو تکے جا رہا تھا۔

"رینارڈ میرے دوست! تم اسے میرا بنانے میں، میری مدد کرو گے نا؟" وہ اسے شانوں سے ہلا کر پوچھ رہا تھا۔

"کچھ بولو نا...... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"او...... ہاں......" کئی لمحوں بعد رینارڈ گہرا سانس لے کر یوں جاگا جیسے گہری نیند میں چلا گیا تھا۔ "وہ ...... فلپ...... تم نے یہ بات...... سوچتے وقت کیا یہ

سوچا کہ...... تم کوئی عام لڑکے نہیں بلکہ ایک بہت بڑی سلطنت کے ولی عہد ہو۔ کیا ازابیلا جیسی عام سی لڑکی ایک چھوٹے سے گاؤں اور غریب خاندان کی پروردہ...... کیا تمہاری ملکہ بننے کے لائق ہے؟

''اسے عام سی لڑکی کہہ کر' اس کی توہین نہ کرو رینارڈ۔'' فلپ نے اس کی بات کا قدرے برا مانتے ہوئے کہا۔ ''اسے میری نظر سے دیکھو وہ دنیا کی تمام لڑکیوں سے اعلیٰ و افضل ہے۔ بس مجھے شادی کرنی ہے تو صرف اور صرف ازابیلا کے ساتھ۔''

رینارڈ کو اپنے سینے میں کوئی چھن سے ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی' اس کے چہرے پر سے ایک ملال بھرا سایا لہرا کر گزر گیا تھا اور اس کی خواب دیکھتی روشن آنکھیں ایک دم سے بجھ گئی تھیں۔

''کیا شہنشاہ چارلس پنجم اس رشتے کی اجازت دے دیں گے؟'' کئی لمحوں کے بعد اس نے شکستہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

''اس کی تم فکر مت کرو۔ میں انہیں منا لوں گا۔'' وہ کاندھے جھٹک کر بولا۔ ''تم بس یہ بتاؤ' ازابیلا اور اس کے ماں باپ کو کس طرح راضی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ جب انہیں حقیقت کا پتہ چلے گا تو کہیں وہ' خوفزدہ ہو کر انکار نہ کر دیں؟

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔'' رینارڈ نے خود کو سنبھال کر کہا تھا۔ ''کتنے ہی غریب اور معمولی والدین کیوں نہ ہوں اپنی بیٹیوں کے لیے وہ محلوں کے ہی خواب دیکھتے ہیں اور چاہتے کہ ان کی بیٹی کو کوئی راجا مہاراجا بیاہ کر لے جائے اور ان کی بیٹی محلوں میں رانی بن کر راج کرے۔ اس حوالے سے تو ازابیلا کے والدین بہت خوش نصیب ہیں کہ انہیں سچ مچ کا محلوں کا راجہ مل رہا ہے تم بے فکر رہو۔ وہ خوشی خوشی اس رشتے کے لیے راضی ہو جائیں گے۔''

''اور...... اور......'' فلپ ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ''اور ازابیلا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ازابیلا؟'' رینارڈ نے کرب بھرے انداز میں اس کا نام دوہرایا۔ ''بھلا اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

''پتہ نہیں تم نے دیکھا یا نہیں۔'' فلپ رینارڈ کی مغموم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''مگر میں نے دیکھا...... اور محسوس کیا...... کہ اس کی آنکھوں...... تمہارے لیے...... کچھ الگ سے جذبے تھے...... شاید وہ تمہیں پسند کرتی ہے...... یا شاید...... تم سے محبت کرتی ہے۔''

کیا؟ رینارڈ نے زخمی لہجے میں قدرے حیرت سے کہا۔ ''اتنی ذرا سی دیر میں تم نے یہ سب کب دیکھ لیا؟ میں نے تو ایسا کچھ محسوس نہیں کیا۔''

''چلو یہ تو اچھا ہے۔'' فلپ سنگ دلی سے مسکرایا اور رینارڈ کا دل چاہا وہ اس سے پوچھے یہ سب دیکھ کر یہ سب محسوس کر کے بھی اس نے ازابیلا کی کیسے آرزو کی؟ اپنے دوست کی محبت پر شب خون مارتے وقت اس ذرا سا بھی نہ سوچا۔

مگر اگلے ہی لمحے رینارڈ نے سوچا تھا۔ ''رینارڈ یہ مت بھولو تم ایک معمولی کسان زادے ہو جبکہ فلپ ایک بڑی سلطنت کا شہزادہ ہے اور تم اس کے دوست نہیں مصاحب ہو اور مصاحبوں کا کام' ہاں میں ہاں ملانا ہوتا ہے۔ شکوہ کرنا یا سوال کرنا نہیں...... تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ فلپ کی خواہش پر اپنی خواہش اور اپنے باپ کی آرزو کو قربان کر دو۔''

اور باپ کے ذکر پر بے ساختہ اسے اپنے بوڑھے اور لب مرگ باپ کا خیال آیا تھا۔ تب ہی اندرونی کمرے سے کمپالا کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

''رینارڈ...... جلدی آؤ...... دیکھو تو...... تمہارے ابا کو کیا ہو گیا؟''

(جاری ہے)

مقتول گواہ

راشد سعید

''سوری کی ضرورت نہیں انسپکٹر صاحب! بس میں تم سے یہ درخواست کروں گا کہ تم ایسے کسی بھی معاملے میں طاقت کے بجائے ذہانت سے کام لیا کرو۔''

میری بات پر انسپکٹر ایک بار پھر جھینپ گیا اور سادھو مسکرانے لگا۔



ایک مقتول گواہ کی گواہی کی داستان

یہ میں نے نیا گھر خریدا تھا۔ اسے خریدنے سے پہلے میں نے اس کے بارے میں ہر طرح سے تسلی کر لی تھی۔ آس پڑوس کے لوگ بہت اچھے تھے۔ یہ گھر بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن میرے چھوٹے سے کنبے کے لیے مناسب تھا۔ میرے گھر کے صرف چار افراد تھے۔ میں' میری بیوی شاردا' میرا بیٹا گووندا اور بیٹی شلکھشنا۔ گووند دس برس کا تھا اب کہ شلکھشنا کی عمر آٹھ برس تھی۔

میں اپنا چھوٹا سا کاروبار کرتا ہوں۔ ایک مارکیٹ میں کپڑے کی دکان ہے میری۔ شام کی چائے پینے کے بعد میں اپنے چھوٹے سے لان میں نظریں ڈالتے ہوئے شاردا سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میں آج لان کو درست کر لوں۔''

''چھٹی کے دن تو آرام کر لیا کریں۔'' وہ بولی۔

''دیکھو بھئی...... مجھے ہے کام کی عادت' مجھے کام سے تھکن نہیں ہوتی بلکہ میں بے کاری میں تھکن محسوس کرنے لگتا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔

”ٹھیک ہے بھئی!“ وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ”جو آپ کا جی چاہے کریں، میں تو ٹی وی دیکھتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، تم جا کر ٹی وی دیکھو اور میں لان کو درست کرتا ہوں۔“

میں نے کہا اور ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ برآمدے کی جانب جانے لگی اور میں نے لان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مجھے کہاں سے کام کا آغاز کرنا چاہیے اور پھر میں نے ایک جگہ کچھ پھول گھاس میں گرے دیکھے وہاں پودوں میں بڑی بے ترتیبی تھی۔

میں نے کچھ اوزار اٹھائے اور ان پودوں کے پاس پہنچ گیا۔ کچھ شاخیں کاٹنے اور تراشنے کے بعد میں نے کچھ پودوں کو جڑ سے اکھاڑ دینا مناسب سمجھا۔ میں نے وہاں سے زمین کھودنا شروع کر دی۔

میں نے کافی کھدائی کر لی اور کچھ پودے لگا کر ایک جانب پھینک دیے۔ پھر مزید کھدائی کرنے لگا۔ اسی وقت مجھے کوئی چمکتی ہوئی چیز نظر آئی۔ میں نے اس پر غور کیا جب کچھ سمجھ نہ آیا تو تھوڑی سی زمین مزید کھود دی۔ وہ ایک خنجر تھا۔ اچانک میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں اس سے کوئی قتل کر کے تو اسے یہاں دفنا تو نہیں گیا؟

میں نے اس خنجر کا مزید جائزہ لیا۔ اس پر کہیں خون لگا ہوا نہیں تھا اس لیے میں کچھ مطمئن ہو گیا لیکن پوری طرح اس لیے مطمئن نہیں ہوا کہ قتل کرنے والا اسے صاف کر کے بھی دفن کر سکتا تھا۔

میں گھر سے باہر کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کر سکتا تھا اور اسے دوبارہ دفن بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگر اس سے واقعی کوئی قتل ہوا تھا تو قاتل مجھ پر الزام لگا سکتا تھا۔ میں نے اس خنجر کو اچھی طرح صاف کیا اور ایک جانب رکھ دیا پھر جلدی جلدی میں اپنا کام نمٹانے لگا۔

”یہ...... خنجر کہاں سے آیا؟“ شاردا نے کہا۔ وہ نہ جانے میرے عقب میں کب آن کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چادر تھی جسے وہ رسی پر پھیلانے آئی تھی۔ ”یہ زمین میں سے نکلا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”زمین میں سے؟“ اس نے کہا اور میرے قریب آ گئی۔ پھر اس نے خنجر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”تو باہر پھینک دو ناں اسے۔“

”نہیں۔ اسے باہر پھینکنا خطرناک ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”خطرناک......؟ وہ کس طرح؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ وہ خاصی سیدھی سادی عورت تھی۔

”یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ میرے بالکل قریب بیٹھ کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے سوچا کہ کہیں کوئی پڑوسی میری آواز نہ سن لے اس لیے آہستگی سے بولا۔ ”یہ یہاں دفن تھا۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس سے کوئی قتل کیا گیا ہو؟“

”ہیں؟“ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”حوصلہ رکھو حوصلہ رکھو۔“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”میں نے یہ نہیں کہا کہ اس سے واقعی قتل کیا گیا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔ ایسے میں اگر ہم یہ خنجر باہر پھینک دیتے ہیں اور یہ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو ہم پکڑے بھی جا سکتے ہیں۔“

”تو پھر کیا کریں؟“ وہ بولی۔ پریشانی اب بھی اس کے چہرے پر موجود تھی۔

”کچھ نہیں۔ میں کل صبح اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور کہیں نالے وغیرہ میں پھینک دوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بلکہ یہ کام میں آج رات میں کسی وقت کر لوں تو بہتر ہوگا۔“

”نہیں نہیں۔ آپ رات میں نہ جانا، اگر کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت بن سکتی ہے، رات کا وقت ہے اس وقت کوئی دیکھ لے تو زیادہ شک کر سکتا ہے۔“ وہ بولی۔

”لو...... اب تم کچھ زیادہ ہی احتیاط کرنے لگی ہو۔“

میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری باتوں سے گھبرا گئی ہے اور مجھے رات میں باہر نہیں جانے دینا چاہتی ہے۔ میں چاہتا تو اس سے یہ بات چھپا بھی سکتا تھا لیکن میں اس سے کوئی بات چھپاتا نہیں ہوں اور ویسے بھی اگر وہ نہ آتی تو میں خود جا کر اسے خنجر کے بارے میں بتاتا۔ میرے ذہن میں تو اس خنجر کے حوالے سے شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے اس لیے میں چاہتا تھا کہ اس بارے میں شاردا کو بھی آگاہ کر دوں تاکہ اگر کوئی بات سامنے آتی ہے تو وہ حالات جانتی ہو۔

”کچھ بھی ہو، آپ رات میں نہیں جائیں گے۔“ وہ بولی۔ ”بچے بھی آج گھر پر نہیں ہیں، آپ چلے جائیں گے تو مجھے ڈر لگے گا۔“ بالآخر اس کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ ہمارے بچے اپنی نانی کے ساتھ آج صبح ان کے گھر پر چلے گئے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں کل ہی اس کا کوئی بندوبست کر لوں گا۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں اس سے کہا۔ ”ویسے تم زیادہ فکر مند نہ ہو، میں نے تو ایک خدشہ ظاہر کیا ہے جب کہ مجھے اپنا خدشہ درست نہیں لگتا کیونکہ اگر اس خنجر سے قتل کیا گیا ہوتا تو اس پر کہیں نہ کہیں خون ضرور لگا ہوتا۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ قاتل نے اسے دھو کر دفنا دیا ہو۔“ وہ بولی۔

”اگر قاتل کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ خنجر کو دھو لے تو وہ اسے کہیں اور لے جا کر پھینک دیتا اور اس سے جان چھڑا لیتا۔“ میں نے ہنستے ہوئے اس کی بات کو مذاق میں اڑانا چاہا لیکن اس کی بات میں وزن تھا۔

”چلیں جو کچھ بھی ہو آپ کل اس سے احتیاط کے ساتھ جان چھڑا لینا۔“ وہ بولی۔

میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ ”ہم لوگ بھی کتنے بے وقوف ہیں۔ ہم نے تو یہ یقین ہی کر لیا ہے کہ اس سے کوئی قتل کیا گیا ہے اور بھئی یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے یہ یہاں رہ گیا ہو یا کسی سے گر گیا ہو اور زمین کے اندر چلا گیا ہو۔“

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے میری بات کو پورے طور پر تسلیم نہیں کیا ہے۔

ذرا دیر میں میں نے اپنا کام ختم کر لیا۔ شاردا میرے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”لو بھئی...... میرا کام تو ہو گیا ختم۔ چلو آؤ اب ٹی وی دیکھتے ہیں۔“

ہم کچن میں آ گئے۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دھونے کے ساتھ ساتھ اسے بھی دھو لیا۔ پھر ہم دونوں لاؤنج میں آ گئے۔ میں نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاردا سے کہا۔ ”تم بیٹھو میں یہ خنجر کمرے میں رکھ کر آتا ہوں۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ وہ بولی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اب بھی خوف زدہ ہے۔

ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ میں نے خنجر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا اور شاردا سے بولا۔ ”چلو آؤ۔“

ہم لاؤنج میں آ کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ شاردا گم صم تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اب تک خنجر کے معاملے میں الجھی ہوئی ہے۔ میں نے اس سے ہنسی مذاق شروع کر دیا تاکہ اس کا ذہن بٹ سکے لیکن میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”بھئی کیا تم خنجر کی وجہ سے پریشان ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

”اوہو...... میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ جو کچھ ہم اس کے بارے میں سوچ رہے ہیں وہ صرف ہمارے خدشات ہیں جب کہ حقیقت یہی ہے کہ وہ عام سا خنجر ہے اور کسی سے گر کر زمین میں چلا گیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

”وہ کیا؟“ میں نے اس کی طرف گہری نظروں سے

دیکھا۔
وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ...... جسے قتل کیا گیا ہو اس کی لاش بھی اسی گھر میں موجود ہو؟''
اس کی بات سے میرے دل کی دھڑکن تو تیز ہوگئی اور میں پریشان بھی ہوگیا لیکن میں نے اپنی کیفیت کو اس سے چھپاتے ہوئے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ ''چھوڑو بھئی...... ہم لوگ بھی واہموں کا شکار ہوتے چلے جارہے ہیں۔''
''لیکن یہ حقیقت بھی تو ہوسکتی ہے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
''نہیں کوئی حقیقت نہیں ہوسکتی۔ یہ سب وہم ہے۔'' میں نے مسکرا کر اس کی بات کو مسترد کردیا۔
''لان کو تھوڑا بہت کھود کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟'' اس نے کہا اور ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔
''ٹھیک ہے' اگر تم چاہتی ہو تو ہم یہ کرلیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''شک تو میرے دل میں بھی پیدا ہوچکا تھا اس لیے میں نے تسلی کرلینا مناسب سمجھا۔''
ہم دونوں اسٹور میں آگئے۔ ہم نے کدال اور بیلچہ اٹھایا اور لان میں آگئے۔
''آہستہ آہستہ کام کرنا' کہیں آواز پڑوس میں نہ چلی جائے۔'' وہ آہستگی کے ساتھ مجھ سے بولی۔
میں نے اثبات میں سر ہلایا اور محتاط انداز میں کدال چلانے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں میں نے سارا لان کھود ڈالا لیکن کہیں سے کوئی لاش یا کوئی اور شے نہیں ملی۔ میں نے مزید وقت لگا کر مٹی برابر کردی۔
کدال اور بیلچہ رکھنے کے بعد میں نے ہاتھ منہ دھویا اور ہم پھر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے شاردا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اب تو ہم لوگوں کو یہ تسلی ہوجانی چاہیے کہ اس خنجر سے کوئی قتل نہیں کیا گیا اور نہ ہی کوئی لاش گھر میں موجود ہے۔''
''یہ تسلی تو کی جاسکتی ہے کہ گھر میں کوئی لاش موجود نہیں لیکن خنجر کے بارے میں حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے کوئی قتل ہوا ہے یا نہیں۔'' شاردا نے کہا۔
''اوہو...... تم تو بالکل پولیس والوں کے انداز میں سوچ رہی ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا چلو کھانا لگاؤ' اتنی محنت کی ہے کہ شدید بھوک لگنے لگی ہے۔''
وہ اٹھ کر چلی گئی اور میں خنجر کے بارے میں غور کرنے لگا۔

☆

رات میں سونے کے لیے بستر پر لیٹے تو میں نے شاردا سے زیادہ بات چیت نہیں کی کیونکہ وہ اب بھی کھوئی کھوئی اور الجھی ہوئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ سو جائے۔
وہ کافی دیر تک جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ میں نے اٹھ کر پانی پیا۔ خنجر پر نظر ڈالی اور ٹہلنے لگا۔ میرا ذہن اب بھی خنجر میں الجھا ہوا تھا۔
کچھ دیر بعد اچانک میری نظر خنجر پر پڑی تو میں چونک کر رک گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے دیکھا تھا کہ خنجر پر سرخ سیال لگا ہوا ہے۔ میں نے تیزی سے بڑھ کر خنجر اٹھایا اور میرے دل کی دھڑکن یہ دیکھ کر مزید اضافہ ہوگیا کہ خنجر پر خون لگا ہوا ہے جس کا قطرہ قطرہ زمین پر ٹپک رہا تھا۔
میں نے بے اختیار شاردا کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ جاگ تو نہیں رہی؟ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے خنجر کا بغور جائزہ لیا۔ خون اب بھی اس سے ٹپک رہا تھا۔
یہ سب کیا ہے؟ آخر ایسا کیوں ہورہا ہے؟ خنجر کی حقیقت کیا ہے؟ ایسے بے شمار سوالات ذہن میں آنے کی وجہ سے میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ میں نے سر تھام لیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔
''کیا بات ہے...... آپ کیوں جاگ رہے ہیں؟'' شاردا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے چونک کر سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھنے لگا۔ میں خنجر اور اس کے درمیان آجانا چاہتا تھا تاکہ اس کی نظر خنجر پر نہ پڑے۔ میں نے اس سے کہا۔
''بس ویسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔''
وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''آپ کے ذہن پر خنجر والا معاملہ چھایا ہوا ہے؟''
''ہاں...... دراصل میں اسے پھینکنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب ایک ترکیب ذہن میں آگئی ہے اور میں پرسکون ہوں' چلو اب سو جاتے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''میں ذرا واش روم ہو آؤں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
میں مزید پریشان ہوگیا کیونکہ میں اسے واش روم جانے سے تو نہیں روک سکتا تھا اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ ضرور خنجر کی طرف بھی دیکھے گی۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ جب وہ خنجر پر خون لگا دیکھے گی تو بہت پریشان ہو جائے گی اس لیے میں اسے مطمئن کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔
وہ بیڈ سے اتر آئی اور میری توقع کے مطابق اس نے خنجر کی طرف دیکھا اور اسی وقت میری نظر بھی خنجر پر پڑی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ خنجر پر اب خون نہیں تھا اور وہ بالکل صاف اور چمکدار تھا۔
وہ اٹیچڈ باتھ روم میں گئی تو میں تیزی سے خنجر کے پاس گیا اس کا جائزہ لیا اور واپس بیڈ پر آکر بیٹھ گیا۔
چند منٹ بعد شاردا واپس آگئی۔ اس نے میرے ساتھ بیٹھنے کے بعد میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور تسلی آمیز انداز میں بولی۔ ''اب آرام سے لیٹ جائیں اور بے فکر ہو جائیں۔ آپ نے اس سے چھٹکارے کی ترکیب تو سوچ ہی لی ہے۔ اب بے فکر ہوکر سو جائیں۔''
ہم دونوں لیٹ گئے اور پھر کچھ دیر خنجر سے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ بے خبر سو گئی۔ میں اس دوران کئی بار خنجر پر نظر ڈال چکا تھا' اس وقت اس پر خون نہیں لگا ہوا تھا لیکن اب ایک بار پھر اس پر خون نظر آرہا تھا اور قطرہ قطرہ کرکے زمین پر گر رہا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟
میں ایک بار پھر اٹھ کر خنجر کے پاس آگیا۔ ابھی میں اس کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ میں نے چونک کر شاردا کی طرف دیکھا' وہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں تیزی سے دروازے کے قریب آگیا اور آہستگی سے کنڈی کھولنے کے بعد کمرے سے باہر آکر تیز تیز قدموں سے گھر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔
''کون ہے؟'' میں نے دروازے پر پہنچ کر پوچھا۔
''میں ہوں آپ کا پڑوسی گوپال!'' جواب آیا۔
گوپال سے میں مل چکا تھا۔ وہ ایک فوٹوگرافر تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ گوپال کے ساتھ ساتھ چند پولیس والوں کو بھی وہاں دیکھ کر میں گھبرا گیا اس سے پہلے کہ میں ان سے کچھ کہتا انسپکٹر نے گوپال کی طرف دیکھ کر میری طرف اپنی چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی ہے وہ آدمی؟''
''نہیں...... یہ تو نہیں ہے۔'' گوپال نے جواب دیا۔
''وہ بھی اندر ہی ہوگا۔'' انسپکٹر نے کہا۔
''کس کی بات کررہے ہیں آپ لوگ؟'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔
''مسٹر! کیا نام ہے تمہارا؟'' انسپکٹر نے چھڑی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔
''رمیش!'' میں نے جواب دیا۔
''اس کا مطلب ہے کہ تم نئے آئے ہو اس گھر میں؟'' وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔
''جی ہاں' مگر مسئلہ کیا ہے؟''
''وہ کالا آدمی کون ہے تمہارا جس نے قتل کیا ہے؟'' وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔
''جی......؟'' میں بھونچکا رہ گیا۔

"بتاؤ کون ہے وہ اور کہاں ہے؟" اس نے اپنی چھڑی میرے سینے میں چبھوتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

"یہاں...... یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے میرے اور میری بیوی کے علاوہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں کوئی بھی نہیں ہے ہمارے علاوہ۔" میرے عقب سے شاردا کی آواز آئی' وہ نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔

"چلو تلاشی لو گھر کی۔" انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا اور چھڑی سے میرے کاندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ "چلو ہٹو ایک طرف۔"

وہ سب گھر میں آ گئے۔ دو سپاہیوں نے مجھے اور شاردا کو نشانے پر لے رکھا تھا باقی لوگ ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔

کچھ دیر بعد انسپکٹر وہی خنجر لیے ہمارے پاس آ گیا اور وہ مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ خنجر تو مل گیا ہے مسٹر! اب لاش اور قاتل بھی مل جائیں گے۔ ویسے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ سب کچھ صاف صاف بتا دو؟"

"کیا بتا دوں؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے بھئی جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے بے زاری سے کہا پھر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "لے چلو بھئی ان لوگوں کو تھانے' یہ وہیں چل کر سب کچھ بتائیں گے۔"

ہمیں تھانے میں لا کر لاک اپ کر دیا گیا۔ انسپکٹر نے ہم سے کہا۔ "دیکھو بھئی تمہارے پڑوسی گوپال نے تم دونوں کو قتل کرتے نہیں دیکھا لیکن تمہارے اس کالے ساتھی کو ضرور دیکھا ہے۔ تم لوگ سب کچھ صاف صاف بتا کر اپنے لیے کچھ گنجائش پیدا کر سکتے ہو' اگر تم لوگ اس قتل میں ملوث ہو تو وہ تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا' میرے پاس کئی طریقے ہیں پوچھنے کے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اگر تم لوگ قتل میں ملوث نہیں ہو اور اس کالے آدمی نے تم لوگوں کی مرضی کے خلاف ایسا کیا ہے تو تم لوگ بچ سکتے ہو۔ میرا وچن ہے کہ میں تم لوگوں سے پورا پورا تعاون کروں گا...... کیا کہتے ہو تم لوگ؟"

"دیکھیں انسپکٹر صاحب! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارے کسی ساتھی نے کوئی قتل نہیں کیا۔"

"اچھا......؟" اس نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "تو پھر وہ خنجر کہاں سے آ گیا؟ اس پر خون لگا ہے۔"

"وہ تو ہمیں لان میں کھدائی کے دوران ملا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"لان کی کھدائی تو صبح ہو گی۔ ابھی تو میں نے تمہارا گھر بند کروا دیا ہے' وہاں سے وہ لاش بھی مل جائے گی جسے قتل کیا گیا ہے لیکن قاتل کے بارے میں تم بتاؤ گے۔" انسپکٹر نے چھڑی میرے سینے پر مارتے ہوئے کہا۔

میں نے بے زار ہو کر ایک گہرا سانس لیا۔

"اب یہ بتاؤ کہ بغیر کسی دباؤ کے بتاؤ گے یا مجھے دباؤ ڈالنا پڑے گا؟" انسپکٹر بولا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ تحقیقات کروائیں' کسی بھی قسم کا دباؤ ڈالنے سے ہم لوگ کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔ ہم شریف لوگ ہیں' کوئی جرائم پیشہ نہیں ہیں کہ اس طرح قتل کرتے پھریں گے۔" میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔ "اور یہ بھی بھول لیں کہ آئی جی صاحب میرے دوست ہیں' میں ان سے بات کروں گا' سب کچھ سامنے آ جائے گا اور آپ کی شکایت بھی کروں گا کہ آپ تحقیقات کرنے کے بجائے ہمیں قاتل ٹھہرا رہے ہیں۔"

میری باتوں کا انسپکٹر پر کچھ اثر ہوا۔ اس کے چہرے پر موجود کرختگی غائب ہو گئی اور وہاں الجھن نظر آنے لگی۔ وہ بولا۔ "کیا تم درست کہہ رہے ہو کہ تم آئی جی صاحب کو جانتے ہو؟"

"جانتے نہیں...... میں ان کا دوست ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ چاہیں تو ان سے میری بات کروا دیں۔"

انسپکٹر مزید سنبھل کر بولا۔ "تو پھر یہ خنجر کا کیا چکر ہے؟ آپ کے پڑوسی گوپال کا کہنا ہے کہ اس نے دبی دبی سی آوازیں سن کر آپ کے گھر میں جھانکا تو وہاں آپ کے لان میں ایک کالا آدمی کسی کو قتل کر رہا تھا' آخر وہ آدمی کون ہے۔ تم...... تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ؟"

"ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔

اس نے بے قراری سے گہرا سانس لے کر کہا۔ "اگر تم لوگ اس کے بارے میں نہیں جانتے ہو تو پھر تمہارے گھر میں اتنا بڑا سانحہ کیسے ہو گیا؟ چلو اگر تمہارے کمرے سے خون آلود خنجر نہ برآمد ہوتا تو میں یہ مان لیتا کہ اس قاتل نے تمہاری بے خبری میں کسی کو قتل کیا ہے لیکن آلۂ قتل تو تمہارے کمرے سے برآمد ہوا ہے؟"

"میں نے بتایا ناں کہ وہ ہمیں لان میں کھدائی کے دوران ملا تھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن...... اس پر تو تازہ خون لگا ہوا ہے؟"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ خون تو اس پر بار بار ظاہر اور غائب ہوتا رہا ہے' وہ اس بات کو کسی صورت میں تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا۔ "بھئی آپ آئی جی صاحب سے میری بات کروا دیں۔"

"آئی جی صاحب؟" اس نے پریشانی سے اپنا گال کھجایا۔ "تم کیا کہو گے ان سے؟"

"جو سچ ہے وہ ان سے کہہ دوں گا۔"

"لیکن وہ خنجر؟" وہ زچ ہو کر بولا۔

"ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔"

"اوہو۔" اس نے پریشان ہو کر اپنی چھڑی اپنے ہاتھ پر مارنا شروع کر دی اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "بھئی میں اس معاملے میں آئی جی صاحب کو انوالو نہیں کرنا چاہتا...... یہ میرے علاقے کا کیس ہے اور میں نے ہی اسے حل کرنا ہے۔"

"تو پھر آپ طریقے سے کریں اسے حل ورنہ میں آپ کی شکایت کر دوں گا تاکہ آپ اس کیس میں اپنی ذہانت کی بجائے اپنی طاقت کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے اسے تڑی لگائی۔

"اچھا' مجھے سوچنے دو۔" وہ ایک بار پھر چھڑی ہاتھ پر مارتے ہوئے سوچنے لگا۔ پھر میری طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "جو کچھ تم نے کہا ہے وہ واقعی سچ ہے؟"

"بالکل سچ۔"

"لیکن...... وہ خنجر پر خون؟" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس پر تو کوئی خون تھا ہی نہیں۔" شاردا نے انسپکٹر سے کہا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ شاردا کی حالت بہتر ہو گئی تھی اور وہ بولنے لگی تھی ورنہ اس سے پہلے تو وہ بالکل گم صم تھی۔

"لو...... انہوں نے وہ خون ہی نہیں دیکھا۔ خنجر تو دیکھا تھا ناں آپ نے؟" انسپکٹر نے اس سے کہا۔

"جی ہاں۔"

"تو پھر اس پر خون نہیں دیکھا؟"

"خون تھا ہی نہیں اس پر۔"

"افوہ!" انسپکٹر جھنجلایا۔ "اتنا سارا خون لگا ہوا تھا اس پر اور آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ نے اس پر خون ہی نہیں دیکھا؟"

"اس پر تو کوئی خون نہیں تھا۔" وہ بولی۔

"اچھا!" انسپکٹر نے جل کر کہا اور قریب کھڑے ایک سپاہی سے بولا۔ "چندر! تم جا کر خنجر لاؤ۔"

سپاہی سیلوٹ کر کے تیزی سے ایک جانب چلا گیا اور ذرا دیر بعد اس نے خنجر لا کر انسپکٹر کو دیتے ہوئے کہا۔ "سر! اس پر تو خون ہے ہی نہیں؟"

"کیا......؟" انسپکٹر نے خنجر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو...... اس پر سے خون کہاں گیا......؟"

"اب کیا کہتے ہو انسپکٹر صاحب!" میں نے کہا تو اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آخر یہ چکر کیا ہے؟"

"سر! اجازت دیں تو کچھ عرض کروں؟" سپاہی چندر نے انسپکٹر سے کہا۔
"ہاں کہو؟" انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
"سر! یہ کوئی اور معاملہ لگتا ہے۔"
"اور معاملہ......؟" انسپکٹر نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں؟"
"سر! یہ کوئی جنتر منتر کا معاملہ لگتا ہے۔"
"جنتر منتر کا معاملہ؟"
"جی ہاں سر! میں تمام معاملے کا بہ غور جائزہ لیتا رہا ہوں سر! آپ کو تو معلوم ہے کہ میرے پتاجی ایسے معاملات میں رہے ہیں اسی لیے مجھے جادوئی اور ماورائی معاملات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایسا ہی معاملہ لگتا ہے اب یہی دیکھ لیں ناں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس خنجر پر خون لگا ہوا تھا اور اب نہیں ہے۔"
انسپکٹر گال کھجاتے ہوئے سوچنے لگا پھر چھڑی لہرا کر اس سے بولا۔ "تم آؤ میرے ساتھ۔"
"یہ سب کیا ہے؟" شاردا نے پریشان لہجے میں مجھ سے پوچھا۔
"پتا نہیں۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا ہے' ویسے مجھے اس سپاہی چندر کی بات درست لگتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"اس خنجر پر تو خون تھا ہی نہیں۔" وہ بولی۔
میں نے اسے بتایا کہ جب وہ سو رہی تھی تو میں نے کئی بار اس پر خون ظاہر اور غائب ہوتے دیکھا تھا۔
"واقعی...... یہ تو کوئی ماورائی معاملہ ہی ہے؟"
تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک سپاہی ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے لاک اپ کھولا اور ہم سے بولا۔ "آؤ بھئی تم لوگوں کو انسپکٹر صاحب نے بلایا ہے۔"
ہم اس کے ساتھ انسپکٹر کے کمرے میں آ گئے۔ وہاں ایک عمر رسیدہ شخص بھی بیٹھا تھا۔ اس کا حلیہ سادھوؤں جیسا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھیں سفید اور کالی تھیں جب کہ اس کے سر کے بال لمبے لمبے تھے اور اس نے کالا چوغا پہن رکھا تھا۔ اس کے گلے میں چھوٹے بڑے موتیوں کی مالائیں لٹک رہی تھیں۔ اس کا رنگ سانولا اور صحت اچھی تھی۔ اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے اور شاردا کو دیکھا۔ "بیٹھ جاؤ بھئی تم لوگ!" اس نے ایک جانب موجود کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم سے کہا۔
"اب آپ جلد از جلد اس مسئلے کا حل نکالیں۔" انسپکٹر نے سادھو سے کہا۔
"کرتے ہیں بھئی کچھ۔" سادھو نے کہا اور اپنے ہاتھ میں موجود مالا کے موتی گھمانے لگا۔ "لاش ہے اس کمرے میں۔" اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر کہا تو انسپکٹر جیسے چونک کر بولا۔
"کیا......؟ لاش ہے وہاں؟"
"ہاں۔" سادھو نے اثبات میں سر ہلایا۔
"کس کی؟"
"یہ وہ لاش خود ہی بتائے گی۔"
"خود بتائے گی؟" انسپکٹر پھر چونک کر بولا۔
"ہاں...... ہمیں وہاں چلنا ہوگا۔"
"ٹھیک ہے چلیں۔"
ہم لوگ ایک بار پھر اپنے گھر آ گئے۔ سادھو نے لاش کے سات چکر لگائے اور ہمارے پاس آ کر شاردا سے بولا۔ "اے ناری! تم تو چلی جاؤ' تم اس لاش کو نہیں دیکھ پاؤ گی۔"
"کہاں جاؤں؟" شاردا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔"
"اسے یہیں رہنے دو۔" سادھو نے کہا۔
"تم اپنی امی کے گھر جاؤ اور کسی کو یہاں آنے مت دینا۔" میں نے شاردا سے کہا پھر انسپکٹر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "انسپکٹر صاحب! آپ اگر کسی سپاہی کے ساتھ اسے بھجوا دیں تو مہربانی ہوگی۔"
انسپکٹر نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ شاردا کو گاڑی میں

چھوڑ آئے۔ وہ سپاہی شاردا کو لے کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے شاردا بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ سادھو' انسپکٹر اور میں نے اسے خوب تسلیاں دی تھیں۔
"انسپکٹر! اب چلو...... اندر کہیں کمرے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ میں نے ایک منتر پڑھ دیا ہے' کچھ دیر بعد وہ لاش خود ہمارے پاس آ کر ہمیں اپنے بارے میں بتائے گی۔" سادھو نے انسپکٹر سے کہا۔ اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ کہتا میں نے ان لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔
"آیئے ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"
ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر اور سپاہی پریشان دکھائی دے رہے تھے' میں بھی پریشان تھا لیکن سادھو بالکل بے فکر تھا۔
ذرا دیر بعد باہر آہٹیں سنائی دیں۔ سب چوکنا ہو گئے۔ سادھو نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "وہ آ رہی ہے۔"
انسپکٹر نے تھوک نگلا۔ میں یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ خوف زدہ تھا یا پریشان۔
ذرا دیر بعد ڈرائنگ روم کے دروازے سے ایک لاش چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس پر مٹی لگی ہوئی تھی' آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں' گردن کٹی ہوئی تھی اور خون اس کے کپڑوں پر لگا ہوا تھا۔
"کون ہو تم بھئی؟" سادھو نے اس سے یوں اطمینان سے پوچھا جیسے کسی زندہ انسان سے بات کر رہا ہو۔
"راجیش ورما نے مجھے مارا تھا۔" لاش نے خرخراتی آواز میں جواب دیا۔
"راجیش ورما......! اس کے بارے میں میں سن چکا ہوں' وہ کافی عرصہ پہلے یہاں رہ کر گیا ہے' اس وقت ہم لوگ یہاں نہیں رہتے تھے' اس کے بارے میں یہ سنا ہے کہ بڑا خطرناک آدمی تھا' نہ جانے کن کن جرائم میں ملوث تھا' پھر گھر بیچ کر یہاں سے چلا گیا تھا۔" گوپال نے انسپکٹر اور سادھو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیوں مارا تھا اس نے تمہیں؟" سادھو نے لاش سے کہا۔
"میرا دوست تھا وہ۔ ہم نے ایک جگہ سے رقم لوٹی تھی۔ اس نے ساری رقم پر قبضہ کرنے کے لیے مجھے مار ڈالا۔" لاش نے جواب دیا۔
سادھو نے زیر لب کچھ پڑھ کر اس لاش پر پھونکا تو وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گئی۔ سادھو نے انسپکٹر سے کہا۔ "انسپکٹر! اس لاش کو شمشان گھاٹ بھجوا دو تا کہ اس کا کریا کرم ہو جائے ورنہ یہ بے چین رہے گی۔"
"ٹھیک ہے لیکن...... وہ خنجر کا کیا چکر تھا؟ اس پر خون کیوں آ رہا تھا؟" انسپکٹر نے اس سے کہا۔
"یہ اس آتما کی بے چینی تھی۔ بے قرار آتما تو اور بہت کچھ کر سکتی تھی ابھی تو بات صرف خون پر خنجر تک ہی کی تھی' اس کے بعد آتما خود لوگوں کو تنگ کرتی اور پھر اس کے بعد یہ لاش بھی باہر آ جاتی۔ دراصل جب کسی کو مار کر اس طرح دفنا دیا جائے یا کہیں پھینک دیا جائے تو اس پر شیطانی مخلوق کا قبضہ ہونے لگتا ہے' اس پر بھی ایک شیطانی مخلوق اثر انداز ہو رہی تھی' وہ تو اچھا ہوا کہ یہ معاملہ جلد ہی نمٹ گیا۔" سادھو نے کہا۔
"لیکن...... وہ راجیش ورما اب نہ جانے کہاں ہوگا؟ کیا اس سلسلے میں آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟" انسپکٹر نے سادھو سے کہا۔ سادھو مسکرا کر بولا۔
"مجرموں کو تلاش کرنا تمہارا کام ہے ہمارا نہیں۔"
انسپکٹر جھینپ گیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
"آئی ایم سوری مسٹر رمیش! آپ کو ہماری وجہ سے زحمت اٹھانا پڑی۔"
"سوری کی ضرورت نہیں انسپکٹر صاحب! بس میں تم سے یہ درخواست کروں گا کہ تم ایسے کسی بھی معاملے میں طاقت کے بجائے ذہانت سے کام لیا کرو۔"
میری بات پر انسپکٹر ایک بار پھر جھینپ گیا اور سادھو مسکرانے لگا۔

☆☆☆



قاتل

ایس فاروق

وہ اسے دیکھ کر حیرانگی کے ساتھ ساتھ خوف زدہ بھی ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے ایک سال قبل موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ جسے وہ موت کی نیند سلا چکا تھا اب وہ بھی اسے موت سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کرنے والا تھا...... وہ اس سے انتقاماً اس کا جسم لینے آیا تھا......ایک پراسرار کہانی۔ اگر ایسا بھی ہونے لگے تو؟

اس نے اپنے قاتل سے اپنے لیے اس کا جسم حاصل کر لیا تھا۔ عجیب انتقامی کہانی

راجیش پر نظر پڑتے ہی میں ٹھٹک گیا' میں سناٹے میں آ گیا تھا کیوں کہ اُسے مرے ہوئے تو تقریباً ایک سال ہو چکا تھا لیکن اب وہ پھر میرے سامنے زندہ موجود تھا۔ وہ مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر ایک پھل فروش کی دکان کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اُس نے میری طرف قدم بڑھا دیئے۔ میں بوکھلا گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور پھر انسانی فطرت کے مطابق میرے ذہن نے تیزی سے میرے دماغ میں سوچتے ہوئے مجھے مشورہ دیا کہ میں دوڑ پڑوں اور اگلے ہی پل' میں نے تیزی سے دائیں جانب دوڑنا شروع کر دیا ساتھ ہی میں گردن موڑ موڑ کر راجیش کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ بھی میری جانب دوڑنے لگا تھا۔

میرے اور اس کے درمیان فاصلہ ذرا کم ہو گیا تو میں نے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا اور اس فاصلے کو بڑھانا شروع کر دیا اور پھر اچانک ہی میں ایک تپلی گلی میں مڑ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس گلی سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ اس میں آگے جا کر کچھ دیواریں اس طرح سے ٹوٹی ہوئی تھیں کہ میں ان پر چڑھ کر گھروں کی چھتوں سے ہوتا ہوا دوسری گلی میں اُتر سکتا تھا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا' راجیش گلی میں داخل ہو رہا تھا لیکن میں ٹوٹی ہوئی دیواروں تک پہنچ چکا تھا۔ میں آناً فاناً ان میں سے ایک دیوار پر چڑھ گیا اور پھر پھرتی سے دوسری دیوار پر آنے کے بعد ایک گھر کی چھت پر آ گیا۔ اب میں نے مڑ کر نہیں دیکھا اور تیزی سے کئی گھروں کی چھتوں پر دوڑتا ہوا دوسری گلی میں کود گیا۔ میں نے تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ خیال تھا کہ اگر میں راجیش کی نظروں میں آئے بغیر اس گلی سے نکل گیا تو پھر میں آگے چھوٹی بڑی گلیوں میں دوڑنے کے بعد اُس سے محفوظ ہو سکتا ہوں۔

میں نے اپنی سوچ کے مطابق کئی چھوٹی بڑی گلیاں عبور کر لیں۔ اس دوران میں مڑ مڑ کر دیکھتا بھی جا رہا تھا اور یہ میرے لیے اطمینان کی بات تھی کہ راجیش کہیں

پیچھے رہ گیا تھا اور اب مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔

میں ایک چھوٹے ہوٹل کے اندر داخل ہوگیا۔ یہاں اِدھر اُدھر میزوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ جس طرح ہوٹل چھوٹا تھا اسی طرح یہاں بیٹھے ہوئے لوگ بھی نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

میں ایک میز پر آکر کرسی گھسیٹنے کے بعد بیٹھ گیا۔ میرے اوپر اب بھی انتہا سوار تھی۔ میں اس بات پر کچھ مطمئن تھا کہ راجیش دن کے وقت اور لوگوں کے ہجوم میں مجھے نظر آیا تھا' کہیں اگر وہ مجھے رات میں یا کسی ویرانے میں نظر آجاتا تو یہ ممکن تھا کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوجاتا۔

میں اب بھی ہوٹل کے دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا۔ جیسے کسی بھی وقت راجیش وہاں سے اندر داخل ہوجائے گا۔

"جی بابو جی!...... کیا لاؤں؟" بیرے نے میرے پاس آکر کہا تو میں چونک اٹھا۔ دراصل میں نے اُسے اپنی طرف آتے نہیں دیکھا تھا۔

"ہاں...... وہ...... ایک چائے لے آؤ۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی لایا بابو جی!" وہ کہہ کر چلا گیا۔

میں نے ایک بار پھر ہوٹل کے دروازے کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا۔ مجھے راجیش کی طرف سے کچھ بے فکری تو ہوتی جارہی تھی لیکن بہرحال ابھی میں اس کی طرف سے پوری طرح بے فکر نہیں تھا۔

بیرے نے چائے لاکر میرے سامنے رکھ دی اور میں نے چائے کی طرف توجہ کی لیکن کپ اٹھانے کے بعد پھر بے اختیار میری نظریں ہوٹل کے دروازے کی طرف چلی گئیں۔

تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا لیکن راجیش نہیں آیا تو مجھے کافی تسلی ہوگئی اور اب میرا دماغ صحیح طور پر کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تھا۔

"وہ آخر زندہ کیسے ہوگیا ہے؟" میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ راجیش نہ ہو بلکہ اس سے ملتا جلتا کوئی اور شخص ہو لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ میری طرف بھاگا کیوں تھا؟ اگر وہ آرام سے کھڑا رہتا تو شاید میں یہی سمجھتا کہ وہ راجیش کا ہم شکل ہوگا لیکن اس نے میرا تعاقب کرکے مجھے پریشان' خوف زدہ اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔

میں نے چائے کے پیسے ادا کیے اور کھنکھارتا ہوا ہوٹل کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ خوف اب بھی کافی حد تک مجھ پر غالب تھا۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ میں باہر ہی نہ جاؤں لیکن یہ میرا گھر نہیں تھا جہاں میں اپنی اس خواہش کو پورا کرسکتا۔ آدھا گھنٹہ میں ہوٹل میں گزار چکا تھا اور اس دوران تین چائے پی چکا تھا۔ مجھ میں مزید چائے پینے کی سکت نہیں تھی اور یہ کھانے کا وقت نہیں تھا کہ میں کھانا کھانے کے بہانے یہیں بیٹھا رہتا اور پھر میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں آخر کب تک یہاں بیٹھا رہوں گا' بس ایسا کچھ ہی سوچتے ہوئے میں اٹھا تھا۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے میں نے تیزی سے اِدھر اُدھر نزدیک اور دور تک نظریں ڈالیں' راجیش کہیں نہیں تھا' میں مزید مطمئن ہوکر ایک جانب چل پڑا لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا اس لیے اِدھر اُدھر راجیش کی تلاش میں نظریں ڈال رہا تھا۔

میں بس اسٹاپ پر آکر کھڑا ہوگیا۔ یہاں بہت سے لوگ کھڑے تھے' کچھ لوگ اپنی اپنی مطلوبہ بسوں میں چڑھ رہے تھے اور کچھ ان سے اُتر رہے تھے۔ سڑک پر پورے زور شور کے ساتھ ٹریفک رواں دواں تھا۔ میری نظریں آتی ہوئی بسوں پر تھیں لیکن ان میں مجھے اپنی مطلوبہ بس نظر نہیں آرہی تھی۔

اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا تو میرا دل

اچھل کر حلق میں آگیا۔ مجھ پر خوف کا شدید حملہ ہوا لیکن میں نے خود کو سنبھالا اور مڑ کر دیکھا۔ راجیش کھڑا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکل رہی ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا۔

"میں ہنگامہ نہیں چاہتا اس لیے میری کوشش تھی کہ میں کہیں تم سے آرام سے بات کرلوں لیکن تم دوڑتے پھر رہے ہو۔ بہرحال......" اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "آؤ۔ وہاں بیٹھ کر بات کرلیتے ہیں۔"

"تم...... زندہ...... کیسے؟" میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔

"آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں زندہ کیسے ہوگیا ہوں۔ حوصلہ رکھو۔ جب تم میرا قتل کرواسکتے ہو تو پھر ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھو۔ آؤ...... وہاں میرے ساتھ۔" اُس کا لہجہ تحکمانہ ہوگیا تھا۔

میں یہ تو جان گیا تھا کہ میں اُس سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا اس لیے اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں سڑک پر پیر رکھتے ہوئے فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔ میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" وہ بولا۔

"کہاں؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"جہاں بھی میں لے جاؤں۔" "تم مجھے قتل کروا چکے ہو۔ اب یہ حق تو میں بھی رکھتا ہوں کہ تمہیں مار ڈالوں لیکن میں اپنا یہ حق استعمال نہیں کررہا ہوں بلکہ تم سے صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو۔"

"لیکن تم یہ تو بتادو کہ آخر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو!" میں نے کہا۔

"دیکھو!" وہ غرایا۔ "میں تم سے آرام سے بات اس لیے کررہا ہوں کہ میں نہیں چاہتا کہ یہاں لوگوں کے بیچ میں ہنگامہ کروں' یہ میرا اور تمہارا معاملہ ہے' اس میں' میں دوسروں کو ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ اگر تم نے گڑبڑ کی تو میں سختی کروں گا' اور بہرحال میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو' میں تمہیں قتل نہیں کروں گا۔ میں تمہیں وچن دیتا ہوں کہ میں تمہیں قتل نہیں کروں گا لیکن اگر تم نے میرے ساتھ جانے میں گڑبڑ کی تو پھر میں تمہیں یہیں قتل کردوں گا۔ میں مرچکا ہوں' مجھے نہ تو پولیس پکڑ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اور بہتر ہے کہ تم خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔"

میں نے سوچا کہ اُس کے ساتھ خاموشی سے چلنے سے بہتر ہے کہ میں اپنے بچاؤ کے لیے جو کچھ ہوسکتا ہے کروں کیوں کہ وہ یہ بتانے پر راضی نہیں تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جانا چاہتا ہے اور مجھے یہ خدشہ تھا کہ وہ مجھے جہاں بھی لے جانا چاہتا ہے وہاں لے جاکر وہ مجھے مار ڈالے گا۔

میں نے اس کے پاس سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔

"بولو...... کیا کہتے ہو؟...... میرے ساتھ چل رہے ہو یا زور زبردستی کرکے لے جاؤں تمہیں؟" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے' میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ لیکن......"

میں اتنا کہہ کر تیزی سے اٹھا اور ایک جانب دوڑ لگادی۔

کافی دور دوڑنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ راجیش مجھ سے ذرا فاصلے پر ہی دوڑ رہا تھا۔ میں نے مزید طاقت لگا کر اپنی رفتار میں اضافہ کیا۔

اچانک میں نے اُسے گرتے ہوئے دیکھا۔ میں رکا نہیں لیکن مڑ مڑ کر اُسے دیکھتا رہا۔ وہ گرنے کے بعد پھر اٹھا نہیں تھا اور بے حس و حرکت لگتا تھا۔

میں دوڑتا رہا' اُس وقت تک جب تک کہ میرے اندر ہمت رہی اور جب میری ہمت ختم ہوگئی تو میں رُک گیا۔ اب مجھ میں ایک قدم اٹھانے کی بھی ہمت نہیں' میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا' دل بے حد تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ان تمام کیفیات کے علاوہ ایک اور کیفیت بھی مجھ پر اثر انداز تھی اور وہ تھی خوف کی کیفیت کوئی زندہ آدمی میرے پیچھے لگا ہوتا تو میں بالکل خوف

زدہ نہ ہوتا لیکن یہاں معاملہ کچھ اور تھا' ایک مرا ہوا شخص میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ آدمی جسے میں نے قتل کر دیا تھا۔

ذرا حالت سنبھلی تو میں چل پڑا۔ میرا رُخ اپنے گرو جی کے ٹھکانے کی طرف تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں گرو جی کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ دونوں ہاتھ جوڑے آلتی پالتی مارے ہوئے تھے اور زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ میں ایک جانب بیٹھ گیا۔ اب مجھے خاصی بے فکری تھی کیوں کہ اب گرو جی میرے سامنے تھے اور وہ راجیش جیسے کسی بھی معاملے کو بخوبی سنبھال سکتے تھے۔

کچھ دیر بعد گرو جی نے ہاتھ اپنے زانو پر رکھتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔

"ابھی تو بچ آئے۔ آگے مشکل ہو سکتی ہے۔"

"جی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں...... وہ راجیش لگا ہوا تھا ناں تمہارے پیچھے؟" وہ بولے۔

"جی' جی ہاں گرو جی!" میں نے جواب دیا۔

"اُسے ہم نے ہی روک لیا تھا۔"

"اوہ۔" میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ "گرو جی!...... مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری موت آ گئی ہے۔ وہ تو مجھے کہیں لے جانا چاہتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے جہاں بھی لے جاتا' مار دیتا۔"

"ہوں۔" انہوں نے پُرخیال انداز میں ہنکارہ بھرا۔ "اُس کے ارادے تو بہت خطرناک تھے' بہرحال...... فی الحال تو بات ٹل گئی ہے لیکن...... آگے معاملہ خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"گرو جی!...... کیا آپ مجھے کچھ وضاحت کے ساتھ بتانا پسند کریں گے!" میں نے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے سامنے ایک خطرناک آدمی آ گیا ہے اور اس کا نام ہے باوا پردیپ۔"

"کیا؟" میں اُچھل پڑا۔ "باوا پردیپ؟" میں جانتا تھا کہ گرو جی جس گیانی سے کچھ ڈرتے تھے' وہ باوا پردیپ ہی تھا۔

گرو جی نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "ہاں...... وہ کیا چاہتا ہے یہ تو ہم نہیں جان سکتے کیوں کہ ہمارا علم اس کے سامنے کمزور پڑ جاتا ہے لیکن اس نے جس طرح راجیش کو تمہارے پاس بھیجا اور راجیش نے تمہیں لے جانا چاہا اس سے لگتا ہے کہ ان لوگوں کے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں۔"

"لیکن گرو جی آخر یہ راجیش آ کہاں سے گیا۔ اسے تو ہم لوگوں نے قتل کر دیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہی تو ہم بھی پریشان ہیں بالک کہ آخر وہ واپس کیسے آ گیا۔ اور پھر باوا پردیپ تک وہ کیسے پہنچ گیا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ مرا نہیں تھا' ہم لوگوں نے اسے مرا ہوا تصور کیا تھا لیکن بعد میں وہ کسی طرح ٹھیک ہو گیا اور اس نے باوا پردیپ سے رابطہ کر لیا۔" اور باوا پردیپ نے اُسے تحفظ دے دیا۔ انہوں نے سوچتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن گرو جی اب تو آپ کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ ورنہ باوا پردیپ تو ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔" میں نے ان سے کہا۔

انہوں نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو اُس کا کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔" انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "بہرحال...... پہلے ہم باوا پردیپ سے بات کرتے ہیں کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے' ممکن ہے کہ اسی طرح بات بن جائے۔"

"بالکل بالکل۔" میں نے کی ان تائید کی۔ "آپ

بات کریں ان سے ہو سکتا ہے جو کچھ ہوا ہے وہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہو۔"

"وہ کھوپڑی اٹھا کر ہمارے پاس لے آؤ۔" انہوں نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اشارہ کیا۔

میں اٹھا اور ایک کونے میں پڑے لوہے کے چھوٹے سے صندوق پر رکھی انسانی کھوپڑی اٹھا کر گرو جی کے حوالے کر دی۔ انہوں نے اُسے اپنے سامنے رکھ لیا۔ میں گرو جی سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ گرو جی نے کھوپڑی کی طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ زیرِ لب کچھ بڑبڑانا بھی شروع کر دیا۔ پھر انہوں نے کھوپڑی پر ایک پھونک ماری۔ اپنی دائیں جانب رکھے ایک گول آئینے کو اٹھانے کے بعد وہ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

میں ایک جانب کھسک آیا تاکہ آئینے میں نظر آنے والے منظر کو دیکھ سکوں۔

گرو جی نے زیرِ لب کچھ پڑھنے کے بعد آئینے پر بھی ایک پھونک ماری اور پھر لگاتار دو تین پھونکیں ماریں اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ذرا دیر بعد آئینے میں ایک منظر نظر آنے لگا جو غیر واضح تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ واضح ہو گیا۔ باوا پردیپ کسی درخت کے نیچے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس کے آس پاس جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دو انسانی کھوپڑیاں' انگیٹھی' ہڈیاں' چراغ اور دیگر بہت سی چیزیں پڑی تھیں۔

"باوا پردیپ آخر تم کیا چاہتے ہو؟" گرو جی نے اس سے سوال کیا۔

"باوا پردیپ نے نظر اُٹھا کر دیکھا اور بولا۔ "اچھا تو تم نے مجھ سے رابطہ کر ہی لیا؟"

"وہ تو کرنا ہی تھا۔ جب تم ہماری جان کے دشمن بن جاؤ گے تو ہم تم سے رابطہ تو کریں گے ناں؟" گرو جی بولے۔

"ہاں ہاں۔" باوا پردیپ نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "اچھا بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

"یہی تو ہم تم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم کیا چاہتے ہو۔ کیوں ہمارے چیلے کو پریشان کیا تم نے؟" گرو جی بولے۔

"ہم نے کب پریشان کیا ہے کسی کو؟" باوا پردیپ نے قدرے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"تم نے راجیش کو کیوں اس کے پیچھے لگایا؟"

"میں نے کب لگایا؟ وہ تو خود اس کے پیچھے لگا تھا۔ مجھے تو یہ پتہ چلا تھا کہ تمہارے چیلے آدیش نے اُسے قتل کر دیا تھا۔ اب یہ ان دونوں کا معاملہ ہے' بہتر یہی ہے کہ میں اور تم اس معاملے سے الگ رہیں۔" اس نے کہا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی بڑے موتیوں کی مالا کے موتی گھمانے لگا۔

"دیکھو باوا!...... جو چاہتے ہو وہ صاف صاف بتا دو۔ میں نہیں چاہتا ہوں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کچھ بدمزگی ہو۔" گرو جی نے کہا۔

باوا پردیپ دھیرے سے ہنسا۔ "دیکھو بھئی! میں تو بدمزگی سے نہیں ڈرتا ہوں۔ اگر تم بدمزگی کرنا چاہتے ہو تو کر کے دیکھ لو۔"

"میں نہیں چاہتا۔" گرو جی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے لگتا ہے کہ تم ایسا چاہتے ہو۔"

"نہیں بھائی نہیں۔" باوا پردیپ نے نفی میں ہاتھ ہلایا۔ "میں ایسا نہیں چاہتا میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ آدیش اور راجیش کا معاملہ ہے انہی پر چھوڑ دو۔"

"لیکن تم تو راجیش کو تحفظ دے رہے ہو پھر بھلا یہ آدیش اور راجیش کا معاملہ کہاں رہا؟" گرو جی نے دلیل دی۔

"اس طرح تو تم بھی آدیش کو تحفظ دے رہے ہو؟" باوا پردیپ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"وہ میرا چیلا ہے۔"

”تو تم راجیش کو بھی میرا چیلا ہی سمجھ لو۔ اب حساب برابر ہوگیا۔ اب ان دونوں کو ان کا معاملہ نمٹانے دو۔ میں اور تم اس معاملے سے دور رہتے ہیں اور دیکھ لو کہ میں تو دور ہوں' ڈیرہ دون آیا ہوا تھا ایک کام سے اور اب یہاں ہمالیہ کے علاقے میں بیٹھا ہوں' میں تو دور ہوں اس معاملے سے تم بھی دور ہو جاؤ۔“

”تم دور نہیں ہو۔ تم ہمالیہ ہی میں کیا افریقہ میں بھی بیٹھے ہو تو کیا فرق پڑتا ہے' تم تو پلک جھپکتے میں واپس آسکتے ہو۔“

”اچھا چلو یونہی سہی۔“ باوا پردیپ نے بے نیازی سے کہا۔ ”لیکن میں اس معاملے سے دور تو ہوں ناں؟ تم بھی دور رہنا معاملے میں ٹانگ اڑاؤ گے تو میں بھی مجبوراً اپنے چیلے کے لیے جو کچھ ہوسکے گا کروں گا۔ اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ معاملے کو کس طرف لے جاتے ہو۔“

”میں اس معاملے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔“ گروجی نے باوا کو کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میرے چیلے کو پریشان نہ کیا جائے۔“

باوا پردیپ نے طنزیہ طور پر ہنسنے کے بعد کہا۔ ”واہ بھئی واہ!...... جب تم نے اور تمہارے چیلے نے ہمارے چیلے کو قتل کر ڈالا تھا تو اس وقت تم نے ایسی باتیں نہ سوچیں اور اب کہہ رہے ہو کہ تمہارے چیلے کو پریشان نہ کیا جائے۔“ وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ”دیکھو رنجیت!...... اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو میں تمہیں واضح طور پر کہتا ہوں کہ اس معاملے سے الگ ہو جاؤ۔ ان دونوں کو آپس میں نمٹ لینے دو اور اگر تم نے اپنے چیلے کو تحفظ دیا تو میں اس کے ساتھ ساتھ تمہارا بھی بُرا حشر کروں گا۔“ اس کے چہرے پر نفرت کے بھرپور تاثرات آچکے تھے۔ اس نے زور سے ہاتھ ہلایا اور آئینے میں سے وہ سارا منظر غائب ہوگیا۔

گروجی کے چہرے پر تفکرات تھے۔ ان کی نگاہیں آئینے پر تھیں لیکن سوچیں نہ جانے کہاں کی تھیں۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور آئینہ ایک جانب رکھ دیا اور فضاء میں گھورتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

”گروجی!...... مجھے کوئی شکتی دے دیں اور یہ معاملہ مجھ پر ہی چھوڑ دیں۔“ میں نے کہا تو انہوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ میرے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے بھویں سکیڑیں اور بولے۔

”یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں اس طرح تنہا چھوڑ سکتا ہوں؟“

”گروجی!...... میں یہ تو نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں' میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے کوئی شکتی دے دیں۔ اگر آپ کوئی شکتی دے دیں گے تو میں بھلا تنہا کہاں رہوں گا! آپ میرے ساتھ ہوں یا آپ کی شکتی' ایک ہی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں نہیں۔“ انہوں نے نفی میں گردن جھٹکی۔ ”یہ نہیں ہوسکتا۔ جبھی تو تم سے اتنا پیار کرتا ہوں کہ ہر وقت تم پر نظر رکھتا ہوں۔ اس وجہ سے تم راجیش سے بچ بھی گئے تھے کیوں کہ جب وہ تمہارے تعاقب میں لگا تھا تو مجھے پتہ چل گیا تھا اور میں نے اُس سے تمہیں بچانے کے لیے کارروائی شروع کردی تھی' بالآخر اس سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ بہر حال...... تم فکر نہ کرو میں کچھ نہ کچھ سوچتا ہوں۔“ وہ ایک گہرا سانس لینے کے بعد سر جھٹک کر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

میں پریشان تھا کہ یہ کیسی مصیبت آن کھڑی ہوئی ہے۔ باوا پردیپ راجیش کی سرپرستی پر آمادہ تھا اور گروجی کو بھی باوا پردیپ نے پریشان کرکے رکھ دیا تھا۔

گروجی نے سر اٹھایا اور گردن گھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے مخاطب ہوئے۔ ”تم بے فکر رہو' میں نے باوا پردیپ سے مقابلے کا سوچ لیا ہے۔“

”اوہ!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ”گروجی!...... یہ تو بہت خطرناک ہوگا۔“

”ہاں...... خطرناک تو ہوگا لیکن معاملہ کچھ اتنا پیچیدہ ہو چکا ہے کہ باوا پردیپ سے مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔“ وہ بولے۔

”کیا مقابلہ کرنے کے علاوہ کوئی صورت نہیں نکل سکتی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا کیوں کہ اس طرح وہ آسانی سے اپنا مقصد پورا کرلیں گے اور پھر مجھے یہ بھی خطرہ ہے کہ باوا پردیپ ویسے تو کہہ رہا ہے کہ میں اس معاملے سے دور ہو جاؤں تو وہ بھی دور رہے گا لیکن میرے لاتعلق ہو جانے کے باوجود وہ اپنے چیلے کی پورے طور سرپرستی کرے گا اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا لہٰذا اس معاملے سے میرے دور ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تو پھر آپ کیا کریں گے گروجی؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ باوا پردیپ سے کس طرح مقابلہ کرلیں گے۔“

”یہ مقابلہ آج رات قبرستان میں ہوگا۔“ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”گروجی!...... کیا اس مقابلے میں ہمارے بچنے کے کچھ امکانات ہیں؟“ میرا اگلا سوال تھا۔

”ہاں ہاں۔“ وہ بولے۔ ”جب انسان اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کا سوچ لے تو اس کی کامیابی کے امکانات تو خود بخود پیدا ہوں جاتے ہیں۔“

”یہ بات تو ٹھیک ہے گروجی لیکن...... کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہے کہ ہمیں اپنا سب کچھ داؤ پر نہ لگانا پڑے؟“

”نہیں...... میں نے بہت سوچا لیکن مجھے ایسی کوئی صورتِ حال نظر نہیں آئی' بس اس وقت سب سے بہتر یہی ہے کہ ہم باوا پردیپ کی طرف سے کسی حملے سے پہلے اُس پر حملہ کردیں۔“

”ٹھیک ہے گروجی جیسی آپ کی مرضی۔“

☆

رات کا ایک بجنے والا تھا۔ میں اور گروجی قبرستان کے اندر داخل ہوگئے۔ چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نکلا ہوا تھا جس کی روشنی میں سامنے ہر طرف قبریں ہی قبریں نظر آرہی تھیں جن کے اُوپر صلیبیں لگی ہوئی تھیں۔

”اس طرف آجاؤ بالک!“ گروجی نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم ایک قبر کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ گروجی نے مجھ سے کہا۔

”یہ ایک بڑے عامل ڈاکٹر پروفیسر آئزک کی قبر ہے۔ آج جو میں نے عمل کرنا ہے' اس کی وجہ سے ڈاکٹر آئزک کی لاش قبر سے باہر آئے گی اور میں اُسے ہی ہتھیار بنا کر باوا پردیپ کا مقابلہ کروں گا۔“

”اس دوران کیا مجھے بھی کچھ کرنا ہوگا گروجی؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں ایک مخصوص دائرے کے اندر رہنا ہے' چاہے کچھ بھی ہو جائے تم اس دائرے سے مت نکلنا' ہاں جب میں کہوں تو نکل آنا اور جو کچھ میں کہوں وہ کرتے رہنا۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”بہتر ہے گروجی!“

گروجی قریب ہی زمین پر جھک گئے اور بولے۔ ”دیکھو' میں چونے کی مدد سے دائرے کی نشاندہی کر رہا ہوں۔“ انہوں نے ایک تھیلے میں سے چونا نکال کر زمین پر ڈالنا شروع کردیا۔ ہم لوگ کافی سامان ساتھ لے کر آئے تھے۔

”لو بھئی!...... اب اس دائرہ میں آجاؤ۔“ گروجی نے دائرہ مکمل کرنے کے بعد سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

میں دائرے کے اندر آگیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ تم یہیں رہو' اب میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔“ وہ دائرے سے باہر جا کر آئزک کی قبر کے سرہانے کھڑے ہوگئے اور انہوں نے بڑبڑانا شروع کردیا۔

اسی وقت کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

گروجی نے جھک کر اپنے دونوں ہاتھ قبر پر رکھ دیئے اور قبر پر زوردار پھونک ماری۔ پھر سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ایک تھیلے سے ٹین کا ایک چھوٹا ڈبہ نکال لیا۔

ذرا ہی دیر بعد آنزک کی قبر میں جنبش پیدا ہو گئی۔ اس کی مٹی اِدھر اُدھر ہٹنے لگی اور پھر آہستہ آہستہ آنزک قبر سے باہر آنے لگا وہ مٹی میں لوٹا ہوا تھا۔ گروجی نے اس پر اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈبے میں سے سفید سفوف نکال کر پھینکا۔ آنزک کسی درندے کی طرح غرایا اور پوری طرح قبر سے باہر آنے کے بعد ایک جانب کھڑا ہو گیا۔

گروجی زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ہاتھ جوڑ کر بڑبڑانے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ جھوم بھی رہے تھے۔

انہوں نے کچھ دیر اپنا عمل جاری رکھا اور پھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے گردن موڑ کر میری طرف اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''آدیش!...... باوا پردیپ کی طرف سے اب کچھ بھی ہو سکتا ہے اس لیے گھبرانا نہیں۔''

''بہتر ہے گروجی!'' میں نے کہا۔

انہوں نے آنزک کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اپنا دایاں بازو اس کی طرف پھیلا دیا۔ کچھ بڑبڑا کر اس پر پھونک مارنے کے بعد انہوں نے اپنا بازو واپس لٹکا دیا۔

چند لمحوں بعد ایک طرف سے مجھے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں یہ سمجھا کہ وہ کچھ آوارہ کتے ہوں گے لیکن جب میں نے بلا ارادہ ان کی تلاش میں نگاہیں دائیں جانب ڈالیں، کیوں کہ ان کی آوازیں اس طرف سے آئی تھیں تو مجھے کتوں کا ایک بڑا لشکر اُس طرف سے آتا دکھائی دیا۔ کم سے کم وہ تین چار سو کی تعداد میں تھے اور ان میں سے کئی ایک قبروں پر سے چھلانگیں لگاتے ہوئے بھی آ رہے تھے۔ اتنے زیادہ کتوں کو دیکھ کر مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے یہ بھی سوچا کہ شاید وہ باوا پردیپ کی طرف سے بھیجے گئے ہوں۔

کتے ہمارے پاس آنے کے بعد ہمارے اطراف میں پھیل گئے۔ ان میں سے کئی غرا رہے تھے اور کئی بھونک رہے تھے۔

اچانک آنزک کی لاش نے ایک زوردار چیخ ماری جس سے کتے بدک کر واپس بھاگے اور پھر وہ غائب ہو گئے۔ ان کی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں۔ خاموشی چھا چکی تھی اور پھر کسی جھینگر کی آواز آنے لگی۔

ذرا ہی دیر بعد آنزک کی لاش نے اپنے دونوں بازو دائیں اور بائیں جانب پھیلا دیئے اور ہلکی سی چیخ مارنے کے بعد بازو واپس لٹکائے اس وقت میرے آس پاس کی قبروں میں حرکت پیدا ہو گئی۔ ان کی مٹی اِدھر اُدھر ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان قبروں میں سے مردے نکل آئے۔ وہ سب درندوں کی طرح غرا رہے تھے اور پھر وہ اس طرح غراتے ہوئے ایک جانب فضاء میں اڑتے ہوئے جانے لگے لیکن وہ پلٹے اور جس طرح ہوا میں تیرتے ہوئے اٹھے تھے اس طرح واپس آ کر زمین پر دھڑا دھڑ گرنے لگے اور پھر وہ واپس قبروں میں جانے لگے۔

آنزک کی لاش نے اپنے دونوں بازو سامنے کی طرف پھیلا دیئے۔ اس میں سے آگ نکلی اور فضاء میں ایک جانب چلی گئی اور ذرا ہی دیر بعد میری نظروں سے اُوجھل ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہ آگ بھی واپس آئی اور اُس نے آنزک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آنزک بری طرح غرانے لگا۔ یہاں تک کہ آگ نے اُسے بھسم کر کے رکھ دیا۔

گروجی جلدی سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کرنے کے بعد انہوں نے ہاتھ جوڑے اور بڑبڑانے لگے۔

ایک آدھ منٹ ہی گزرا تھا کہ قبرستان کے دروازے کی طرف سے مجھے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ دور ہونے کی وجہ سے میں اُس کے خدوخال نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جب وہ نزدیک آیا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کیوں کہ وہ باوا پردیپ تھا۔

گروجی اب بھی اپنے عمل میں مصروف تھے۔ باوا پردیپ گروجی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''بس بھئی رنجیت! اب تمہارا زور ختم ہو گیا ہے۔''

گروجی نے آنکھیں کھول کر اُس کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''اگر تمہارے بس میں ہوتا تو تم ایسا کر چکے ہوتے۔ تم نے جس لاش سے کام لینا چاہا میں نے اُسے اُس کی کوششوں سمیت ختم کر دیا۔ اب میں تمہارے اس چیلے کو لے جا رہا ہوں، تم جو کر سکتے ہو کر لو۔''

''نہیں...... تم اسے نہیں لے جا سکتے۔'' گروجی جلدی سے بولے۔

''روک سکتے ہو تو روک لو۔'' باوا پردیپ نے بے نیازی سے کہا اور میری طرف آنے لگا۔

گروجی دوڑ کر میرے اور باوا پردیپ کے درمیان آ گئے اور باوا پردیپ سے گرج کر بولے۔ ''تم...... تم اس تک نہیں جا سکتے۔''

باوا پردیپ نے گروجی کو ایک زوردار دھکا دیا۔ گروجی دور زمین پر جا گرے۔ باوا پردیپ مجھ تک آ گیا۔ اُس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا بازو کسی آہنی شکنجے میں آ گیا ہے۔ اُس نے مجھے کھینچا، میں جوان تھا جب کہ وہ بوڑھا تھا لیکن میں اُس کے ساتھ اس طرح کھنچتا چلا گیا جیسے کوئی پہلوان کسی ننھے بچے کو کھینچنے لگا۔ میں خود کو روکنے کے لیے پورا پورا زور لگا رہا تھا لیکن میری یہ ساری کوشش بے سود ثابت ہو رہی تھی۔

گروجی اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے اور اب ہماری طرف آ رہے تھے۔ باوا پردیپ نے کچھ بڑبڑا کر اُن کی طرف پھونک ماری تو انہیں ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر زمین پر گر پڑے۔

باوا پردیپ مجھے تیزی سے کھینچتا لے جا رہا تھا۔

گروجی ایک بار پھر اُٹھے اور ہماری طرف آئے لیکن باوا پردیپ نے انہیں پھر پھونک مار کر گرا دیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور ہم قبرستان سے باہر آ گئے۔ گروجی اب بھی ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

باوا پردیپ نے رُکتے ہوئے کہا۔ ''رُکو!...... میں تمہارا پکا بندوبست کرتا ہوں۔'' اس نے ایک ہاتھ گروجی کی طرف پھیلا دیا اور بڑبڑانے کے بعد ایک زوردار پھونک ان کی طرف ماری گروجی کو شدید جھٹکا لگا، انہوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ وہ فوراً زمین پر نہیں گرے بلکہ کچھ اُوپر فضا میں گئے اور پھر بڑے زور سے زمین پر گرے۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نادیدہ قوت نے انہیں اٹھا کر پٹخا ہے، ان کے گرنے سے ایک زوردار دھماکا ہوا تھا اور ساتھ ہی ان کی دل دوز چیخ بھی ابھری تھی اور پھر وہ وہیں لیٹے لیٹے کراہنے لگے۔

باوا پردیپ نے ایک جھٹکے سے میرا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ ''چلو...... اب کئی گھنٹے تک تمہارا گرو اُٹھ نہیں سکے گا۔''

''تت...... تم...... مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' میں نے اُس سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں اس وقت تیزی سے چل رہے تھے۔

''یہ تمہیں ابھی ذرا ہی دیر میں پتہ چل جائے گا۔'' وہ بولا۔ اس کا لہجہ سخت اور نفرت سے بھرا ہوا تھا۔

اچانک ایک جانب سے ایک کار آئی اور پاس رُک گئی۔ اُس کی ڈرائیونگ سیٹ پر راجیش کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔

باوا پردیپ نے مجھے اس کار کی پچھلی نشست پر بٹھا دیا اور خود میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ راجیش نے کار چلائی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم شہر سے باہر آ گئے۔ اس وقت ہماری کار ہائی وے پر دوڑ رہی تھی اور پھر راجیش نے کار کی رفتار آہستہ کر کے اُسے کچے علاقے میں اُتار لیا۔

گاڑی کچھ دیر کچے راستے پر چلتی رہی اور پھر ہم ایک کچی چار دیواری کے پاس آ گئے۔ اس چار دیواری میں ایک بڑا چوبی دروازہ نصب تھا۔

"یہ...... یہ تم لوگ مجھے کہاں لے آئے ہو؟" میں نے باوا پردیپ سے اب بھی ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اُس وقت راجیش کا ہاتھ گھوما اور اُس نے ایک زور دار تھپڑ میرے چہرے پر رسید کیا جس کی وجہ سے میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔ اُس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم کسی بے گناہ اور معصوم شخص کی طرح ہم سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہو جب کہ تم خود جانتے ہو کہ تم ایک سفاک قاتل ہو۔ تم نے مجھے قتل کیا ہے۔"

"مجھے شما کر دو۔ میں تم سے بنتی کرتا ہوں کہ مجھے شما کر دو۔" میں نے التجائیں شروع کر دیں۔

راجیش نے مجھے دھکا دیا اور باوا پردیپ مجھے گھسیٹنے لگا۔ یوں ہم تینوں چوبی دروازے تک آ گئے۔ راجیش نے اس دروازے کو آہستہ آہستہ دھکیلنا شروع کیا۔ دروازہ خوفناک چرچراہٹ کے ساتھ کھلنے لگا۔ مجھے اندر کا منظر نظر آنے لگا۔ ایک وسیع صحن تھا جس کے آخر میں ایک چبوترہ نظر آ رہا تھا اور اُس چبوترے پر ایک بُت ایستادہ تھا۔

ہم دروازہ عبور کر کے اندر آ گئے۔ صحن کے اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے اور ان کے آگے برآمدہ تھا۔

باوا پردیپ مجھے گھسیٹتا ہوا بت کے سامنے لے آیا اور اُس نے مجھے وہاں پٹخ دیا۔ تکلیف کی وجہ سے میں کراہ اٹھا خوف مجھ پر سوار تھا۔ اس لیے نیچے گرنے کی وجہ سے مجھے جو تکلیف ہوئی تھی اُسے میں نے نظر انداز کر دیا اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی' اُسی وقت راجیش نے ایک زور دار لات میرے پہلو پر ماری اور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا چبوترے سے جا ٹکرایا لیکن پھر بھی میں نے خود کو سنبھال لیا اور چبوترے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

راجیش پے در پے تلے قدم اٹھاتا میرے مد مقابل آن کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے ہاتھ پہلوؤں پر ٹکا دیئے۔ وہ نہایت غور سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ "مجھے تمہارا جسم چاہیے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں...... یہ جو جسم ہے ناں۔" اُس نے میرے سینے میں انگلی چبھوئی۔ "یہ مجھے چاہیے۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ...... میں اس جسم کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔" اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن...... میرا جسم تم کیسے استعمال کر سکو گے۔" میں نے مزید پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے استعمال ہوگا' یہ میں جانتا ہوں۔" راجیش کی بجائے باوا پردیپ نے جواب دیا اور وہ بھی میرے قریب آ گیا۔ اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "تم نے ہی اسے قتل کروایا تھا ناں؟"

"ہاں لیکن...... وہ......"

اُس نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے سختی سے کہا۔ "بس بس...... اب تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم ایک قاتل ہو اور قاتل کی سزا موت ہوتی ہے اور تمہیں بھی موت کی سزا دی جائے گی۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "مم...... مجھے شما کر دو۔"

راجیش کا ایک زناٹے دار تھپڑ پھر میرے چہرے سے ٹکرایا۔ وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ "خاموش!...... تمہیں یاد ہے کہ میں نے بھی تم سے بہت التجائیں کی تھیں کہ میری جان بخش دو لیکن تم...... تم تو ساوتری کے لیے دیوانے ہو گئے تھے جب کہ تم جانتے تھے کہ ساوتری مجھ سے پیار کرتی ہے اور میں اُسے چاہتا ہوں۔ تم نے اُسے حاصل کرنے کے لیے سفاکانہ قدم اٹھایا' مجھے اپنے گرو کے ساتھ مل کر قتل کروا ڈالا اور پھر...... تم نے ساوتری کو اپنانے کی کوشش کی' اس نے تمہیں مسترد کر دیا تو تم نے اس کا بلادکار کرنے کے بعد اُسے بھی مار ڈالا۔ میں...... میں تم سے پورا پورا انتقام لوں گا۔"

"نہیں نہیں...... میں تم سے بنتی کرتا ہوں کہ مجھے شما کر دو۔ تم جو بولو گے' میں کروں گا۔" میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے اُس سے التجا کی۔

"نہیں۔" وہ جذباتی انداز میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ "اب تم کچھ نہیں کرو گے' اب مجھے جو کرنا ہے وہ میں کروں گا۔"

"باوا جی!" میں نے باوا پردیپ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میری جان بخش دی جائے۔"

"خاموش رہو۔" اُس نے مجھے جھڑک دیا' پھر گردن موڑ کر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بس اب تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ کچھ ہی دیر بعد تم اس کا جسم حاصل کر لو گے۔"

نن نہیں...... نہیں...... ایسا مت کرو' تم لوگ جو کہو گے میں کروں گا' میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میں تمہیں دے دوں گا' میری جان مت لو' میں...... میں زندہ رہنا چاہتا ہوں' میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔" میں التجائیں کرنے لگا۔

باوا پردیپ نے آگے بڑھ کر زور سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "زندہ رہنا چاہتے ہو ناں؟...... ٹھیک ہے...... میں تمہیں زندہ رہنے کا موقع دوں گا۔"

"تت تمہارا' بہت بہت شکریہ!" میں نے جلدی سے کہا۔

"لیکن۔" وہ بولا۔ "تم ہماری مرضی کے مطابق زندہ رہو گے۔"

"تمہاری مرضی کے مطابق؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" اُس نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا۔ "ہماری مرضی کے مطابق۔"

"لیکن وہ کیسے؟" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔" وہ بولا پھر اُس نے زیرِ لب کچھ بڑبڑا کر مجھ پر پھونک ماری۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بجلی سی میری رگوں میں اترتی چلی گئی ہے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میری زبان مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اور پھر گھبرا کر میں نے حرکت کرنا چاہی تو میں حرکت بھی نہیں کر سکا۔

باوا پردیپ نے میرے دونوں بازو گرفت میں لے لیے اور مجھے کسی ہلکی پھلکی چیز کی طرح اٹھا کر چبوترے پر ڈال دیا۔ اب میں بت کے بالکل نیچے آ گیا تھا۔

باوا پردیپ بھی چبوترے پر چڑھ آیا۔ اُس نے راجیش کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم ادھر بیٹھ جاؤ۔"

راجیش چبوترے پر چڑھنے کے بعد بت کے دائیں جانب بیٹھ گیا۔

"میں ذرا اس کے لیے بھی بندوبست کر دوں پھر اس کے بعد تمہیں اس کا جسم دلاتا ہوں۔" باوا پردیپ نے راجیش سے کہا اور زیرِ لب کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکنے کے بعد چبوترے سے اُتر کر دائیں جانب چلا گیا۔ برآمدہ عبور کرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک آدمی جھول رہا تھا۔ جب وہ نزدیک آیا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ کوئی انتہائی بوڑھا آدمی ہے۔ باوا پردیپ نے اُسے بھی ایک جانب چبوترے پر لٹا دیا اور خود میرے قریب بیٹھ گیا۔ اُس نے زیرِ لب کچھ پڑھا اور میرے چہرے پر پھونک ماری۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے شدید تکلیف ہونے لگی اور پھر مجھ پر غنودگی چھانے لگی بالآخر میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو اپنا حلیہ دیکھ کر صدمے کی وجہ

سے جیسے میرے دل پر جیسے گھونسہ لگا کیوں کہ میرا جسم تبدیل ہو چکا تھا۔ اب میں وہ بوڑھا تھا جسے باوا پردیپ کمرے سے اٹھا کر لایا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظریں ڈالیں۔ میں چبوترے ہی پر پڑا ہوا تھا۔ باوا پردیپ اور راجیش کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں چبوترے سے نیچے اترا تو مجھے خاصی نقاہت محسوس ہوئی، ساتھ ہی مجھے بڑی طرح کھانسی بھی آ گئی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور عمارت کے بیرونی دروازے کی جانب چل پڑا۔

ابھی میں نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک کمرے میں سے باوا پردیپ نکل آیا، اُس کے ساتھ یقیناً راجیش ہی تھا جو اس وقت میرا جسم استعمال کر رہا تھا۔

وہ دونوں میرے قریب آ کھڑے ہوئے۔ باوا پردیپ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور بولا۔

”دیکھو!...... میں تمہارے زندہ رہنے کی خواہش پوری کروں۔ اب تم زندہ رہو گے لیکن اس بوڑھے جسم کے ساتھ...... بہر حال...... یہ جسم اس سے تو بہتر ہے کہ تمہاری آتما بھٹکتی پھرتی...... جاؤ اور اب جسم کے ساتھ زندہ رہو۔“

”ٹھیک ہے، جیسی تم لوگوں کی مرضی۔“ میں نے بلغمی آواز اور شکستہ لہجے میں کہا اور چل پڑا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جب ہم عمارت کے بیرونی دروازے کے قریب آئے تو میری نظر وہاں ایک جانب موجود راجیش کی لاش پر پڑی اس کا پیٹ ادھڑا ہوا تھا اور دونوں ٹانگوں کا گوشت غائب تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، باوا پردیپ نے مجھ سے کہا۔

”ہم نے اسے یہاں اس لیے ڈال دیا تھا کہ اگر ہمارے جانے کے بعد تم ہوش میں آؤ تو جاتے ہوئے اسے دیکھ لو۔ دراصل راجیش کی بھٹکتی ہوئی آتما، مجھ تک آن پہنچی تھی۔ اس نے مجھ سے بنتی کی کہ میں اُسے کوئی جسم دلا دوں۔ میں نے اپنے علم سے اُس کے جسم کا پتہ لگایا تو اس کا یہ حشر تھا۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے راجیش کی لاش کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”اس کی لاش تو اس قابل نہیں تھی کہ میں عمل کے ذریعے اس میں اس کی آتما داخل کر دیتا تو یہ اس جسم کے ساتھ زندگی گزار سکتا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ تمہارا جسم استعمال کیا جائے کیوں کہ تم نے ہی اسے مارا تھا، میں نے راجیش کی آتما کو بتا دیا کہ میں کیا چاہتا ہوں، پھر میں نے اسے تمہیں لانے کے لیے بھیجا لیکن رنجیت نے اسے اپنے عمل کے ذریعے سڑک پر گرا دیا اور تم رنجیب تک پہنچ گئے اور پھر جو ہوا وہ تو تم جانتے ہو۔ بہر حال۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”ہم نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی اور اب تم جہاں چاہو جا سکتے ہو اور ہاں ایک بات ضرور کہوں گا کہ تمہیں اس جسم سے دنیا کا کوئی عامل رہائی نہیں دلا سکتا۔“ اس نے راجیش کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”چلو بھئی!...... اب تو تمہیں ایک تندرست اور اچھا جسم مل گیا ہے، اب تم آرام سے جیون گزار سکتے ہو۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ باوا پردیپ۔“ راجیش بولا۔

”ارے چھوڑو ان باتوں کو، چلو یار!“ باوا پردیپ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا اور وہ دونوں چل پڑے۔ قدم تو میں نے بھی اٹھا دیئے تھے لیکن میرے اندر اتنی سکت نہیں تھی کہ میں ان کی طرح تیز تیز چل سکوں۔

میں دروازے سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں کافی دور جا رہے تھے۔ میں اپنی مدھم رفتار سے چلتا رہا لیکن ایک بار پھر مجھے کھانسی کا دورہ پڑا اور میں بڑی طرح کھانسنے لگا۔

ذرا دیر بعد طبیعت سنبھلی تو میں پھر چل پڑا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب جو جسم میرے زیرِ استعمال ہے، اُس میں نہ جانے کتنی بیماریاں ہوں گی جنہیں میں نے جیون بھر جھیلنا ہے۔

☆☆☆



محبت

شہاب شیخ

اس شخص کا افسانہ محبت جو ایک بار محبت کی مار کھا چکا تھا اور پھر دوبارہ کھانے کا متحمل نہیں تھا لیکن بھلا ہو اس آتما کا جس نے اس شخص کے دل میں محبت کی شمع کو دوبارہ روشن کیا۔ جو عرصہ قبل مکمل ہوتے ہوئے بھی بجھ چکی تھی۔ محبت کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے دو دلوں کی کتھا۔

محبت ہو گئی ہے کسی مہربان کو کسی نامہرباں سے

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھاری بھرکم وجود میرے سینے پر سوار ہے۔ ذرا ہی دیر میں میرا دم گھٹنے لگا اور جب سانس لینا دشوار ہو گیا تو میں ہڑ بڑا گیا اور اس ہڑبڑاہٹ میں میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے بھاری بھرکم وجود کو نیند میں ہی اپنے اُوپر محسوس نہیں کیا تھا بلکہ اب آنکھ کھل جانے پر بھی میں اُسے اپنے اُوپر محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

بے اختیار میں اُسے اپنے اُوپر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے ہاتھوں نے اُس وجود کو محسوس کیا اور پھر وہ میرے اُوپر سے ہٹ گیا لیکن ساتھ ہی فرش پر دھم سے آواز بھی آئی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ فرش پر گر گیا ہو۔

پھر قدموں کی آواز آئی اور کھڑکی پر لٹکتا ریشمی پردہ اس طرح ایک جانب ہٹ گیا اور باہر برآمدے میں قدموں کی آواز آنے لگی جو لحہ بہ لحہ معدوم ہوتی جا رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے کوئی دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔

چند ساعتوں بعد مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں نے اپنے حواس کو سنبھالا اور تیزی سے اُٹھ کر کھڑکی پر آ گیا اور پردہ ہٹا کر باہر برآمدے میں جھانکا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

میں واپس آ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیوار گیر کھڑکی کی طرف دیکھا جو تین بجا رہی تھی۔

میں نے قریب ہی موجود ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس پر رکھا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھا لیا اور ایک سگریٹ سلگا کر اپنے ساتھ گزر جانے والے واقعے کے بارے میں سوچنے لگا جو صرف حیرت ناک ہی نہیں بلکہ دہشت ناک بھی تھا۔ میں ایک مضبوط اعصاب کا مالک تھا اس لیے اس واقعے کو جھیل گیا تھا۔ میری جگہ کوئی عام یا کمزور اعصاب کا شخص ہوتا تو شاید چیخ پکار مچا دیتا اور گھر سے باہر نکل کر بھاگتا۔

میں نے اس واقع پر غور کرنا شروع کیا۔ میں نے سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب میری آنکھ کھلی تھی تو میں فوراً پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا اور نیم غنودگی میں کسی وجود کو اپنے اُوپر محسوس کرتا رہا؟ لیکن میرے ذہن نے جواب دیا کہ نہیں، میں غنودگی میں نہیں بلکہ مکمل طور پر ہوش وحواس میں تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ وہ سب میرا وہم تو نہیں تھا۔ میرے ذہن نے جواب دیا کہ نہیں، وہ وہم بھی نہیں تھا اور مزید کچھ سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ

گیا کہ وہ سب حقیقت تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ اس گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔

میں یہاں تقریباً پانچ سال سے رہ رہا تھا۔ آج تک یہاں ایسا کوئی انہونا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔

میں اس دنیا میں اکیلا تھا۔ اس وقت میں تقریباً چالیس برس کا تھا۔ جب میں بیس برس کا تھا تو والد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا اور اس کے دو سال بعد ماں جی بھی چل بسی تھیں۔

پتا جی کی طرف سے مجھے ایک گھر ملا تھا جو غریب علاقے میں تھا۔ میں نے انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی۔ بچپن ہی سے مجھے میوزک کا شوق تھا اور میں نے یہ فن بڑی دل جمی کے ساتھ سیکھا تھا اس لیے اس کو پروفیشن بنالیا۔ میں آرگن پلیئر کے طور پر اپنی خدمات انجام دیتا تھا لیکن چوں کہ میرا زیادہ رجحان آرگن بجانے کی طرف تھا۔ لہٰذا اسی حوالے سے مشہور ہوگیا تھا۔ میں اب تک کئی گلوکاروں کے لیے اچھی دھنیں ترتیب دے چکا تھا۔ میں نے کافی دولت کمالی تھی اور اپنا مکان فروخت کرنے کے بعد میں نے ممبئی کے ایک اچھے علاقے میں فلیٹ خرید لیا تھا۔

میں نے پچیس سال کی عمر میں ایک شادی بھی کی تھی جو صرف چھ ماہ چل سکی اس لڑکی کا نام سمیرا تھا جس سے میں نے شادی کی تھی' میں اُس کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا لیکن شادی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جو کسی ایک کی ہوکر نہیں رہ سکتیں۔ میں نے اُسے اُس کے ایک بوائے فرینڈ کا ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ لیا تھا' جس کے بعد اُسے اپنے ساتھ رکھنا میرے لیے ناممکن تھا اس لیے میں نے اُسے طلاق دے دی۔ اس کے بعد سے عورت ذات کی طرف سے ایسا دل ٹوٹا کہ کسی سے پھر دل نہ لگایا' البتہ جسمانی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بوقتِ ضرورت جسم حاصل کرلیتا تھا' ان جسموں سے مجھے محبت نہ ہوتی تھی۔ اپنی ضرورت پوری ہوجانے کے بعد میں انہیں بھول جاتا تھا۔

میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میں نے وہ کھڑکی کھولی جو گھر سے باہر کی جانب کھلتی تھی۔ باہر ہر طرف اندھیرے کا راج تھا اور کہیں سے کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔

میں کچھ دیر کھڑکی ہی میں کھڑا رہا' پھر پلٹا اور میز کی طرف آیا۔ وہاں موجود ایش ٹرے میں' میں نے اپنا سگریٹ دبا کر بجھادیا اور ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا۔ ابھی صرف سوا تین بجے تھے اور صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ جلدی سے صبح ہوجائے' اس کے باوجود کہ میں مضبوط اعصاب کا مالک تھا' ابھی ساتھ پیش آنے والے پراسرار واقعے سے گھبرایا ہوا تھا' رات اور تنہائی اس گھبراہٹ کی زیادتی کا سبب تھیں' مجھے یقین تھا کہ دن کا اُجالا پھیل جانے کے بعد میں خاصا سنبھل جاؤں گا۔

میرے ذہن میں وسوسے آرہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا چیز تھی جو میرے سینے پر سوار تھی؟ یقیناً وہ کوئی آسیب ہی تھا۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کیا وہ اب بھی گھر میں ہی موجود ہے؟ اور پھر میں نے سوچا کہ چوں کہ وہ آسیب نظر نہیں آرہا ہے اس لیے ممکن ہے کہ وہ ایک بار پھر کمرے میں آچکا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں نے بے اختیار کمرے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر وہاں موجود چیزوں کا جائزہ لیا اور یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ کوئی چیز حرکت تو نہیں کررہی ہے؟ تمام چیزیں ساکن دیکھ کر میں مطمئن ہوگیا۔

میں نے ایسی پراسرار مخلوق کے قصے تو بہت سنے تھے لیکن میرے ساتھ اس سے پہلے کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ یہ پہلا واقع تھا کہ میرا کسی پراسرار مخلوق سے واسطہ پڑا تھا۔

میں نے سوچا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا ہے لیکن اب آئندہ کے لیے حفاظتی اقدامات کے بارے میں مجھے کچھ سوچنا چاہیے۔ سب سے پہلے تو یہ ضروری تھا کہ میں اس پراسرار مخلوق کی حقیقت معلوم کروں' اس کے بعد ہی مجھے درست طور پر پتہ چل سکتا تھا کہ وہ مخلوق اتفاقاً یہاں آگئی

تھی یا آئندہ بھی مجھے تنگ کرے گی' اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کسی عامل وغیرہ سے رابطہ کروں جو مجھے اس مخلوق کے بارے میں کچھ بتا سکے۔

میں سوچنے لگا کہ کس عامل کو اپنا معاملہ بتاؤں۔ میری نظر میں کئی ایسے لوگ تھے جو ایسے معاملات سے منسلک تھے۔ میں نے ایک عامل روشن کمار سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ میں اُس سے کئی بار مل چکا تھا اور جانتا تھا کہ اُس نے کئی لوگوں کے کام کردیئے ہیں۔ بڑی تعداد میں لوگ اس کے عقیدت مند تھے۔

میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند تو گویا میری آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔

بالآخر صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ باہر سے چڑیوں کی آوازیں آنے لگیں اور میں مطمئن ہوگیا۔ لاشعوری طور پر جس خوف اور گھبراہٹ نے مجھے جکڑ رکھا تھا' وہ اب ختم ہوچکی تھی۔

میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ باہر دور سے کسی گاڑی کے ہارن کی آواز آئی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ دیگر گاڑیوں اور ان کے ہارنوں کی آوازیں آنے لگیں جب کہ مجھ پر غنودگی چھانے لگی جس کا اختتام نیند پر ہوا۔

جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر رات والا واقعہ پوری طرح مجھے یاد آگیا۔

میں نے ایک سگریٹ سلگایا۔ اس واقع کے بارے میں مزید سوچنے کے بعد میں نے سگریٹ بجھا کر باتھ روم کا رُخ کیا اور فریش ہونے کے بعد ناشتہ کرکے فلیٹ سے باہر آگیا۔ چار بجے مجھے اسٹوڈیو پہنچنا تھا' وہاں ایک گلوکار پربھاکر کی ریکارڈنگ کرانا تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس ریکارڈنگ کے بعد روشن کمار سے ملاقات کروں گا۔

میں اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ میرے تمام ساتھی وہاں پہنچ چکے تھے لیکن پربھاکر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں نے اُس سے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ نزدیک ہی ہے اور کچھ دیر میں پہنچ رہا ہے۔

تقریباً دس منٹ بعد پربھاکر آگیا۔ اُس کی ریکارڈنگ کروانے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا اور اس کے بعد میں اسٹوڈیو سے نکل کر روشن کمار کی طرف روانہ ہوگیا۔

اچانک میرے موبائل فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ پر سے فون رکھ کر اس کی اسکرین پر نمبر دیکھا۔ یہ ایک انجانے نمبر تھے۔

میں نے فون کا بٹن دبا کر اُسے کان سے لگایا اور کہا۔

''ہیلو!......سیٹی اسپیکنگ؟''

''نمستے ستیش جی!'' ایک خوب صورت' کھنکناتی نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''نمستے!......آپ کون؟'' میں نے کہا۔

''میرا نام پریانکا ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیوں' آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں؟''

''دراصل میوزک کے سلسلے میں آپ سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔ میں ایک کیسٹ ریکارڈ کروانا چاہتی ہوں۔''

''اچھا اچھا۔'' میں نے کا کہا۔ ''آپ کو میرا نمبر کس نے دیا؟''

''میں یہاں انیل اسٹوڈیو آئی تھی۔ پتہ چلا کہ آپ ابھی یہاں سے ریکارڈنگ کروا کر گئے ہیں۔ یہیں میں نے اندرورساجی سے آپ کا نمبر لیا ہے۔''

''اوکے اوکے......اب آپ ایسا کریں کہ کل مجھے مل لیں۔''

''کل؟'' اُس کی آواز میں کچھ مایوسی تھی۔ ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ آج آپ سے ملاقات ہوجائے؟''

''فی الحال میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں اور مجھے اندازہ نہیں ہے کہ وہاں کتنا وقت لگ جائے گا' بس اسی لیے میں آپ کو آج کا وقت نہیں دے رہا ہوں۔''

''میں آپ کو گھنٹے' دو گھنٹے یا تین گھنٹے بعد رنگ کرلوں گی۔ اگر آپ کہیں تو ہم رات کے کھانے پر بھی ملاقات کرسکتے ہیں۔ وہ بولی اُس کا لہجہ بتارہا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ میں جانتا تھا کہ جو لوگ

ریکارڈنگ وغیرہ کے لیے مجھ سے ملتے تھے ان میں سے اکثر بڑے بے چین ہوتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ جلد از جلد ان کا کام ہو جائے۔

میرا خیال تھا کہ میں ایک دو گھنٹے میں روشن کمار کی طرف سے فراغت پالوں گا اس لیے میں نے پریانکا سے کہا۔ ''اچھا آپ ایسا کریں' دو گھنٹے بعد فون کر لیں۔''

''او تھینک یو سو مچ!...... میں آپ سے ملاقات کی شدید خواہش رکھتی ہوں۔ یہ میری بیڈ لک رہی کہ آپ یہاں اسٹوڈیو سے نکل گئے ہیں۔'' وہ بولی۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے' ہم دو تین گھنٹے بعد مل لیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں آپ کو دو گھنٹے بعد رنگ کرتی ہوں۔''

میں نے رابطہ منقطع کر کے فون ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

روشن کمار کے گھر کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد میں گاڑی سے اُتر کر اُس کے دروازے پر پہنچا جہاں ایک میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے اس پردے کو ہٹایا اور دروازے پر دستک دی۔

کچھ دیر بعد روشن کمار کی بوڑھی ماں نے دروازہ کھولا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر انہیں نمستے کہا۔ انہوں نے دعا دی۔ میں نے کہا۔ ''ماں جی!...... کیا روشن کمار گھر پر ہیں؟''

''ہاں ہاں بیٹا! آ جاؤ۔'' وہ ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیتے ہوئے بولیں۔

کچھ دیر بعد وہ مجھے روشن کمار کے کمرے میں لے آئیں۔ روشن کمار زمین پر موجود گدی پر بیٹھا ہوا تھا جو دری پر بچھائی گئی تھی۔

''آؤ آؤ بھئی آؤ' کلاکار!...... کیسے ہو؟'' اُس نے حسبِ عادت خوش گوار انداز میں مجھ سے کہا۔ وہ خاصا ہنس مکھ آدمی تھا۔ اُس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں جو اس کے بھاری بھرکم چہرے پر اچھی لگتی تھی۔ اُس نے اپنے سر کے بال اس قدر بڑھائے ہوئے تھے کہ وہ اس کے کاندھوں پر جھولتے تھے۔

''ہاں بھئی کالاکار...... آج ہماری یاد کیسے آ گئی؟'' اُس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ضرورت!...... ضرورت انسان کو کہیں بھی لے جاتی ہے۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔ ''اچھا اچھا!...... چلو اب یہ بھی بتا دو کہ کیا ضرورت تمہیں یہاں لے آئی ہے؟''

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کبھی ماورائی باتوں پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب میں ایسی باتوں کا قائل ہو گیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رات میرے ساتھ ایک پراسرار واقعہ گزرا ہے'' اور پھر میں نے اُسے رات والا واقعہ سنا کر کہا۔ ''اب تم ہی یہ بتا سکتے ہو کہ آخر وہ کیا معاملہ تھا؟''

''ہوں۔'' اُس نے پرخیال انداز میں سر ہلانے کے بعد کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ کیا مسئلہ ہے۔'' اُس نے اپنے قریب ہی پڑا قلم اور ایک کاغذ کا پیڈ اٹھا لیا اور کاغذ پر کچھ آڑی ترچھی لکیریں لگانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ الفاظ بھی لکھتا جا رہا تھا۔ پھر اُس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''معاملہ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ بہر حال یہ طے ہے کہ وہ جو بھی چیز ہے' بہت طاقتور ہے اُس نے میرے عمل اور علم کو فی الحال ناکام کر دیا ہے اور میں اُس کے بارے میں کچھ جان نہیں پا رہا ہوں۔ اب اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے مجھے رات میں ایک عمل کرنا پڑے گا' تم کل کسی وقت میرے پاس آ جانا۔''

''تمہاری باتوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یقیناً تمہیں پریشان ہونا چاہیے کیوں کہ معاملہ ہی کچھ ایسا ہے۔'' وہ بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ جو بھی چیز ہے' اُس کا تعلق اب تک مجھ سے قائم ہے؟ وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اتفاقاً وہاں آ گئی تھی؟'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بالکل ایسی ہی بات ہے۔''

''تو تم یہ بالکل اندازہ نہیں کر سکے ہو کہ وہ کیا چیز ہے' کہاں سے آئی ہے' کیوں میرے پیچھے لگی ہے؟'' میں نے اُس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''فی الحال میں یہ تمام تفصیلات معلوم کرنے سے قاصر ہوں۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''بس یہ ہی معلوم ہو سکا ہے کہ وہ طاقت ور چیز ہے لیکن تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے' حالات یہ بتاتے ہیں کہ وہ چیز تمہیں مارنا نہیں چاہتی ہے' اگر اس کا ایسا ارادہ ہوتا تو تم اس وقت زندہ میرے سامنے نہیں بیٹھے ہوتے وہ تمہیں مار چکی ہوتی۔ وہ کیا چاہتی ہے' یہ میں آج رات کے عمل سے معلوم کر لوں گا۔''

''ٹھیک ہے میں کل تمہارے پاس آ جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور جیب سے پرس نکال کر اُس میں سے دو ہزار روپے نکالے اور روشن کمار کے سامنے رکھ دیئے۔ ''یہ رکھ لو بعد میں تم مجھے بتا دینا کہ میرا کتنا خرچہ ہو جائے گے۔''

''ارے اس کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے وہ ان نوٹوں کو واپس نہیں کرنا چاہتا ہو۔

''نہیں نہیں...... تم محنت کرو گے اس لیے یہ ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا' اب مجھے اجازت دو۔''

''بیٹھو ناں' چائے وغیرہ پی لو۔'' وہ بولا۔

''نہیں...... بس اب میں چلوں گا' کچھ کام بھی کرنے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ویسے تم بے فکر رہو' اب وہ چیز تمہارے پاس نہیں آئے گی' میں اُسے روک لوں گا۔'' اُس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''یہ تو بہت اچھا ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''تم بالکل بے فکر رہو۔'' وہ بولا۔

میں اُس کے گھر سے نکلنے کے بعد روانہ ہو گیا اور پھر اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ رات میں جاگنے کی وجہ سے میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میں چائے بنانے کے لیے کچن میں آ گیا۔

ذرا دیر بعد میں چائے لے کر جیسے ہی ڈرائنگ روم میں واپس آیا۔ میرے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے صوفوں کے سامنے موجود سینٹر ٹیبل پر رکھا فون اٹھایا اُس کی اسکرین پر نمبر دیکھا جو پریانکا کا تھا۔ میں نے بٹن دبانے کے بعد جو فون کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہا۔

''ستیش جی بول رہے ہیں؟'' پریانکا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ہاں ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں پریانکا بول رہی ہوں۔''

''ہاں بولو؟''

''کیا آپ کام سے فارغ ہو گئے ہیں؟''

''ہاں ہو گیا ہوں۔''

''کیا اب میں آپ سے مل سکتی ہوں؟''

''ٹھیک ہے مل لیتے ہیں۔''

''کہاں ہو گی ملاقات؟''

''تم میرے فلیٹ پر آ جاؤ۔''

''بہتر ہے...... ایڈریس بتا دیں؟''

میں نے اُسے اپنے فلیٹ کا ایڈریس بتا دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد کال بیل گونجی۔ میں نے فلیٹ کا بیرونی دروازہ کھولا۔ سامنے ایک خوب صورت لڑکی کھڑی تھی۔ اُس کی عمر چھبیس ستائیس برس ہو گی۔ اُس کا رنگ گورا تھا۔ بڑی بڑی بھنورا آنکھیں تھیں اور اُس کے ہونٹ بڑے خوب صورت اور دلکش تھے جنہیں اس نے لب اسٹک سے مزید دلکش بنا لیا تھا۔ اُس نے جینز اور لال بنیان پہن رکھی تھی۔ اُس کے کاندھے پر ایک پرس لٹک رہا تھا۔ اُس نے خوش دلی کے ساتھ میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیسے ہیں ستیش جی؟''

میں نے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم پریانکا؟''

''جی ہاں جی ہاں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''آ جاؤ آ جاؤ اندر آ جاؤ۔'' میں نے ایک طرف ہوتے ہوئے اُسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ ''آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' وہ بولی۔

''میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ تم مجھ سے مل کر خوش ہو رہی ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ ہنس دی اور بولی۔

''میں نے موسیقی کی کچھ تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی ہے' اب میرا ارادہ تھا کہ میں کیسٹ ریلیز کروں' کسی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں آپ سے مل لوں۔''

''یہ تو تمہیں اچھا مشورہ دیا گیا۔'' میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ وہ بھی ہنس دی۔ اُس نے کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد میری کیسٹ مارکیٹ میں آ جائے۔''

''کیسٹ لانا تو مسئلہ نہیں ہے لیکن پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ تم پرفیکٹ ہو یا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ میرا ٹیسٹ لے لیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''وہ تو میں لے لوں گا۔'' میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ لیکن تمہیں بے چین ہونے کی ضرورت نہیں ہے' فی الحال یہ بتاؤ کہ تم کیا پینا پسند کرو گی؟''

''کچھ بھی نہیں؟'' اُس نے کہا۔

''کیوں؟...... کیا مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں کہ میں تمہاری تواضع کر سکوں؟'' میں نے شکایتی انداز میں کہا۔

''ارے نہیں نہیں۔'' وہ گھبرا گئی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس وہ تو میں اس لیے کہہ رہی تھی کہ آپ کو زحمت ہوگی۔''

''نہیں...... مجھے کوئی زحمت نہیں ہوگی' تم بیٹھو میں چائے لے کر آتا ہوں' پھر بات کرتے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ذرا دیر بعد میں نے اُسے چائے پیش کی اور اُس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ہاں...... یہ بتاؤ کہ تم نے کتنا عرصہ موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور کس سے؟''

''میں نے دو سال تک یہ تعلیم حاصل کی اور ہمارے محلے میں ایک بوڑھے شخص ہیں' ان کا نام پردیپ جی ہے' میں نے ان سے ہی موسیقی کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کی ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''اچھا!...... تم کہاں رہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بابو محلے میں۔'' اُس نے جواب دیا۔

''بابو محلے میں؟'' میں سوچنے لگا۔ میں اس محلے سے ناواقف تھا۔ میں نے پریانکا سے اس کی رہائش کے بارے میں اس لیے پوچھا تھا کہ اگر میں اُس جگہ سے واقف ہوا تو یقیناً پردیپ جی کو بھی جانتا ہوں گا لیکن جب میں اس علاقے سے ہی ناواقف تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں وہاں رہنے والے کسی پردیپ جی کو جان سکتا۔

''آپ میرا امتحان لے لیں۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ کے معیار پر پوری اتروں گی۔'' وہ بولی۔

''ہاں...... ہاں ضرور...... تمہارا امتحان تو میں ضرور لوں گا' اس کے بعد ہی تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کر پاؤں گا۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر چائے کا کپ سینٹر ٹیبل پر رکھنے کے بعد اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ہارمونیم لے کر آتا ہوں۔''

میں دوسرے کمرے سے ہارمونیم اٹھا لایا اور اُس کے بٹنوں پر انگلیاں رکھتے ہوئے سر چھیڑ دیئے۔ ''ہاں بھئی!...... اب کچھ سناؤ؟'' میں نے پریانکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' کہہ کر اُس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پھر اُس نے گانا چھیڑ دیا۔ ''آنسو بھری ہیں یہ جیون کی راہیں' کوئی ان سے کہہ دے ہمیں بھول جائیں۔''

میں ہارمونیم کے ذریعے سر ملا کر اُس کا ساتھ دینے لگا اور جب اُس نے گانا ختم کر لیا تو میں نے اُس سے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے مکیش جی کا یہ گانا کس راگ میں ہے؟''

''راگ میں؟'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو پردیپ جی نے مجھے نہیں بتایا۔ آپ بتائیں کون سے راگ میں ہے؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا

''یہ راگ مالکونس میں ہے۔ یہ پانچ سروں کا راگ ہوتا ہے' سا گا ما دھا نی سا...... یہ تو تم جانتی ہی ہوگی کہ دونوں 'سا' کو ایک ہی سر تسلیم کیا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی ہاں جی ہاں' یہ تو مجھے معلوم ہے۔'' وہ بولی۔

''اب مجھے یہ دیکھنا پڑے گا کہ تم تال میں بھی ہو یا بے تال ہو' ویسے سروں میں تو تم پکی ہو۔ میں طبلہ لے کر آتا ہوں اور تمہاری تال کا امتحان بھی لے لیتے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر میں دوسرے کمرے سے طبلہ بھی لے کر آ گیا اور اُسے قالین پر جمانے کے بعد پریانکا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ہاں...... اب ذرا وہی گانا گاؤ۔''

اُس نے گانا شروع کر دیا اور میں طبلے پر تال بجانے لگا۔ اُس نے کافی گانا درست طور پر گایا لیکن ایک جگہ پر بے تال ہو گئی۔ میں نے ہاتھ روک لیے اور اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہاں تم بے تال ہو گئی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تم تال میں کمزور ہو۔ ویسے تم نے سخت تال کا گانا چنا تھا۔ اس تال کو جھپتال کہتے ہیں' یہ سات ماترے کی تال ہے اور اس کے اکثر گانے سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے بول ہیں دھن دھن نا کا دھن نا' دھن دھن نا کا تن نا' دیکھو اب میں تمہیں یہ گانا سناتا ہوں' اور تمہیں یہ بھی بتاتا ہوں کہ تم کس جگہ بے تال ہوئی ہو۔'' میں نے وہ گانا شروع کر دیا اور پھر میں نے اُس کی غلطی کی نشان دہی کی اور اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''سمجھ آئی غلطی تمہیں؟''

''ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں سمجھ گئی ہوں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر گاؤ؟'' میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر گانا گانے لگی اور پھر تین چار مرتبہ کی کوشش کے بعد اُس نے اپنی غلطی پر قابو پا لیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم پر مجھے کچھ محنت کرنی پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں کر لیں۔'' وہ بولی۔

میری فرمائش پر اس نے کچھ اور گانے بھی گائے۔ میں نے اُس سے کہا۔ ''کم از کم تم پر مجھے ایک ماہ محنت کرنی پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ ایک ماہ تو کیا' آپ چاہیں تو میں ایک سال بھی محنت کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' اُس نے خندہ پیشانی سے کہا۔

''نہیں نہیں...... تم ایک ماہ میں ہی ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' میں اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے سینٹر ٹیبل پر موجود اپنے کپ کی طرف دیکھا' جس میں چائے موجود تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اب وہ ٹھنڈی ہو چکی ہے۔

''ویسے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میری کیسٹ کی تیاری اور ریلیز میں کتنی رقم خرچ ہوگی' ساتھ ہی مجھے یہ بھی بتا دیں کہ مجھے آپ کو آپ کی محنت کے عوض کتنی رقم ادا کرنی پڑے گی؟'' وہ بولی۔

میں نے جلدی سے ذہن میں حساب لگایا اور بولا۔ ''تقریباً ایک لاکھ روپے خرچ ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے' میں یہ خرچ کر لوں گی۔''

''اگر تم خرچہ کر لو گی تو تمہاری کیسٹ آ جائے گی مارکیٹ میں۔ اُس کے بعد تمہاری قسمت کہ تم ہٹ ہوتی ہو یا نہیں' تمہیں پروگرام ملتے ہیں یا نہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔ وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی مجھے پروگرام ملیں یا نہیں' کم سے کم میری کیسٹ لانے کی خواہش تو پوری ہو جائے گی۔'' وہ بولی۔

''لیکن ایک بات کہنا چاہوں گا۔''

''وہ کیا؟'' اُس نے بھنویں سکیڑ لیں اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''میں نے تمہاری خواہش پر تم سے ملاقات کر لی اور یہ بھی بتا دیا کہ میں تمہارے لیے کیا کروں گا فی الحال میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ میں تمہیں کب سے وقت دے سکوں گا۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ کہیں مصروف ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں...... میرا ایک ذاتی مسئلہ ہے' میں جب تک اُس سے نمٹ نہیں جاتا' میں تمہیں وقت نہیں دے سکتا۔'' میں

نے جواب دیا۔

وہ ذرا مایوس ہو کر بولی۔ ”ٹھیک ہے' جیسی آپ کی مرضی۔“

”تم پریشان یا مایوس نہ ہو' مسئلہ کچھ ایسا ہے کہ میں کسی بھی جانب توجہ نہیں دے سکتا' پہلے اس مسئلہ کا حل ہونا ضروری ہے۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں اُس سے کہا۔

”ٹھیک ہے جی...... جیسی آپ کی مرضی' میں انتظار کر لوں گی۔“ وہ بولی۔ اس کا لہجہ اب بھی مایوس تھا۔

”میں اس دوران تم سے رابطہ رکھوں گا۔“ میں نے اس کی مایوسی دور کرنے کی خاطر کہا۔ ”ویسے مجھے اُمید ہے کہ جلد ہی وہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”میں اُس مسئلے کا حل ہونے کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔“ وہ بولی۔

”اچھا' اب میں ذرا رات کے کھانے کی تیاری کر لوں' تم میرے ساتھ ہی کھانا کھانا۔“ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔“

”تم بیٹھو!...... میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

”کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟“

”نہیں شکریہ!...... ویسے تم چاہو تو ہارمونیم سے دل بہلا سکتی ہو۔ بجا لیتی ہو ناں یہ؟“

”جی ہاں...... کافی حد تک۔“

”ٹھیک ہے...... تم اس سے دل بہلاؤ تب تک میں اپنا کام نمٹاتا ہوں۔“

میں کچن میں آ گیا۔ یہاں موجود چھوٹے سے فریج میں سے میں نے کھانے پینے کی کچھ اشیاء نکالیں اور انہیں گرم کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر کچھ چیزیں بھی تیار کرنے لگا۔

تمام تر مصروفیات اور خوب صورت لڑکی کی قربت کے باوجود میں اندر سے بے چین' اداس اور پریشان تھا اور وہی رات والا واقعہ اس کی وجہ تھی۔

روشن کمار سے ملاقات کے بعد میں کافی حد تک اس نادیدہ مخلوق کی جانب سے مطمئن تھا لیکن پھر بھی بار بار مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ کہیں کسی وجہ سے روشن کمار اُسے فی الحال روک نہ سکے اور وہ مخلوق آج رات پھر مجھے پریشان کرے۔

میں کھانے تیار کرنے کے بعد ڈائننگ روم میں آ گیا۔ پریانکا نے ہارمونیم پر کچھ سُر چھیڑ رکھے تھے۔ میں نے اُس سے کہا۔ ”بھئی!...... اب یہ روح کی غذا کا معاملہ چھوڑو اور جسم کی غذا کی طرف آ جاؤ۔ میں نے کھانا تیار کر لیا' آؤ ہاتھ دھونے کے بعد ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھو!“

وہ میری بات پر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانے کھا رہے تھے اور مختلف موضوعات پر باتیں بھی کرتے جا رہے تھے اور پھر اُس نے کہا۔ ”روشن جی!...... میں محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کچھ پریشان پریشان سے ہیں۔“

میں نے مصنوعی مسکراہٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”نہیں...... بات تو ایسی ہی ہے لیکن ابھی میرے اور آپ کے تعلقات ایسے نہیں ہیں کہ میں آپ پر زور دے کر آپ کے دل میں چھپی حقیقت کو اگلوا سکوں۔“ وہ بولی۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بولنے کا فیصلہ کیا کیوں کہ اگر میں اُسے حقیقت بتا دیتا تو شاید وہ یہاں ایک منٹ رُکنا بھی گوارا نہ کرتی۔ میں نے کہا۔ ”دراصل...... مجھے ایک کام میں کچھ مالی نقصان ہو گیا ہے۔“

”اوہ...... یہ تو افسوس ناک بات ہے۔“ وہ بولی۔ ”کتنا نقصان ہو گیا ہے؟“

”تقریباً دو لاکھ روپے کا۔“

”اوہو!...... بہر حال...... نفع اور نقصان تو جیون کا حصہ ہوتا ہے۔ کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟“ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”کیسی مدد؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر آپ چاہیں تو میں اتنی رقم آپ کو دے سکتی ہوں۔“

میرے چہرے کے بولتے تاثرات سے اُس نے

اندازہ لگا لیا کہ میں نے اُس کی بات کو پسند نہیں کیا ہے' وہ بولی۔ ”میں یہ رقم آپ کو بطور قرض دینا چاہتی ہوں' آپ اپنے مالی معاملات پر قابو پا لیں اور جب چاہیں مجھے رقم لوٹا دیں۔“

”نہیں...... مجھے رقم کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے' ویسے اگر ہوئی تو میں ضرور تمہیں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ ضرور بتایئے گا' میں آپ کے کچھ کام آ سکوں' یہ میری بڑی خوش نصیبی ہوگی۔“

ہم لوگ پھر مختلف موضوعات پر بات چیت کرنے لگے اور پھر اُس نے پوچھا۔ ”روشن جی!...... آپ نے شادی نہیں کی؟“

”کی تھی۔“ میں نے اُس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

”تو پھر؟“

”چھوڑ دیا اُسے۔“

”کیوں؟“

”بے وفا نکلی وہ۔“

”اوہ......“ یہ تو افسوس ناک بات رہی۔“

”یہ کافی پرانی بات ہے' میں اب اس زخم کو بھول گیا ہوں۔“

”کسی اور سے شادی کر لیتے۔“

”نہیں۔“ میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میرے لیے ایک تجربہ ہی کافی تھا۔“

”دنیا کی تمام لڑکیاں تو بے وفا نہیں ہوتیں۔“

”لیکن...... مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ جیسے تمام لڑکیاں بے وفا ہوتی ہیں۔“

”یہ آپ کا غلط خیال ہے۔“

”میں نے پھر مسکرا کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن اب میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔“

ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ماحول کچھ بوجھل اور اداس ہو گیا ہے اس لیے میں نے اُس سے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تمہیں گانے کا شوق کب سے ہوا تھا؟“

”یہ تو میرے بچپن کی بات ہے۔ میری دیدی بڑا اچھا گاتی تھیں' انہیں دیکھ دیکھ کر شوق ہوا تھا۔ پھر ان کا ایک حادثہ میں دیہانت ہو گیا' بس یوں سمجھ لیں کہ ان کی یاد میں' میں نے گانے کے شوق کو آگے بڑھایا۔“ اُس نے بتایا۔

”اوہو!...... یہ تو بہت افسوس ناک واقعہ رہا۔ بہر حال...... تم فکر نہ کرو' میں کوشش کروں گا کہ تم ایک کامیاب گلوکارہ بن جاؤ تا کہ تمہاری دیدی کی آتما کو شانتی مل سکے۔“ میں نے کہا۔

”یہ آپ کا احسان رہے گا مجھ پر۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ ہم دونوں ہی دُکھ کی راہ کے مسافر ہیں اور ایک دوسرے کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔“

کھانے کے بعد پریانکا واپس چل گئی اور میں سونے کی تیاری کرنے لگا۔ بہت دیر تک مجھے گزشتہ رات والے واقعے کی وجہ سے نیند نہ آ سکی لیکن بالآخر کسی وقت میں سو گیا۔

اگلے روز میں روشن کمار کے پاس پہنچ گیا۔

”ہاں بھئی کیسے ہو تم؟“ اُس نے مجھ سے کہا۔

”بالکل ٹھیک۔“ میں نے جواب دیا۔

”رات کیسی گزری؟“

”پُرسکون...... ویسے میرا خیال تھا کہ اگر کسی وجہ سے تم نے اُسے فوری طور پر قابو نہ کر لیا تو وہ پھر مجھے تنگ کرے گی۔“ میں نے دل کی بات کہی۔

”ایسی بات نہیں تھی۔ میں نے تمہاری عارضی حفاظت کا بندوبست تو کر دیا تھا اور یہ بھی تمہیں بتا دوں کہ میں اُسے ابھی تک قابو نہیں کر سکا ہوں۔“

”اوہ...... کتنا وقت لگے گا؟“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔

’’کچھ کہا نہیں جاسکتا۔‘‘ وہ پُرخیال انداز میں بولا۔’’وہ ایک آتما ہے۔ بھٹکتی ہوئی آتما۔ ابھی میں اُس سے بات چیت بھی نہیں کرسکا ہوں لہٰذا یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ ویسے تم فکر مند نہ ہو میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں اسے اپنے قابو میں کرلوں گا۔ ایک ہفتہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اتنا وقت لگ سکتا ہے‘ کوئی خطرناک سے خطرناک آتما بھی مجھ سے اتنے عرصے سے زیادہ بھاگ نہیں سکتی۔‘‘

’’کیا میں اس عرصے کے دوران اس سے مکمل طور پر محفوظ رہ سکوں گا؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’تم بے فکر رہو‘ میں ایسا عارضی بندوبست کردیتا ہوں کہ وہ اس عرصے کے دوران تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔‘‘ اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا اور اپنے دائیں جانب موجود قلم اور کاغذ کا پیڈ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

کاغذ پر لکھنے کے بعد اُسے میرے حوالے کرتے ہوئے وہ بولا۔’’لو!......اسے پہلے پلاسٹک میں لپیٹنا اور اس کے بعد کپڑے میں لپیٹ کر سیدھے بازو پر باندھ لینا تم اس آتما سے محفوظ رہو گے۔‘‘

میں نے وہ کاغذ اُس سے لینے کے بعد جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔’’کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور چیز دو گے؟‘‘

’’نہیں بس یہی کافی ہے۔‘‘ وہ بولا۔

’’کیا میں تمہیں کچھ رقم دے دوں؟‘‘

’’نہیں......ابھی ضرورت نہیں ہے‘ جب تمہارا کام ہو جائے تو پھر دے دینا۔‘‘

’’ٹھیک ہے تو پھر اب مجھے اجازت دو۔‘‘

’’بے فکر رہنا اور خاص بات ہو تو مجھے ضرور بتا دینا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘

میں اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ روشن کمار کی باتوں سے مجھے خاصی تسلی ہوگئی تھی کیوں کہ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اُس آتما سے محفوظ رہوں گا جو مجھے پریشان کرچکی ہے۔

میں کافی بنانے کے لیے کچن میں آگیا۔ اسی وقت میرے موبائل فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے فون جیب سے نکالنے کے بعد اُس کے اسکرین پر نظر ڈالی۔ پریانکا کا نمبر تھا۔ میں نے بٹن دبا کر فون کان سے لگایا اور ہیلو بولا۔

’’پریانکا بول رہی ہوں۔‘‘ آواز آئی۔

’’ہاں بولو؟‘‘

’’میں بور ہو رہی تھی‘ سوچا آپ کو فون کرلوں‘ کیا کر رہے ہیں؟‘‘

’’کافی بنا رہا ہوں۔‘‘

’’او......گھر پر ہیں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’میں آسکتی ہوں؟‘‘

’’ہاں آجاؤ۔‘‘

’’اوکے‘ میں پہنچتی ہوں۔‘‘ اُس نے کہا۔ اُس کا لہجہ مسرور تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ آگئی۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے کہا۔’’دیکھیے ستیش جی!......میں کافی کھلے ذہن کی لڑکی ہوں۔ جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے وہ میں کہہ دیتی ہوں۔ اب بھی جو میرے دل میں ہے‘ وہ میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’اچھا!‘‘ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔’’کیا ہے تمہارے دل میں بھئی!‘‘

اُس نے نظریں جھکالیں اور بولی۔’’وہ......میں......آپ کو......‘‘

’’ہاں کیا مجھے؟‘‘ اُسے جھجک کر خاموش ہوتے دیکھ کر میں نے کہا۔

’’میں......آپ کو......پسند کرنے لگی ہوں۔‘‘

’’کیا؟‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔

’’ہاں۔‘‘ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔’’یہ درست ہے ستیش جی!......میں آپ کو دل دے بیٹھی ہوں۔

میں......میں آپ سے یہ نہیں کہوں گی کہ آپ بھی مجھ سے محبت کریں لیکن میں نے آپ کو اپنے دل کی بات بتا دی ہے‘ میں‘ میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔‘‘

اُس کی نظریں مسلسل نیچے ہی تھیں‘ اُس نے میرے دل کے تاروں کو چھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے ویسے تو فیصلہ کر رکھا تھا کہ اب کسی لڑکی سے محبت یا شادی نہیں کروں گا لیکن پریانکا نے پہلی نظر ہی میں مجھے متزلزل کر کے رکھ دیا تھا۔

’’دیکھو!......میں نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ میں اب کسی لڑکی سے دل نہیں لگاؤں گا۔‘‘ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

’’لیکن......اگر کسی ایک لڑکی نے آپ سے بے وفائی کی ہے تو یہ نہ سوچیں کہ ہر لڑکی بے وفا ہوتی ہے۔‘‘ وہ بولی۔

’’مجھے اب دل لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔‘‘

’’آپ کے ساتھ جو سانحہ گزر چکا ہے‘ اس کی وجہ سے آپ کا ڈرنا ایک فطری بات ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ مجھ سے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میری زندگی میں بڑے اچھے اچھے لڑکے آئے‘ بلکہ اب بھی کئی لڑکے مجھے اپنانے کے خواہش مند ہیں‘ ان میں کئی بہت خوب صورت ہیں اور کئی بہت دولت مند لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے دل کو نہیں بھایا جب کہ آپ کو دیکھ کر ہی میں دل ہار بیٹھی تھی۔ آپ چاہے مجھ سے محبت کریں یا نہیں لیکن میں آپ کو زندگی بھر چاہتی رہوں گی اور آپ کی چاہت کے سہارے ہی زندگی گزار دوں گی‘ کبھی کسی اور سے شادی بھی نہیں کروں گی۔‘‘ اُس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

’’اوہ......یہ......یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’ایسا مت کرو بھئی!......تمہارے سامنے ایک خوب صورت زندگی پڑی ہے‘ تم کسی بھی اچھے لڑکے سے شادی کر کے خوش و خرم رہ سکتی ہو‘ میں تو دل شکستہ آدمی ہوں شاید تمہیں خوشیاں نہ دے سکوں۔‘‘

’’لیکن مجھے خوشیاں نہیں چاہئیں! مجھے تو آپ کی محبت چاہیے۔‘‘ وہ بولی۔

’’لیکن......ایک ٹوٹے ہوئے آدمی اور اس کی محبت کے سہارے کیا زندگی گزاری جاسکتی ہے؟‘‘

’’ہاں......میں گزار سکتی ہوں۔‘‘

’’سوچ لو......بعد میں تمہیں پچھتانا نہ پڑے۔‘‘

’’نہیں......ایسا کبھی نہیں ہوگا۔‘‘

’’اچھا تو پھر سنو میرے دل کی بھی بات۔‘‘ میں نے کہا۔’’جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے‘ میں بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں‘ تم پہلی ہی نظر میں مجھے پسند آگئی تھیں لیکن میں اپنا حالِ دل‘ زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا۔ اب جب کہ بات اس حد تک آگئی ہے تو میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ پریانکا خوش ہوگئی۔’’یہ......یہ میں کیا سُن رہی ہوں؟ کیا‘ کیا یہ حقیقت ہے؟‘‘

’’ہاں......یہ حقیقت ہی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اوہ!......یہ......یہ تو میری بڑی خوش قسمتی ہے۔‘‘

’’میں بھگوان سے پراتھنا کرتا ہوں کہ ہمارا ساتھ ہم دونوں کے لیے خوش قسمتی کا سبب بنے۔‘‘

☆

رات کا کھانا ہم دونوں نے مل کر تیار کیا اور پھر کھانا کھا لینے کے بعد پریانکا مجھ سے بولی۔’’کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ......میں آج رات یہیں رُک جاؤں؟‘‘

’’کیا؟......کیوں؟‘‘ میں نے حیرت اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

’’دراصل......گھر میں میرا ممی اور ڈیڈی سے جھگڑا ہوگیا ہے۔ یہاں سے اگر میں جاتی ہوں تو گھر نہیں جاؤں گی بلکہ ایک سہیلی کے گھر جاؤں گی اور وہیں رات گزار دوں گی‘ میں چاہتی ہوں کہ اس کے گھر جانے سے بہتر ہے کہ یہیں رُک جاؤں‘ آپ سے بات چیت بھی

ہوتی رہے گی اور موسیقی کی زیادہ سے زیادہ معلومات بھی مل سکتی ہیں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میں یہاں رُک جاؤں؟'' وہ بولی۔

''دیکھو!...... اب جب کہ ہم اور تم محبت کا اقرار کر چکے ہیں تو ہمیں تکلفات کو تو دور رکھنا ہوگا' مثلاً یہ کہ اگر اجازت ہو بُرا نہ لگے' زحمت نہ ہو وغیرہ وغیرہ' اس طرح کی باتوں سے گریز کرنا ہوگا' ویسے اگر تمہاری خواہش ہے کہ تم یہاں رکو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ مجھے خوشی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''اوہ...... تھینک یو۔''

ہم دونوں رات دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر جب ہم دونوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو میں نے اُس سے کہا۔ ''پریانکا!...... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں سو جانا چاہیے۔''

''جی تو چاہتا ہے کہ میں آپ سے اسی طرح باتیں کرتی رہوں لیکن واقعی نیند نے تو بُرا حال کر دیا ہے۔'' وہ بولی۔

''آؤ...... میں تمہیں دوسرے کمرے میں چھوڑ آؤں۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

میں اُسے دوسرے کمرے میں لے آیا اور وہاں موجود بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہاں آرام سے سو جاؤ۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ بولی۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا اور بیڈ پر لیٹ کر پریانکا کے بارے میں سوچنے لگا۔ چوں کہ نیند کا بہت زور تھا اس لیے جلد ہی سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے کمرے ہی میں کسی کے قدموں کی آواز سنی اور بے اختیار اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں لائٹ جلا کر سونے کا عادی تھا اس لیے لائٹ جلانے کی زحمت بھی نہیں کرنا پڑتی تھی۔

کمرے میں کسی کو نہ پا کر میرا ذہن اُس نادیدہ مخلوق کی طرف چلا گیا جو پہلے بھی مجھے تنگ کر چکی تھی۔

''کیا وہ پھر آ گئی ہے؟'' میں نے سوچا مجھے یہ خیال بھی پریشان کرنے لگا کہ پریانکا دوسرے کمرے میں اکیلی ہے۔ اگر یہ مخلوق وہاں چلی گئی اور اُسے تنگ کیا تو ہو سکتا ہے کہ پریانکا دہشت سے مر جائے کیوں کہ وہ ایک لڑکی ہے اور لڑکیاں بڑے کمزور دل کی ہوتی ہیں۔

میں بیڈ سے اُتر کر تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف لپکا' اسی وقت لائٹ چلی گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میرے قدم رُک گئے۔

میں نے محتاط انداز میں دروازے کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ اُسی وقت مجھے غراہٹ سنائی دی۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے آس پاس کوئی درندہ موجود ہے۔

میں نے فوراً اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور کمرے کے ایک کونے میں مجھے دو سرخ بلب جیسے نظر آئے۔ میں حیران ہو گیا کہ آخر وہ کیا چیز ہے۔

اچانک اُس طرف سے غراہٹ سنائی دی اور پھر سرخ روشنیاں تیز ہونے لگیں اور مجھے وہ وجود نظر آنے لگا جس کی سرخ آنکھیں تھیں۔ وہ ایک بلا تھی جس کا چہرہ بہت خوفناک اور مکروہ تھا۔ اُس کے منہ سے بار بار زبان باہر نکل رہی تھی اُس کے جسم پر بڑے بڑے بال تھے اور اُس کے کان بھی خاصے بڑے تھے۔

میں نے سوچا کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنا ہاتھ دانتوں سے کاٹ کر اس بات کی تصدیق کر لی کہ میں جاگ رہا ہوں۔

اُس خوفناک مخلوق نے آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ اب مجھے جثے کا درست اندازہ ہوا جو کسی ریچھ سے مشابہ تھا۔

وہ بلا غراتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں اُس پر نظریں جمائے اُس سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اچانک دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ جس کی وجہ سے میں چونک گیا۔ میں حیران تھا کہ آخر چٹخنی کس نے کھولی ہے کیوں کہ وہ کمرے کے اندرونی جانب سے لگی

تھی اور پھر دروازے کھلنے کی آواز بھی آئی' ساتھ ہی ہوا کا جھونکا بھی اندر آیا۔

''کوئی ہے؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں۔'' پریانکا کی آواز آئی۔

''پریانکا تم ہو۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں......''

''لیکن...... تم...... اندر...... کیسے آ گئیں؟''

''میں ہر جگہ آ سکتی ہوں۔'' اُس کا جواب آیا۔ ''بس تم اپنی جگہ کھڑے رہو۔''

''میں کچھ سمجھ نہیں رہا ہوں پریانکا۔''

''میں ابھی تمہیں سب سمجھا دوں گی بس تم بے فکر ہو کر اپنی جگہ کھڑے رہو' گھبرانا نہیں۔'' اُس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

میں خاموش رہا۔

اچانک پریانکا' بلا کے نزدیک آئی اور پھر وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئیں۔

بلا خوفناک آواز میں غرا رہی تھی اور بالآخر اُس نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ بھی آن ہو گئی۔

پریانکا کے بال بکھرے ہوئے اور وہ قریب ہی پڑی بلا کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے پریانکا؟'' میں نے کہا۔

اُس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''ستیش جی!...... میں نے اسے مار ڈالا کیوں کہ یہ آپ کو مار دینا چاہتی تھی۔ یہ ایک آتما تھی' بھٹکتی ہوئی آتما جو انسانوں کا خون پیتی ہے۔ دراصل...... میں بھی ایک آتما ہوں لیکن میں بُری آتما نہیں ہوں۔ میں انسانوں کا خون نہیں پیتی اور نہ ہی انہیں نقصان پہنچاتی ہوں۔ میں گزشتہ پانچ سال سے یہاں رہ رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کے عشق میں گرفتار ہوں' آپ پر اور آپ کی گائیکی پر مرتی ہوں۔ میں تو خاموشی سے یہاں رہ رہی تھی لیکن پھر

یہ بھٹکتی آتما یہاں آ گئی اور اس نے آپ کو شکار کرنا چاہا۔ ایک رات یہ آپ کے سینے پر سوار ہو کر آپ کا خون پینا چاہتی تھی کہ میں نے اسے آپ پر سے ہٹایا اور اسے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا لیکن یہ اتنی آسانی سے جانے والی نہیں تھی اس لیے میں انسانی روپ میں آ گئی تا کہ با آسانی آپ کی حفاظت بھی کر سکوں ورنہ اگر میں پوشیدہ رہ کر آپ کی حفاظت کرتی تو آپ ہماری سرگرمیوں کی وجہ سے پریشان ہو جاتے اور آپ پریشاں ہوں گئے تھے' اس لیے آپ نے عامل روشن کمار سے بھی رابطہ کیا لیکن وہ اتنا بڑا عامل نہیں ہے کہ اس جیسی خطرناک آتما کا مقابلہ کر سکتا یا اس کے بارے میں درست طور پر پتہ لگا سکتا۔

بہرحال!...... یہ ساری حقیقت تھی اور میرا خیال ہے کہ یہ حقیقت سامنے آنے کے بعد آپ مجھے یہاں دیکھنا پسند نہیں کریں گے اس لیے میں بھی یہاں سے جا رہی ہوں۔ اس آتما کی طرف سے فکر مند نہ ہونا' یہ آہستہ آہستہ دھوئیں میں تبدیل ہونے کے بعد غائب ہو جائے گی۔'' وہ اپنی بات ختم کرنے کے بعد پلٹی اور گردن موڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تو یہاں سے جا رہی ہوں لیکن میں ہمیشہ آپ سے پیار کرتی رہوں گی۔'' اُس نے منہ موڑ لیا۔

''رُک جاؤ!'' میں نے کہا اُس نے پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے مزید کہا۔ ''تم کہیں نہیں جاؤ گی۔''

''کیا؟'' اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' تم یہیں رہو گی' میرے ساتھ۔''

''لیکن...... میں تو ایک آتما ہوں۔''

میں نے اُس کے سامنے پہنچ کر اُس کے دونوں شانے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ تم ایک آتما ہو' میرے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ تمہاری محبت سچی ہے۔''

''اوہ ستیش!'' خوشی سے ہنستے ہوئے وہ میرے سینے سے لگ گئے اور میں نے بھی اُسے بھینچ لیا۔

☆☆☆

کلب میں ایک اور شام

مترجم: اجمل کمال

"لوگوں سے کہنا کہ تمہارا تعلق مشہور برکات خاندان سے ہے اور تمہارے والد جج تھے۔" یہ کہہ کر اس نے قریب آکر اس کے گالوں کو باپ کی سی شفقت اور ملائمت سے تھپتھپایا تھا' یہ اس کا مخصوص انداز تھا جسے وہ ان دونوں کی مشترک زندگی کے آنے والے دنوں میں بار بار دہرانے والا تھا۔

پرتعیش زندگی ہر عورت کی تمنا۔ مشترک عالمی نظریات کی ترجمان کہانی

وہ اضطراب کے عالم میں اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کررہی تھی۔ یہ پیش گوئی کرنے سے قاصر کہ اس کے واپس آنے کے بعد ان دونوں میں کیا معاملہ پیش آئے گا' وسیع وعریض چوبی دالان میں جو دریا کے کنارے پر پھیلا ہوا تھا اور جس کے ستون کنارے کی زمین میں گڑے ہوئے تھے جن کے گرد گھاس پھوس اگ آئی تھی' وہ جھولا کرسی میں بیٹھی اپنے جسم کو آگے پیچھے حرکت دے رہی تھی۔ گویا اپنے اندیشوں کو جھٹکنے کے لیے اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ باغ کے کٹہرے تک پھیلے ہوئے یوکلپٹس کے پیڑوں کے ہیولے اس کی نظر کے سامنے ہوا میں لہرا رہے تھے اور ان کی اونچی شاخوں پر بیٹھے ہوئے سفید پرندے ان کی باریک پتیوں کے درمیان بڑے بڑے سفید پھولوں جیسے لگ رہے تھے۔

مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے سے پتلا سا چاند طلوع ہوا اور اس کی مدھم روشنی میں جو دریا پار منفلوط کے مکانوں سے آتی ہوئی روشنی میں گھل مل گئی تھی' دریا کی دھیمی سانسیں لیتی ہوئی سطح جھلملانے لگی۔ شہر کے آخری سرے پر واقع کلب کے باغ میں پیڑوں پر لگے ہوئے رنگین قمقمے اردگرد کے تاریک پس منظر میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اسی عمارت میں کہیں اس کا شوہر اس وقت غالباً شطرنج کی بازی میں محو بیٹھا تھا۔

یہ صرف چند سال پہلے کی بات تھی جب اس نے اپنے باپ کے گھر میں اس شخص کو پہلی بار دیکھا تھا اور اس کی نظر سے نظر ملائی تھی جو اس کے حسن کو تول کر گویا دام لگانے سے پہلے اس کی ارزش کا اندازہ لگا رہی تھی۔ جب اس نے ان جاپانی پیالوں میں جو اہم مہمانوں کی تواضع کے واسطے الماری میں مقفل رکھی جاتی تھیں' اسے قہوہ پیش کیا تو اس کی نگاہوں کو اپنے بدن پر محسوس کیا تھا۔ اس کی ماں نے یہ پیالیاں چاندی کے کام والی کشتی میں بے حد نفیس کڑھائی کی پوشش بچھا کر اپنے ہاتھ سے سجائی تھیں۔ جب دونوں مرد قہوہ ختم کر چکے' تو اس کے باپ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا اور اسے بیٹھنے کو کہا تھا اور وہ ان کے سامنے والے صوفے پر گھٹنوں کو اپنے لباس کے دامن سے ڈھانپ کر بیٹھ گئی تھی اور چور نظروں سے اس شخص کو



دیکھتی رہی تھی جو شاید اسے اپنی بیوی کے طور پر منتخب کرنے والا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ دراز قد' جسم کا مضبوط اور کلین شیو تھا۔ اس کا انگلش ٹویڈ کا عمدہ سلا ہوا کوٹ' ریشمی قمیص اور طلائی کف لنک خاص طور پر اس کی نظر میں آئے۔ جب اس نے جواباً اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو اپنے چہرے پر سرخی دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ پھر وہ اس کے باپ کی طرف مڑا اور اپنا سنہری سگریٹ کیس نکال کر اسے سگریٹ پیش کیا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے جناب؟'' یہ کہہ کر اس کے باپ نے احتراماً اپنا بایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے ایک سگریٹ لے لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماچس تلاش کر پائے' عبود بے اپنا لائٹر نکال چکا تھا۔

''نہیں جناب' پہلے آپ۔'' اس کا باپ شرمندہ ہو کر بولا۔ وہ بہ یک وقت اس شخص کے دنیاوی خود اعتمادی کے انداز سے مسحور اور اپنے باپ کے بے ڈھنگے پن پر محجوب تھی۔

اس کے باپ کا سگریٹ سلگانے کے بعد عبود بے نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی' ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور اپنے لیے سگریٹ نکالا۔ اسے اپنے ہونٹوں کے کونے میں دبا کر سلگانے سے پہلے اس نے سگریٹ کے سرے کو کیس کے ڈھکنے پر آہستہ سے دو ایک بار ٹھونکا' پھر منہ سے دھویں کے چھلے برآمد کیے جو کمرے کی ہوا میں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگے۔

''یہ ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے' میرے بیٹے۔'' اس کا باپ مسکرا کر پہلے عبود بے کی اور پھر اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا' جس پر عبود بے نے بھی اس پر نظر ڈالی اور پوچھا:

''اور حسین دوشیزہ ابھی ثانوی اسکول میں ہے؟''

اس نے انکسار سے سر جھکا لیا تھا اور اس کے باپ نے جواب دیا تھا:

''آج کے بعد یہ گھر پر رہ کر خود کو آپ کے ساتھ پُرمسرت زندگی گزارنے کے لیے تیار کرے گی' انشاء اللہ'' اور وہ اپنے باپ کی آنکھ کے اشارے پر اٹھ کر باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس چلی گئی تھی۔

''تمہاری خوش نصیبی ہے۔'' اس کی ماں نے اسے بتایا تھا۔ ''ایسا بر کہاں ملتا ہے۔ کوئی بھی لڑکی اسے پا کر خوش ہوگی۔ عمر چالیس سال بھی نہیں ہے اور آب پاشی کا انسپکٹر ہے۔ اچھی تنخواہ ہے اور جہاں تعیناتی ہوتی ہے وہاں رہنے کے لیے فرنیچر سمیت سرکاری مکان ملتا ہے۔ اس سے ہم مکان دینے کے خرچ سے بھی بچ جائیں گے اور ہمارے جو حالات ہیں وہ تمہیں معلوم ہی ہیں...... اور یہ اسکندریہ میں اس کے ذاتی مکان کے علاوہ جہاں تم چھٹیاں گزارا کرو گی۔''

سمیعہ کو اس بات پر تعجب تھا کہ ایسا شان دار بر اس کے دروازے پر کیسے چلا آیا۔ اسے کس نے بتایا کہ اپیل کورٹ کے ایک معمولی کلرک محمود برکات کے ہاں ایک خوب صورت اور خوب سیرت بیٹی ہے؟

پھر دن قاہرہ کی دکانوں کے چکر کاٹنے اور آنے والے پُرآسائش زندگی کے لیے لباسوں کے انتخاب میں گزرنے لگے۔ یہ سب اس طرح ممکن ہوا کہ اس کے باپ نے اپنی سرکاری پینشن میں سے کچھ رقم قرض لے لی۔ دوسری طرف عبود بے کبھی اس کے گھر تحفے کے بغیر نہ آیا۔ شادی سے چند روز پہلے' اس کی سالگرہ پر' وہ شارع قصر النیل کی ایک مشہور دکان کے نام سے مزین مخملیں ڈبے میں اس کے لیے زمرد کی انگوٹھی لایا۔ عروس کی رات کو اس کی کلائی پر ہیرے کا دست بند باندھتے ہوئے اس نے یاد دہانی کرائی کہ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی ہے جسے ترقی کی راہ پر بہت آگے جانا ہے اور یہ کہ زندگی کی اہم ترین چیزوں میں سے ایک چیز دوسروں خصوصاً ہم رتبہ اور اعلاتر لوگوں کی رائے ہے۔ اگرچہ اس کا سن ابھی بہت

کم ہے' پھر بھی اسے مناسب اور پروقار انداز اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

''لوگوں سے کہنا کہ تمہارا تعلق مشہور برکات خاندان سے ہے اور تمہارے والد جج تھے۔'' یہ کہہ کر اس نے قریب آ کر اس کے گالوں کو باپ کی سی شفقت اور ملائمت سے تھپتھپایا تھا' یہ اس کا مخصوص انداز تھا جسے وہ ان دونوں کی مشترک زندگی کے آنے والے دنوں میں بار بار دہرانے والا تھا۔

کل شام وہ بیئر کی بوتل کے اثر سے کچھ مدہوش سی کلب سے لوٹی تھی جو اسے کسی کی سالگرہ کی خوشی میں پینی پڑی تھی۔ اس کا شوہر اس کی کیفیت کا اندازہ کر کے اسے جلد ہی گھر لے آیا تھا۔ اس نے کپڑے اتار کر نائٹ گاؤن پہن لیا تھا اور زیور سنگھار میز پر پڑے چھوڑ کر بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گئی تھی۔ اگلی صبح وہ دن چڑھے تک سوتی رہی تھی' پھر جاگنے پر اس نے معمول کے مطابق گھنٹی بجا کر اپنے لیے ناشتہ طلب کیا تھا۔ ناشتے کے بعد زیوروں کو لکڑی اور سیپی کے بنے ہوئے ڈبوں میں رکھتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ اس کی زمرد کی انگوٹھی غائب ہے۔

کیا انگوٹھی کلب میں اس کی انگلی سے گر پڑی؟ یا واپسی پر کار میں؟ نہیں' اسے رات کو سونے سے پہلے انگوٹھی اتارنا اچھی طرح یاد تھا۔ اسے یاد تھا کہ ہمیشہ کی طرح اسے انگوٹھی اتارنے میں دقت ہوئی تھی۔ اس نے بستر کی چادریں اتار دیں' گدے کو الٹ دیا' تکیہ غلافوں کو جھاڑا' گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل مسہری کے نیچے گھس کر دیکھا۔ پھر اسے سرہانے کی میز پر ناشتے کی کشتی دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی اس نوعمر ملازمہ کا خیال آیا جو اسے لے کر صبح کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اسے کشتی کے رکھے جانے کی جھنکار' پردوں کا کھولا جانا اور کشتی کا پھر اٹھا کر سرہانے کی میز پر رکھا جانا یاد آیا۔ کمرے میں اس ملازمہ کے سوا کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔

کیا اسے اس کو بلا کر پوچھ گچھ کرنی چاہیے؟

بالآخر اسپرین کی دو گولیاں کھا کر اس نے شوہر کے کام پر سے واپس آنے تک کچھ نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جیسے ہی وہ دفتر سے لوٹا تھا اس نے سارا قصہ کہہ سنایا تھا اور اس نے اس کا بازو تھام کر اسے اپنے برابر میں بٹھا لیا تھا۔

''چلو اب سکون سے مجھے پورا واقعہ تفصیل سے سناؤ۔''

اس نے پوری بات' اس بار زیادہ تفصیل کے ساتھ دہرائی تھی۔

''تم نے اسے تلاش کیا؟''

''ہر جگہ۔ خواب گاہ اور غسل خانے کے کونے کونے میں' ہر ممکن اور غیر ممکن جگہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کو سونے سے پہلے میں نے انگوٹھی اتاری تھی۔''

گزشتہ رات کا خیال آنے پر وہ مسکرا اٹھا۔ پھر بولا۔

''جازیہ کے ناشتہ لانے کے بعد سے کوئی کمرے میں آیا؟''

''کوئی نہیں۔ میں نے جازیہ کو آج کمرے کی صفائی کرنے سے بھی منع کر دیا۔''

''تم نے اس سے ذکر تو نہیں کیا؟''

''نہیں۔ میں نے سوچا معاملہ آپ پر چھوڑ دوں۔''

''بہت اچھا کیا۔ اب جا کر اس سے کہو کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اسے کچھ بتانا مت' لیکن جب میں اس سے بات کروں تو یہیں موجود رہنا۔''

پانچ منٹ بعد نوعمر جازیہ' جسے انہوں نے حال ہی میں ملازم رکھا تھا' اپنی مالکن کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ سمیعہ گزر کر کمرے کے کونے میں چلی گئی اور جازیہ سینے پر ہاتھ باندھے' آنکھیں جھکائے عبود بے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''حضور؟''

''انگوٹھی کہاں ہے؟''

''کون سی انگوٹھی حضور؟''

"اداکاری مت کرو جیسے تمہیں پتا ہی نہیں۔ سبز نگینے والی انگوٹھی۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ انگوٹھی چپ چاپ واپس کردو، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"اگر میں نے دیکھی بھی ہو تو اللہ کرے میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اچانک اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔ لڑکی تیورا کر پیچھے کو ہوئی، اس نے ہاتھ گال پر رکھ لیا، پھر اس نے دوبارہ سینے پر ہاتھ باندھ لیے اور عبودبے کے سوالوں کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ آخر وہ بولا۔

"تمہارے پاس صرف پندرہ سیکنڈ ہیں، بتا دو کہ تم نے انگوٹھی کہاں چھپائی ہے، ورنہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ بہت برا ہوگا۔"

اس نے گھڑی دیکھنے کے لیے اپنی کلائی اٹھائی تو لڑکی ڈر کر پیچھے کو ہٹی، مگر اس کی خاموشی قائم رہی۔

جب وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھا تو سمیعہ نے سر اٹھا کر دیکھا کہ لڑکی کے گال آنسوؤں سے تر ہیں۔ عبودبے نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کا نمبر ملایا اور اسے مختصراً پوری بات بتائی۔

"ظاہر ہے میرے پاس ثبوت تو کوئی نہیں ہے لیکن صبح سے اور کسی نے کمرے میں قدم نہیں رکھا، اس لیے ضرور اسی نے لی ہوگی۔ بہرحال میں نے معاملہ آپ کے دانش مند ہاتھوں کو سونپ دیا ہے۔ میں جانتا ہوں آپ کے آدمیوں کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔"

☆

ایک دن بعد، آج تیسرے پہر وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے زیوروں کو ڈبے میں ترتیب سے رکھ رہی تھی کہ ایک بندا اس کے ہاتھ سے پھسل کر فرش پر گر پڑا۔ جب وہ اسے اٹھانے کو جھکی تو اسے زمرد کی انگوٹھی سنگھار میز اور دیوار کے بیچ میں اٹکی ہوئی دکھائی دی۔

اس لمحے سے اب تک وہ ایک اضطراب کے عالم میں بیٹھی اپنے شوہر کے کلب سے لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک بار تو اسے یہ ترغیب بھی ہوئی کہ دریا کے کنارے جا کر انگوٹھی کو پانی میں اچھال دے تاکہ اس ناخوش گواری سے بچ سکے جو آنے والی تھی۔

مکان کے گرد گھوم کر گیراج میں آتی ہوئی گاڑی کے ٹائروں کی آواز سن کر اس نے انگوٹھی جلدی سے اپنی انگلی میں چڑھا لی۔ جیسے ہی وہ داخل ہوا اس نے کھڑے ہو کر اسے انگوٹھی دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ جلدی جلدی کہنے کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرتے ہوئے اور پھر بھی جانتے ہوئے کہ وہ بے ڈھنگے پن سے بات کر رہی ہے، اس نے اس غیر معمولی اتفاق کی وضاحت کی کہ کس طرح بندے کے فرش پر گرنے کی وجہ سے اسے انگوٹھی دکھائی دے گئی اور کس طرح اس خیال آیا تھا کہ کلب میں ٹیلی فون کر کے اسے خوش خبری سنائے مگر......

اس نے شوہر کی چڑھی ہوئی تیوری دیکھ کر اپنی بات بیچ ہی میں روک دی اور جلدی سے کہا۔

"مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ ہوا کیسے۔ اب کیا کریں گے؟"

اس نے گویا حیرت کے انداز میں کندھے اچکائے۔

"تم مجھ سے پوچھ رہی ہو، جانِ من؟ ظاہر ہے، کچھ بھی نہیں کریں گے۔"

"لیکن وہ اس بے چاری لڑکی کی پٹائی کر رہے ہوں گے۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا وہ اعتراف کرائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔"

کسی عجلت کے بغیر وہ یوں بیٹھ گیا جیسے معاملے کے اس نئے پہلو پر غور کر رہا ہو۔ اپنا سگریٹ کیس نکال کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ کو اس کے ڈھکنے پر ٹھونکا، زبان پھیر کر ہونٹ تر کیے، سگریٹ کو ہونٹوں میں دبایا اور سلگایا۔ دھوئیں کے چھلے ٹھہری ہوئی ہوا میں تیرنے لگے اور وہ اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے

ہوئے بولا۔

"بہرحال، اب وہ اور کتنی دیر اسے وہاں رکھ سکتے ہیں؟ اگر وہ اعتراف نہ کرے یا کوئی شہادت نہ ملے تو اسے اڑتالیس گھنٹوں سے زیادہ تو رکھا نہیں جاسکتا۔ تھوڑی دیر اور وہاں رہ لینے سے اسے موت نہیں آجائے گی۔ اب تک سارا شہر جان چکا ہے کہ انگوٹھی ملازمہ نے چرائی ہے یا تم مجھ سے یہ توقع رکھتی ہو کہ جاکر سب لوگوں کو بتاؤں کہ بیگم صاحبہ بیئر کے دو گھونٹ پی کر ایسی مدہوش ہوگئی تھیں کہ انگوٹھی خود بہ خود ان کی انگلی سے اتر کر سنگھار میز کے پیچھے جا چھپی؟ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میں جانتی ہوں کہ بات ذرا شرمندگی کی ہے مگر......"

"ذرا شرمندگی کی؟ انتہائی مضحکہ خیز بات ہے۔ سنو، اب سوائے اس کے کچھ نہیں ہوسکتا کہ تم یہ انگوٹھی مجھے دے دو اور میں جب اگلی بار قاہرہ جاؤں تو اسے بیچ کر اس کی جگہ کچھ اور لے آؤں۔ ورنہ سارے شہر میں ہمارا مذاق بن جائے گا۔"

عبودبے نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور اس نے خود کو انگوٹھی اتار کر اس پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے پایا۔ وہ احتیاط کر رہی تھی کہ ان کی نظریں نہ ملنے پائیں۔ ایک لمحے کو اس میں احتجاج کی لہر سی اٹھی، بلکہ اس نے کچھ لفظ بھی منہ سے نکالے۔

"مگر میں کہتی ہوں ہمیں......"

انگوٹھی جیب میں رکھتے ہوئے وہ اس پر جھکا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے گال نرمی سے تھپتھپائے۔ وہ اس انداز کی عرصے سے عادی ہوچکی تھی، اس سے اسے تحفظ کے جاری رہنے کی تسلی ہوتی تھی، اسے احساس ہوتا تھا کہ اس آدمی نے جو اس کا شوہر ہے اور اس کے بچے کا باپ ہے، اس کی زندگی میں اس کے باپ کی جگہ لے لی ہے جو گویا اپنی ذمے داری ایک موزوں شخص کو سونپنے کے اطمینان میں شادی کے کچھ ہی دنوں بعد چل بسا تھا۔ یہ لمس اسے لفظوں سے کہیں زیادہ بلاغت سے یہ احساس دلاتا تھا کہ یہ شخص مرد ہے اور وہ عورت۔ اس شخص کا منصب ذمے داریاں اٹھانا اور فیصلے کرنا ہے اور اس کا کام صرف خوب صورت، مسرور اور بے فکر رہنا ہے مگر اب ان دونوں کی ساتھ گزاری ہوئی زندگی میں پہلی بار اسے یہ لمس اپنے چہرے پر ایک طمانچے کی طرح لگا۔

جوں ہی اس کے ہاتھ ہٹے سمیعہ کا پورا بدن ایک بے اختیار لرزے کی زد میں آگیا۔ اس خوف سے کہ کہیں اسے پتا نہ چل جائے، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی بڑی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے پیشانی آرام دہ سرد سطح سے لگالی اور کئی سیکنڈ تک آنکھیں بند رکھیں۔ جب اس نے آنکھیں دوبارہ کھولیں تو دیکھا کہ دریا کے دوسرے کنارے پر پیڑوں پر لگی ہوئی قہوہ خانے کی بتیاں روشن ہوچکی ہیں اور ان کے نیچے لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور ایک ویٹر میزوں کے درمیان آجا رہا ہے۔ ایک گزرتی ہوئی کشتی کے تاریک ہیولے نے ذرا دیر کے لیے قہوہ خانے کے منظر کو ڈھانپ لیا۔ اس کے سامنے والے حصے میں نصب لیمپ کی روشنی میں اس نے کشتی کو نیل کی سطح پر تیرتے نیلوفر کے بے جڑ کے پھولوں سے بنے ہوئے گھنی جزیروں کو کاٹ کر آگے بڑھتے دیکھا جنھیں لہریں اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں۔

اچانک اسے اپنے برابر میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"جب تک میں گاڑی باہر نکالوں، کیوں نہ تم جلدی سے جا کر تیار ہو جاؤ؟ آج ہوا گرم ہے، رات کا کھانا کلب میں کھایا جائے۔"

"کیوں نہیں؟ جیسا آپ کہیں۔"

جب وہ کھڑکی کے پاس سے مڑی تو مسکرانے لگی تھی۔

☆☆☆

پلاسٹک سرجری

راشدہ سعید

ایک چالاک تاجر کا احوال
اس کا واسطہ ایک تیز و طرار مجرم سے پڑ گیا تھا

فارغ لمحوں کے لیے ایک حتمی انجام کی پُرمزاح تحریر

شنکر داس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا اور اپنی سیکریٹری نیتو کا نمبر ملایا۔ رابطہ ملنے پر اس نے نیتو سے کہا۔ ”تم ذرا میرے پاس آجاؤ۔“ اس نے ریسیور واپس رکھ دیا اور اپنی شاندار بڑی میز پر بے چینی سے انگلیاں مارنے لگا۔

ذرا دیر بعد نیتو اس کے پاس آئی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھنے کے بعد بولی۔ ”جی سر؟“

”نیتو...... کل ہمیں دہلی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ میں



نے تمام تیاریاں مکمل کروالی ہیں۔ ہم ٹرین کے ذریعے جائیں گے۔ میں نے ٹرین کی سیٹیں بھی بک کروالی ہیں۔ اس مرتبہ ہمیں بہت ہوشیار رہنا ہے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ ان جواہرات کو چھیننے کے لیے ہمارے مخالف لوگوں نے شاکا گروپ سے بات کی ہے۔“ وہ بولا۔

”اوہ......“ نیتو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ تو واقعی خطرناک معاملہ ہوگیا ہے۔“ وہ جانتی تھی کہ شاکا گروپ بہت خطرناک ہے۔ اس گروپ کا لیڈر شاکا تھا۔ یہ گروپ جرائم کی دنیا کا ایک خطرناک ترین گروپ مانا جاتا تھا۔ قتل و غارت، لوٹ مار، اغوا، ڈکیتی اور دیگر جرائم ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

”ویسے تم فکر نہ کرو۔ میرے پاس بھی اسلحہ ہے گا اور میں نے دو پرائیوٹ جاسوسوں کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں۔ وہ بھی ہمارے آس پاس ہی رہیں گے اور بغیر ظاہر ہوئے ہماری حفاظت کریں گے۔“ نیتو کو پریشان ہوتے دیکھ کر شنکر داس نے کہا۔

”ٹھیک ہے سر!“ نیتو کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”اوکے بس اب تم جاؤ اور کام نمٹالو۔“ شنکر داس نے کہا۔

”بہتر سر!“ کہہ کر نیتو اٹھ کھڑی ہوئی۔

شنکر داس جواہرات کا ایک بہت بڑا بیوپاری تھا۔ اس کی ملک بھر میں کئی جیولری شاپس بھی تھیں۔ پورے ملک میں اور ملک سے باہر بھی اس کے جواہرات کے کئی کسٹمرز تھے۔ وہ یا تو خود مال لے جاتے تھے یا پھر شنکر داس کو پہنچانے کا کہہ دیتے تھے۔ شنکر داس کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا اس لیے جب کوئی کسٹمر اسے کہیں مال پہنچانے کا کہتا تو وہ خود آرڈر لے کر جاتا تھا۔ جیسے حالات ہوتے تھے ان کے حساب سے وہ حفاظتی انتظامات کرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی اسے دہلی کا ایک آرڈر ملا تھا اور اسے یہاں ممبئی سے آرڈر لے کر جانا تھا۔ دہلی ائیر پورٹ پر اس سے ایک مرتبہ پہلے بھی مال چھین لیا گیا تھا اس لیے اس مرتبہ وہ ٹرین سے مال لے کر جانا چاہتا تھا۔

نیتو، شنکر داس کی پرانی اور قابل اعتماد سیکریٹری تھی۔ وہ اس کے ساتھ گزشتہ چودہ سال سے کام کررہی تھی۔ شنکر داس کو اب اس پر مکمل اعتبار تھا اس لیے وہ نیتو کو کئی اہم ترین باتیں بھی بتادیتا تھا۔ نیتو بھی اس سے بہت مخلص تھی اور اس نے کبھی اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔

☆

شنکر داس اور نیتو ریلوے اسٹیشن پہنچنے کے بعد اپنے کمپارٹمنٹ میں آچکے تھے۔ یہ ائیر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ تھا اور یہاں ان کے علاوہ مزید چار آدمی موجود تھے جن میں سے دو وہی جاسوس تھے جنہیں شنکر داس نے ہائر کیا تھا۔ وہ بظاہر شنکر داس اور نیتو سے لاتعلق تھے۔ انہوں نے ہلکی پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنے چہرے تبدیل کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے شوکت علی نے کسی عالم فاضل اور ادیب قسم کے آدمی کا حلیہ بنایا ہوا تھا جبکہ للت ورمانے ایک کاروباری کا روپ دھارا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے حلیے کے مطابق اپنے سامان میں بھی کچھ ایسی چیزیں رکھی تھیں جو ان کے حلیے سے مماثلت رکھتی تھیں۔ باقی دو اجنبی مسافر تھے جبکہ وہ چاروں ان دونوں مسافروں سے پوری طرح محتاط تھے۔

شنکر داس نے ٹرین چلنے کے ذرا دیر بعد ہی نیتو سے کہا۔ ”میں اب اوپر برتھ پر جارہا ہوں، میں محتاط رہوں گا تم بھی محتاط رہنا۔“

”آپ بےفکر رہیں۔“ وہ بولی۔

شنکر داس برتھ پر آگیا۔ وہ بریف کیس جس میں جواہرات تھے، شنکر داس اسے اپنے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ اس کے جسم کے ساتھ اس کا ریوالور بھی لگا ہوا تھا۔

کمپارٹمنٹ میں موجود تمام لوگ ایک دوسرے سے لاتعلق تھے۔ للت اخبار پڑھ رہا تھا، شوکت علی ایک کتاب کا مطالعہ کررہا تھا، ایک مسافر سیٹ پر لیٹا کچھ سوچ رہا تھا جبکہ دوسرا مسافر اپنا سوٹ کیس کھولے اس میں موجود کپڑوں اور چیزوں کو الٹ پلٹ کررہا تھا۔

نیتو نے سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا دیا اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

اچانک لیٹا ہوا مسافر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیگر لوگوں پر نظر ڈالی اور مسکرا کر للت سے بولا۔ "کیا ہم لوگ اسی طرح خاموشی سے سفر گزار دیں گے؟"

"نہیں نہیں۔" للت نے بھی مسکرا کر کہا۔ "میں تو چاہ رہا ہوں کہ کوئی بات شروع کرے۔"

"لیجیے...... میں نے شروع کر دی۔" وہ آدمی گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"سب سے پہلے تو ہو جائے تعارف۔" للت نے کہا۔

"جی ہاں بالکل...... میرا نام راکیش ہے ممبئی کا رہنے والا ہوں اپنا پریس ہے میرا۔" اس نے تعارف کروایا۔

"میرا نام امیت ہے...... میں کپڑے کا کام کرتا ہوں۔ ہول سیل کا کام ہے میرا اور ایک سودے کے سلسلے میں دہلی جا رہا ہوں۔" للت بولا۔ اسے ان دونوں اجنبی مسافروں پر شک تھا کہ وہ شنکر داس سے جواہرات چھیننے کے لیے اس کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہے ہیں لیکن یہ صرف شک ہی تھا کیونکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ للت کو شک بھی اس لیے تھا کہ ہر کسی پر شک کرنا اس کے پروفیشن کا تقاضا تھا۔ ان دونوں نے عام موضوعات پر بات چیت شروع کر دی۔ اس دوران شوکت علی بھی یہ سمجھ کر کہ راکیش غلط نیت سے سفر کر رہا ہے' اس کی اور للت کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔

ذرا دیر بعد ہی دوسرے مسافر نے اپنا تعارف اجے سکسینہ کے نام سے کروایا اور وہ بھی ان کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔ نیتو ان سے لاتعلق تھی۔

"محترمہ!...... کیا آپ ہماری گفتگو میں شریک ہونا پسند کریں گی؟" للت نے نیتو سے کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ نیتو بھی بات چیت کرے ورنہ اسے خدشہ تھا کہ وہ بوریت کا شکار ہو جائے گی۔

"جی میں کیا بات کروں؟" نیتو نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"بات تو آپ نے کر دی' پھر بھلا بولنے والی کون سی بات رہ گئی؟" للت دھیرے سے ہنستے ہوئے بولا۔ نیتو کی بات پر باقی لوگ بھی ہنس دیئے۔

اوپر برتھ پر شنکر داس ان سب کی گفتگو سن رہا تھا۔ اسے یہ شک ہوا تھا کہ امیت اور اجے سکسینہ نے بات چیت شروع کر دی ہے۔ اب وہ دونوں کسی بھی لمحے اور کسی بہانے سے اپنی کارروائی کا آغاز کر کے اس سے بریف کیس چھیننے کی کوشش کریں گے۔ وہ پوری طرح محتاط اور تیار تھا۔ اس نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔

بات چیت کے دوران اجے سکسینہ نے کہا۔ "آج کل حالات بہت خراب ہو گئے ہیں' کسی جگہ جان اور مال محفوظ نہیں ہے۔ ٹرینوں میں بھی اکثر لوٹ مار ہوتی رہتی ہے' اس لیے میں تو پورے انتظامات کے ساتھ چلتا ہوں۔" اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ اسی وقت للت اور شوکت علی کے ہاتھ ان کے ریوالوروں کی طرف چلے گئے اور انہوں نے ریوالوروں کو گرفت میں لے لیا جو کہ ان کی جیبوں میں تھے۔ انہوں نے ان کی نالوں کا رخ اجے سکسینہ کی طرف کر دیا تھا کہ اگر وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کا ارادہ کرے گا' تو وہ اسے گولی مار دیں گے۔

اجے سکسینہ نے ایک بڑا سا خنجر نکالا اور سب کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھو دوستو! یہ میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں، یہ میرے کسی بھی برے وقت میں میرے کام آ سکتا ہے......" اس نے خنجر واپس بیگ میں رکھ دیا۔

للت اور شوکت علی کچھ مطمئن ہو گئے تھے کہ امیت نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی لیکن وہ دونوں اب بھی اس کی طرف سے پوری طرح محتاط تھے۔

"آج کل تو ریوالور اور گنوں کا دور ہے جبکہ آپ خنجر حفاظت کے لیے رکھتے ہیں؟" راکیش نے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اجے سکسینہ سے کہا۔

"بھئی!...... میں احتیاطاً ریوالور نہیں رکھتا ہوں کیونکہ ریوالور اگر چل جائے تو بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ٹریگر پر دباؤ ڈالنے کی دیر ہوتی ہے۔ انسان لڑھک جاتا ہے جبکہ خنجر کو جب تک بھرپور طریقے سے استعمال نہ کیا جائے اس سے کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔" اجے بولا۔

"یہ بہتر سوچ ہے آپ کی۔" راکیش نے بظاہر اس کی بات کو تسلیم کر لیا تھا لیکن دل سے تسلیم نہیں کیا تھا لیکن پھر اس نے سوچا کہ دنیا میں طرح طرح کے لوگ ہیں اور ہر ایک کی اپنی اپنی نفسیات ہے۔

سب مرد بہت باتیں کر رہے تھے جبکہ نیتو خاموش خاموش تھی۔ "کیا بات ہے...... آپ زیادہ نہیں بولتیں جبکہ خواتین کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ زیادہ بولتی ہیں لیکن لگتا ہے کہ آج ہم مردوں نے خواتین کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔" راکیش نے ہنس کر نیتو سے کہا۔ وہ بھی ہنس دی اور بولی۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا بولوں؟"

"میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ بار بار کچھ سوچنے لگتی ہیں...... کہیں آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟" راکیش بولا۔

"نہیں...... کوئی خاص نہیں۔ بس عام سی گھریلو باتیں ہیں...... دراصل میرا بڑا بھائی مجھ سے ناراض ہو گیا ہے اور میں اسے منا نہیں سکی ہوں۔ بس دل اسی کی طرف اٹکا ہوا ہے۔" نیتو نے جواب دیا۔

"اوہو ہو...... واقعی یہ تو افسوس ناک بات ہے۔" راکیش نے کہا۔ "بہرحال!...... فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... بھائی تو تمہارا اپنا ہی ہے ناں...... کسی بھی وقت منا لینا۔"

"ہاں بھئی...... یہ بات تو انہوں نے درست کہی کہ وہ بھائی تو تمہارا اپنا ہی ہے، کسی بھی وقت منا لینا اسے۔" اجے سکسینہ نے کہا۔

نیتو نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتائیں کہ آپ لوگ چائے پینا پسند کریں گے؟" راکیش نے سب کی طرف دیکھا۔ "میرے پاس تھرماس میں چائے موجود ہے۔"

للت اور شوکت علی نے انکار کر دیا۔ راکیش نے نیتو اور اجے سکسینہ کو چائے دی اور خود بھی پینے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ سب لوگ بات چیت بھی کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد شنکر داس اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے نیتو سے کافی مانگی۔

"کافی تو میں بھی پیوں گا۔" راکیش نے کہا۔

"سب ہی پئیں گے' آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟" نیتو نے مسکرا کر کہا اور پھر اس نے سب کو کافی پیش کی۔

کچھ دیر مزید گزری تو وہ سب مزید بے تکلف ہو گئے لیکن شنکر داس نے خود کو ان سے دور ہی رکھا تھا۔ البتہ کسی کسی وقت وہ ذرا سی دیر کے لیے نیچے اترتا اور پھر واپس اوپر برتھ پر چلا جاتا۔

رات ہو گئی' سب لوگوں نے کھانا کھایا اور اس کے بعد نیتو نے سب کو کافی پیش کی۔

کافی پینے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد سوائے نیتو کے سب لوگ بے ہوش ہو گئے۔ نیتو نے خود کافی نہیں پی تھی اس لیے اس کے بے ہوش ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آگے ایک چھوٹا اسٹیشن آ رہا تھا' جس پر ذرا دیر کے لیے گاڑی رکنا تھی۔

نیتو نے شنکر داس کے سر کے نیچے سے بریف کیس نکال لیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی اسٹیشن پر رکی۔ نیتو وہاں اتر گئی۔ وہ اسٹیشن سے خوب واقف تھی۔ وہ جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھ گئی۔

ذرا دیر بعد گاڑی چلی گئی۔ گیٹ پر جو چیکر کھڑا تھا' وہ بھی ہٹ گیا۔ نیتو اٹھی اور محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اسٹیشن کی عمارت سے باہر آئی۔ ذرا دور ہی اسے اپنی مطلوبہ کار نظر آ گئی۔ وہ اس میں بیٹھ گئی اور ڈرائیور نے کار چلا دی۔

☆

جب ٹرین دہلی کے اسٹیشن پر پہنچ گئی اور اس کا سفر

اختتام پذیر ہوگیا تو گاڑی میں ڈائننگ کمپارٹمنٹ کے ایک بیرے نے شنکر داس وغیرہ کو بے ہوش دیکھ کر پولیس کو مطلع کیا۔ پولیس نے اپنی کارروائی کی اور ان لوگوں کو پہلے اسپتال پہنچایا گیا۔ جب وہ لوگ ہوش میں آگئے تو شنکر داس نے صورت حال معلوم ہونے کے بعد اپنا سر پیٹ لیا۔

”حوصلہ کیجئے مسٹر شنکر داس!...... ہم آپ کی سیکریٹری نیتو کو جلد ہی گرفتار کرلیں گے۔“ انسپکٹر ورما نے شنکر داس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”اب...... اب وہ کہاں ملے گی انسپکٹر صاحب؟“ شنکر داس روتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”وہ تو جواہرات لے کر نہ جانے کہاں سے کہاں چلی گئی ہوگی۔“

”آپ حوصلہ کریں...... آپ کا تعاون ہمارے ساتھ رہا تو ہم ضرور اسے پکڑ لیں گے۔“ انسپکٹر ورما بولا۔

اچانک شنکر داس کے موبائل فون کی بیل بجی اس نے فون کان سے لگایا اور شکستہ لہجے میں بولا۔ ”ہیلو؟“

”شنکر داس جی؟“ ایک مردانہ آواز آئی۔

”وہ بول رہا ہوں۔“

”آپ کی سیکریٹری نیتو آپ سے بات کریں گی۔“

”مجھ سے؟“ شنکر داس چراغ پا ہو کر بولا۔ ”کراؤ اس سے میری بات۔“

”ہیلو سر!...... کیسے ہیں آپ؟ خیریت سے تو ہیں ناں؟“ نیتو کی مری مری آواز آئی۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں لیکن میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ پولیس لگ چکی ہے تمہارے پیچھے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں سر آپ؟“ نیتو حیرت سے بولی۔ ”پولیس میرے پیچھے کیوں لگ گئی؟“

”اچھا!“ شنکر داس طنزیہ انداز میں بولا۔ ”تم اتنی بڑی واردات کر کے چلی گئی ہو اور پھر بھی پولیس تمہارے پیچھے نہیں لگے گی؟“

”لیکن سر!...... میں نے کون سی واردات کی ہے؟“ نیتو کا لہجہ اب مزید حیرت زدہ ہوگیا تھا۔

”جواہرات لے آؤ شرافت سے، میں پولیس سے سفارش کر کے تمہیں بچالوں گا۔“ شنکر داس بولا۔

”سر!...... یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟...... میں تو کل سے یہاں ممبئی کے سٹی اسپتال میں ہوں۔“

”کیا؟“ اب حیرت زدہ ہونے کی باری شنکر داس کی تھی۔ ”یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟...... اوہ اچھا...... اب میں سمجھا...... تم کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہی ہو۔“ پھر وہ کڑک دار آواز میں بولا۔ ”یہ بات ذہن سے نکال دو کہ تم کوئی چال چل سکو گی، سمجھیں؟...... بس ایک ہی راستہ ہے تمہارے پاس بچنے کا...... شرافت سے زیورات لے آؤ، معافی مانگ لو، میں اب پھر کہتا ہوں کہ میں پولیس سے سفارش کر کے تمہیں سزا سے بچالوں گا۔“

”آپ میری بات تو سنیں سر!“ نیتو زچ ہو کر بولی۔ ”میں کل سے یہاں سٹی اسپتال میں بے ہوش تھی۔ ابھی ہوش آیا ہے تو میں نے یہاں ڈاکٹر سے کہا کہ فوراً آپ کی خیریت دریافت کی جائے۔“

”یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ شنکر داس الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں سر!“

”نہیں...... یہ جھوٹ ہے...... یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم کل سے وہاں اسپتال میں ہو؟...... تم تو میرے ساتھ سفر کر رہی تھیں۔“

”میں نے تو آپ کے ساتھ سفر کیا ہی نہیں۔ سر!...... میں تو جب آپ کے پاس آفس آنے کے لیے گھر سے نکلی تو مجھے آپ کے ریفرنس سے ایک عورت مل گئی۔ وہ کہنے لگی کہ آپ کے حوالے سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ مجھے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ اس نے مجھے کوئی مشروب پلایا اور پھر مجھے پولیس والوں نے ایک جگہ جھاڑیوں میں بے ہوش پایا اور مجھے اسپتال میں داخل کروادیا گیا۔ اب مجھے ہوش آیا ہے۔“

”یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ شنکر داس نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سر!...... میری بات کا ثبوت یہ اسپتال والے اور وہ پولیس والے ہیں جو مجھے بے ہوشی کی حالت میں یہاں لے کر آئے تھے۔“ وہ بولی۔

”مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔“ شنکر داس جھنجلا کر بولا۔

”کیا بات ہے شنکر داس جی؟“ انسپکٹر ورما نے اس سے پوچھا۔ شنکر داس نے مختصراً اسے سب کچھ بتادیا۔

”لائیے یہ فون مجھے دیجئے!“ انسپکٹر ورما نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ شنکر داس نے فون اسے دے دیا۔

”میں انسپکٹر ورما بات کر رہا ہوں۔“ انسپکٹر ورما نے کہا۔

”اوہ سر!...... میں...... میں نیتو بول رہی ہوں۔ شنکر جی کی سیکریٹری...... وہ...... دراصل...... میں۔“

”حوصلہ کریں نیتو جی!...... مجھے اطمینان سے بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟“ انسپکٹر ورما بولا۔

نیتو نے اسے بھی وہی کچھ بتادیا جو شنکر داس کو بتایا تھا۔

”اچھا کوئی پولیس مین آپ کے پاس موجود ہے؟“ انسپکٹر ورما نے پوچھا۔

”جی ہاں...... انسپکٹر اجیت ہیں۔“

”ذرا فون انہیں دیں۔“

”ہیلو!...... انسپکٹر اجیت اسپیکنگ!“ انسپکٹر ورما کے کان میں آواز آئی۔

”میں انسپکٹر ورما بات کر رہا ہوں...... انسپکٹر کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ وہاں کیا معاملہ ہے؟“

”یہ لڑکی کل ہمیں جھاڑیوں میں بے ہوش ملی تھی۔ ہم نے اسے اسپتال میں داخل کروادیا اور اب اسے ہوش آیا ہے...... بس یہی معاملہ ہے۔“ انسپکٹر اجیت نے جواب دیا۔

”اوکے!...... میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شنکر داس جی کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟“ اس نے شنکر داس کا سارا واقعہ اسے سنادیا۔

”اوہ انسپکٹر ورما!“ انسپکٹر اجیت نے کہا۔ ”تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کوئی لڑکی نیتو بن کر شنکر داس کے ساتھ سفر کرتی رہی اور اپنا کام کر کے چلتی بنی۔“

”ہاں، بالکل!“ انسپکٹر ورما نے اس کی تائید کی۔ ”اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہوسکتی۔“

”اوکے!...... تم وہاں معاملہ سنبھالو اور میں یہاں سنبھالتا ہوں...... اب ہمارا مقصد اس نقلی نیتو کو پکڑنا ہوگا۔“ انسپکٹر اجیت بولا۔

”بے شک!...... اوکے؟“

”اوکے۔“

ان لوگوں کا رابطہ منقطع ہوگیا۔

”انسپکٹر صاحب!...... یہ نقلی نیتو کا کیا معاملہ آگیا؟“ شنکر داس نے کہا، وہ بہت پریشان تھا۔

”کوئی لڑکی نیتو بن کر آپ کے ساتھ سفر کرتی رہی اور اس نے وہاں ممبئی میں اصلی نیتو کو بھی کچھ کھلا پلا کر بے ہوش کردیا اور اسے جھاڑیوں میں پھینک دیا تھا۔ ممکن ہے ان لوگوں کا خیال ہو کہ اصلی نیتو مر چکی ہے یا مر جائے گی لیکن وہاں اسے پولیس والوں نے دیکھ لیا اور اسپتال پہنچادیا...... اب کیس واضح ہو چکا ہے۔ انسپکٹر اجیت وہاں ممبئی میں اس نقلی نیتو کو پکڑنے کی کوشش کرے گا اور ہم یہاں کوشش کریں گے۔“ انسپکٹر ورما نے کہا۔

”مہربانی کرو انسپکٹر!...... اس نقلی نیتو کو کسی طرح پکڑو...... میرے وہ جواہرات بہت قیمتی ہیں۔ میں...... میں سفارش کر کے تمہارا عہدہ بڑھوادوں گا۔ حکومت کے لوگوں سے میری اچھی خاصی بات ہے۔“ شنکر داس نے کہا۔

”نہیں...... مجھے کسی عہدے کی تمنا نہیں ہے۔“ انسپکٹر ورما بولا۔ ”میری تو بس یہ خواہش ہے کہ وہ نقلی نیتو پکڑی جائے۔“

☆

دو دن گزر گئے لیکن پولیس کو اس نقلی نیتو کو پکڑنے

میں کامیابی نہیں ہوئی۔

"انسپکٹر صاحب!...... آپ لوگوں کی کوششیں تو مجھے رائیگاں جاتی نظر آتی ہیں۔" شنکر داس نے انسپکٹر ورما سے کہا۔ وہ لوگ اس وقت پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسے کیسز میں وقت تو لگتا ہے۔" انسپکٹر نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شنکر جی!...... فکر نہ کریں...... ہم بھرپور کوشش کررہے ہیں۔ آپ کا مال جلد ہی مل جائے گا۔" انسپکٹر نے تسلی دی۔

شنکر داس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر شدید مایوسی کے تاثرات بھی آگئے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں پر سے چشمہ اتار لیا اور رومال سے اس کے شیشے صاف کرنے لگا۔

اور پھر ایک ہفتہ گزر گیا لیکن معاملہ ذرا ٹس سے مس نہ ہوا۔ بالآخر تنگ آکر شنکر داس نے انسپکٹر ورما سے کہا۔

"انسپکٹر صاحب!...... میرے کام کا بڑا حرج ہورہا ہے۔ میرے لیے اب مناسب یہ ہے کہ میں واپس ممبئی چلا جاؤں اور آپ سے رابطہ رکھوں۔"

"جی یہ بہت مناسب رہے گا۔" انسپکٹر ورما نے کہا۔ "اس کیس میں مزید دن بھی لگ سکتے ہیں اور یہاں آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ یہ بہت مناسب ہے کہ آپ واپس ممبئی چلے جائیں اور مجھ سے رابطہ رکھیں۔ میں تو یہاں کوشش کرہی رہا ہوں۔ وہاں آپ انسپکٹر اجیت کی کارکردگی بھی دیکھ سکیں گے۔"

"پیش رفت تو اس طرف سے بھی نہیں ہوئی ہے ناں کوئی۔" شنکر داس اب بھی اداسی کے شکنجے میں تھا۔ "وہ بھی بس اب تک کوششیں کررہا ہے۔"

"شنکر جی!...... یہ ایک بڑی واردات ہے۔" انسپکٹر ورما قدرے چڑچڑاہٹ سے بولا۔ "یہ کوئی چھوٹی موٹی چوری کی واردات نہیں ہے۔ بڑی پلاننگ سے یہ بڑا کام کیا گیا ہے۔ اگر یہ مسئلہ جلد حل ہوجائے تو آپ کی خوش قسمتی ہوگی ورنہ ایسے کیسز تو مہینوں لے لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جی!...... آپ جیسا بہتر سمجھیں کریں...... مجھے تو اپنا مال واپس چاہیے ورنہ میں اوپر کسی وزیر مشیر سے بات کرلوں گا۔"

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں ہے۔" انسپکٹر ورما فوراً سنبھل گیا۔ شنکر داس کی دھمکی نے اس پر اثر کیا تھا۔ "میں آپ سے کہہ رہا ہوں ناں کہ ہم اپنی پوری طاقت اور صلاحیت کے ساتھ کام کررہے ہیں لیکن آپ مہربانی کریں کہ ہمیں ٹارچر نہ کریں، اس طرح ہماری کارکردگی متاثر ہوگی۔ ہمیں ذرا تسلی سے کام کرنے دیں۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" شنکر داس بولا۔ "آپ تسلی سے کام کریں لیکن اگر دس دن کے اندر اندر مجھے میرا مال واپس نہ ملا تو میں اوپر بات کرلوں گا۔"

"بہتر ہے۔" انسپکٹر ورما سوچتے ہوئے بولا۔

اسی روز شنکر داس نے واپسی کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ منگوا لئے۔ جب وہ ٹیکسی میں ایئرپورٹ جارہا تھا تو اس کے موبائل فون کی بیل بجی۔ اس نے حسب عادت اسکرین پر نمبر دیکھے بغیر فون کان سے لگالیا اور بولا۔ "ہیلو؟"

"کیسے ہو شنکر داس؟" ایک مردانہ جانی پہچانی آواز اسے آئی۔

"تت...... تم...... لکشمن؟" وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں...... خوب پہچانتے ہو میری آواز؟" لکشمن دھیرے سے ہنس کر بولا۔

"بولو...... کیا بات ہے؟" شنکر داس نے کرخت لہجے میں کہا۔ وہ لکشمن سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لکشمن جرائم کی دنیا کا آدمی تھا اور اس کا اپنا گروپ تھا۔ شنکر داس پہلے اس سے مختلف غیر قانونی کام لیتا رہتا تھا لیکن بعد میں ان دونوں میں تلخی ہوگئی تھی جو ترک تعلقات پر منتج ہوئی۔ اب تقریباً چھ ماہ بعد لکشمن نے شنکر داس سے رابطہ کیا تھا۔

"سنا ہے...... بڑا مال چلا گیا ہے تمہارا؟" لکشمن نے ...گوار لہجے میں کہا۔

"...ہاں تو تمہیں کیا؟" شنکر داس نے چٹاخ سے ...ب دیا۔

"...سنا ہے کہ دو جاسوس بھی رکھے ہوئے تھے تم نے؟" ...من نے اس کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے بدستور ...گوار انداز میں کہا۔

"لیکن تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

"اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ دونوں جاسوس پلاسٹ سرجری ...چہرہ بدلے ہوئے تھے؟"

"ہاں...... تو پھر؟"

"بڑے افسوس کی بات ہے...... کیسے جاسوس رکھ لیے ...تم نے؟...... ان کی موجودگی میں ایک عورت انہی کی ...رح پلاسٹک سرجری میں سب کو دھوکا دے گئی۔"

"کیا؟" اب شنکر داس کا ماتھا ٹھنکا۔ "یہ تمہیں کیسے ...علوم ہے؟"

"ارے چھوڑو شنکر جی!...... اب وہ مال واپس نہیں ...ے کا...... میں نے تو افسوس کے لیے فون کیا تھا...... ...رام جی کی۔" اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

...نکر داس کچھ دیر تو سکتے کی کیفیت میں رہا، پھر جب ...ہوش آیا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اب اسے پوری ...رح یقین ہوگیا تھا کہ اس کا مال واپس نہیں ملے گا۔ ...کیونکہ لکشمن ایک چھلاوہ تھا اور اس تک پہنچنا پولیس یا کسی ...کے بس کی بات نہیں تھی۔

اگلے ہی لمحوں میں ٹیکسی ایک سگنل پر رک گئی۔ دوسری گاڑیوں وغیرہ کے ساتھ ایک اسپورٹس موٹر ...ائیکل بھی شنکر داس کی کھڑکی کے بالکل ساتھ آکر رکی۔ ...نکر داس نے اس پر سوار آدمی کو دیکھا جس نے ہیلمٹ ...میں اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اس آدمی نے ہیلمٹ اتار کر فوراً ...ان لیا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی شنکر داس مچھلی کی ...رح تڑپ گیا تھا اور وہ فوراً دروازہ کھولنے کی کوشش ...کرنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹیکسی سے نیچے اترتا اور موٹر سائیکل سوار تیزی سے گاڑیوں کے درمیان سے جگہ بناتا آگے چلا گیا۔

شنکر داس چند قدم اس کی طرف بھاگا لیکن پھر فوراً پلٹا۔ اس وقت سگنل گرین ہوگیا۔ موٹر سائیکل سوار تیزی سے آگے نکل گیا۔

شنکر داس ٹیکسی میں بیٹھا اور سامنے ٹریفک کی طرف دیکھتا ہوا ڈرائیور سے بولا۔ "وہ...... وہ جو موٹر سائیکل والا تھا...... تم...... تم اس کا تعاقب کرو......"

"لیکن صاحب!...... وہ تو پتہ نہیں کہاں کا کہاں چلا گیا۔ آگے اتنی گاڑیاں ہیں اور پھر ٹیکسی میں اس موٹر سائیکل کا تعاقب نہیں ہوسکتا اسپورٹس موٹر سائیکل ہے اور اس کا سوار بھی کوئی ایکسپرٹ لگتا ہے۔" ڈرائیور نے معذرت کرلی۔

"کیسی ٹیکسی ہے یہ!" شنکر داس نے جھنجلا کر ڈرائیور کی سیٹ کے عقبی حصے پر مکا مارا۔

"جی...... میں سمجھا نہیں؟" ڈرائیور الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تمہیں پتہ ہے وہ موٹر سائیکل والا کون تھا؟" شنکر داس بولا۔

"کون تھا صاحب؟" ڈرائیور جلدی سے بولا۔

"ایک بڑے مجرم لکشمن کا نام سنا ہے؟"

"لکشمن؟...... ممبئی والا؟" ڈرائیور نے قدرے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ لکشمن کی شہرت لکشمن ممبئی والا کے نام سے ہی تھی۔

"ہاں ہاں وہی...... وہ تھا اس موٹر سائیکل پر۔"

"کیا؟" ڈرائیور کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر وہ بولا۔ "اچھا ہوا صاحب ہم نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ ایسے لوگوں سے تو کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہیے۔"

شنکر داس اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا لیکن ڈرائیور نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے ٹیکسی چلادی۔

☆☆☆

حقدار

نیلم خاتون

ایک ناقدر بیوی کی ناقدری کا احوال؛ جس نے خود اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ایک قدرداں عورت کی قدردانی کی داستان جس نے اپنی بکھری زندگی کو کسی کی زندگی سنوار کر جنت زار بنالیا۔ ایک سبق آموز کہانی ان عورتوں کے لیے بطورِ خاص جو اپنے شوہروں کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہیں لیکن اس بات سے بے خبر کہ مجازی خدا تو کچھ نہیں کرسکتا مگر اس مجازی خدا کا خدا تو کر سکتا ہے۔

اماں حوا نے ایک غلطی کر کے جنت کیا ٹھکرائی، دخترِ حوا بھی آج یہی کچھ کرتی چلی آ رہی ہے

"ارے بھئی سلمیٰ...... میرا کوٹ تو لے آؤ۔" انور نے بلند آواز میں کہا۔

"جی ابھی لارہی ہوں۔" دوسرے کمرے میں موجود انور کی بیوی سلمیٰ بھی بلند آواز میں بولی اور پھر وہ انور کا کوٹ لے کر اس کے پاس آئی۔ اس نے کوٹ انور کے قریب کرتے ہوئے کہا کہ۔ "یہ لیجیے...... میں چائے لے کر آرہی ہوں۔"

"بھئی میں تمہیں بہت زحمت دیتا ہوں۔" انور نے اپنی بیمار آنکھوں سے سلمیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے؟" سلمیٰ شکایتی انداز میں بولی۔ "میں آپ کی بیوی ہوں اور اس طرح کے کام بیویوں ہی کے ہوتے ہیں۔ اب میں آپ کے کام نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا!" اپنی بات کہتے ہوئے سلمیٰ کمرے سے نکل گئی اور انور کوٹ اٹھا کر اسے پہننے لگا۔

ذرا دیر بعد سلمیٰ واپس آ گئی۔ اس نے چائے انور کے سامنے رکھ دی تو انور … کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں؟" سلمیٰ بولی۔

"سلمیٰ!...... میں سوچ رہا ہوں کہ تم کتنی ہمت والی ہو۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟" سلمیٰ نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔

"مطلب یہ کہ تم میرے جیسے مریض آدمی کے ساتھ زندگی گزار رہی ہو اور میری بیماری کو بھی تین سال ہونے والے ہیں اور نہ جانے کب ٹھیک ہوں گا۔"

"یہ...... یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

انور نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں میں...... تم خوب صورت ہو، جوان ہو اور میں......"

"تو آپ جوان نہیں ہیں کیا؟" سلمیٰ نے اس کی بات کاٹ دی۔ انور کے چہرے پر ایک بار پھر تلخ مسکراہٹ آئی۔ "میں جوان تھا لیکن...... اب نہیں ہوں...... اس ٹی بی کی بیماری نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا...... بچے چھوٹے ہیں یہ اگر نہ ہوتے یا بڑے ہوتے تو میں تمہیں آزاد......"

سلمیٰ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور شکایتی لہجے میں بولی۔ "یہ...... یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"



"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سلمیٰ!" وہ اداسی سے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ ایک عورت کی کیا خواہشات ہوتی ہیں اور میں تمہاری ان خواہشات کو فی الحال مکمل طور پر پورا نہیں کرسکتا اس لئے مجھے افسوس ہوتا ہے۔"

"یہ آج آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ کیوں کررہے ہیں ایسی باتیں؟ کیا میری کوئی بات بُری لگی ہے؟" وہ بولی۔

"ارے نہیں۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "تم یہ کبھی نہ سوچنا کہ مجھے تمہاری کوئی بات بُری لگ سکتی ہے۔ مجھے تو تم پر فخر ہے کہ تم میرا اتنا خیال رکھتی ہو، ہر طرح سے مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہو۔"

"تو پھر ایسی باتیں کیوں کررہے ہیں؟" وہ بلاتوقف بولی۔

"بس ویسے ہی...... سوچتے سوچتے جب خاموش رہنے کی ہمت نہ رہی تو میں نے یونہی شروع کردیا۔ اچھا...... چلو چھوڑو ان باتوں کو...... میں چائے پی لوں پھر مجھے جلد ہی دکان پر جانا ہے۔ اس نے چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے چائے پی لی تو اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلمیٰ بھی کھڑی ہوگئی۔ انور نے محسوس کیا کہ وہ اُداس ہے وہ بولا۔ "کیا بات ہے...... تم اُداس اُداس کیوں ہو؟...... کیا میری باتیں بُری لگیں؟"

"آپ کی باتوں نے میرا دل توڑ دیا؟" وہ نظریں جھکائے جھکائے شکستہ آواز میں بولی۔

انور نے اس کے بازو پکڑ لئے اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا بھئی!...... میں معافی چاہتا ہوں...... اور...... وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی باتیں نہیں کروں گا۔"

"پکا وعدہ کرتے ہیں؟" اس نے نظریں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پکا...... بالکل پکا۔" اس نے کہا۔ "اب تو معاف کردو۔"

"انور!" وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ "بس یہ ذہن میں رکھیں کہ میں آپ کی بیماری اور ہر طرح کی تکلیف برداشت کرسکتی ہوں لیکن اس طرح کی باتیں برداشت نہیں کرسکتی۔"

"ارے بھئی!" اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "لو!...... اب معاف کردو، آئندہ کبھی نہیں کروں گا ایسی باتیں۔"

سلمیٰ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے سینے سے لگ گئی۔ انور نے اسے بھینچ لیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں الگ ہوئے اور انور اس سے کچھ گھریلو باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔ وہ اپنی دکان پر جانا چاہتا تھا جہاں اسے دن بھر بیٹھ کر دکان داری کرنی تھی۔ شہر کی ایک معروف مارکیٹ میں اس کی کاسمیٹکس کی دکان تھی جس سے اچھی خاصی آمدنی ہوجاتی تھی۔ اس کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن بس اسے یہ غم تھا کہ وہ بیمار تھا۔ مسلسل علاج کرانے کے باوجود وہ صحت یاب نہیں ہو پارہا تھا۔ اس وجہ سے جہاں اس کے بہت سے کام متاثر رہتے تھے وہیں وہ اپنی بیوی سلمیٰ کو بھی درست طور پر قربت نہیں دے سکتا تھا۔

وہ گھر سے نکلنے کے بعد ایک دوست احمد کے پاس آگیا۔ یہاں سے اسے کچھ سامان لے کر اپنی دکان پر جانا تھا۔ مگر دس پندرہ منٹ احمد سے باتوں کے بعد اسے یاد آیا کہ وہ اپنی ڈائری اپنے گھر میں میز کی دراز میں بھول آیا ہے۔ وہ واپس گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر میں ایک بڑا گیٹ لگا تھا اور اس میں ایک ذیلی گیٹ بھی تھا جس کی ایک چابی انور بھی اپنے پاس رکھتا تھا تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ اس نے چابی کی مدد سے وہ گیٹ کھولا اور گھر میں داخل ہوگیا۔ بیماری نے اسے آہستہ چلنے پر مجبور کردیا تھا اس لئے وہ مدہم رفتار سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور جب وہ اس کے قریب پہنچا تو کسی مرد کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ سلمیٰ اس سے بات چیت کررہی تھی اور ہنستی بھی جارہی تھی۔ ان کی باتوں کی آواز مدہم تھی اس لئے انور کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔

وہ دبے قدموں کمرے کی جانب بڑھا۔ دروازے سے پہلے کھڑکی پڑتی تھی وہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔

"تم اتنے نخرے کیوں کرتی ہو؟" مرد کی آواز آئی۔ انور اس آواز کو پہچان گیا۔ وہ اس کے محلے دار الیاس کی آواز تھی۔

سلمیٰ ہنس کر بولی۔ "تم ہی تو کہتے ہو کہ میں نخرے کرتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہوں۔"

"لیکن میری جان!...... اتنے بھی نخرے نہ کیا کرو، چلو آجاؤ یہاں...... آؤ...... کیا خوبصورت ہیں تمہارے ہونٹ......"

انور کے تن بدن میں آگ لگ چکی تھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سلمیٰ اسے اس طرح دھوکا دے گی۔ وہ جذبات سے مغلوب ہوکر تیزی سے کھڑکی کے سامنے آگیا اور کمرے کے اندر نگاہ ڈالی، سلمیٰ اور الیاس بیڈ پر تھے۔ دونوں ایک دوسرے میں گم ہونے کی کوشش کررہے تھے۔

"بہت خوب!" انور نے تلخ لہجے میں کہا تو الیاس اور سلمیٰ کو جیسے بچھو نے ڈنک ماردیا ہو۔ وہ دونوں بُری طرح اُچھل کر الگ ہوگئے۔

"اوہ...... تت...... تم...... کب...... آئے؟" سلمیٰ نے بوکھلائے ہوئے انداز میں انور سے کہا۔

"اسے چھوڑو کہ میں کب آیا لیکن میرا خیال ہے کہ میں بڑے صحیح وقت پر آیا ہوں۔" انور نے تلخ لہجے میں کہا اور کھڑکی سے ہٹنے کے بعد دروازے سے کمرے میں آگیا۔ اس نے سلمیٰ کی طرف دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم تو مجھ سے بہت وفاداری کے دعوے کرتی رہی ہو؟"

سلمیٰ نے سر جھکا لیا۔

"مجھے معاف کردو انور بھائی!...... مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔" الیاس نے شرمندہ ہوکر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

انور اس وقت جذبات کے شکنجے میں تھا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ فوراً الماری کھولی اور اس کے اوپری خانے میں سے نکالتے ہوئے اس نے جذباتی اور نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم سے تو غلطی ہوگئی...... لیکن مجھ سے غلطی نہیں ہوگی میں بالکل تمہارے دل میں یہ خنجر اُتار دوں گا۔"

انور جب خنجر نکال رہا تھا تو اس دوران سلمیٰ الیاس کے سامنے آگئی تھی اور جب انور نے الیاس کو مارنا چاہا تو وہ بولی۔ "اسے مارنے سے پہلے تمہیں مجھے مارنا ہوگا۔"

"کیوں؟...... اتنی محبت ہوگئی ہے تمہیں اس سے؟" انور پھنکارا۔

"ہاں...... میں اس سے شدید محبت کرتی ہوں اور اس کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔" وہ بولی۔

"بہت خوب۔" انور نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "میں جو تمہیں پالنے کے لئے رات دن ایک کررہا ہوں۔ بیماری کو نظر انداز کر کے محنت کرتا ہوں تاکہ تم خوش رہ سکو تو میری کوئی اہمیت نہیں ہے؟"

"تمہاری اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن...... یہ میرا پیار ہے۔" سلمیٰ اب مضبوط لہجے میں بات کررہی تھی۔

"میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" انور نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"تم بھی جیل جاؤ گے اور...... بچے ذلیل وخوار ہوجائیں گے۔" سلمیٰ بولی۔

"تو تم نے یہ حرکتیں کرتے ہوئے نہیں سوچا کہ بچے ذلیل وخوار ہوجائیں گے؟" انور نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوچا تھا لیکن...... بس میں مجبور ہوں...... میں بچوں کا ہی سوچ کر الیاس سے دور بھی ہوگئی تھی لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی ہوں۔

"اور بچوں کے بغیر؟" انور نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ان کے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔" جواب ملا۔

"اور میں کس کھاتے میں ہوں؟"

"تم میرے شوہر ہو لیکن میرا پیار نہیں۔"

"ذلیل عورت!" انور دھاڑا۔ "میں تجھ جیسی عورت کے

ساتھ نہیں رہ سکتا۔“
”چیخو نہیں۔“ سلمٰی نے اسے جھڑک دیا۔ ”میں کب تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں‘ میں تو بچوں کی وجہ سے یہاں رہ رہی ہوں۔“
”بچوں سے اگر تمہیں لگاؤ ہوتا تو تم ایسی حرکتیں نہ کرتیں ذلیل عورت!“ انور پھر دہاڑا۔ ”میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔“
”دے دو۔“ سلمٰی بے نیازی سے بولی۔ ”لیکن میں الیاس کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔“
”اگر اس سے اتنا پیار ہے تو مجھ سے خلع لے لو تا کہ میں بچوں کو اپنے پاس رکھ سکوں۔“ انور اب کچھ سنبھل گیا تھا۔
”ٹھیک ہے‘ مجھے منظور ہے۔ ویسے بھی الیاس مجھے کہتا تھا کہ میں تم سے طلاق لے لوں تو یہ مجھ سے شادی کر لے گا۔ اب ہم لوگ شادی کر لیں گے۔ اس کے بعد الیاس کے بچے ہو جائیں گے تو مجھے ان کی طرف توجہ کرنی ہوگی اور ویسے بھی اپنے بچے تم اپنے پاس ہی رکھو تو بہتر ہے کیونکہ صاف بات یہ ہے کہ جب وہ میرے ساتھ رہیں گے تو الیاس اپنے بچے ہو جانے کے بعد ان کے ساتھ انصاف نہیں کرے گا۔“ سلمٰی مدلل گفتگو کر رہی تھی۔
”ٹھیک ہے‘ مجھے لکھ کر دو کہ تم مجھ سے خلع چاہتی ہو‘ میں تمہیں خلع دے دوں گا۔“ انور نے کہا۔
اور پھر اسی روز خلع کا معاملہ طے پا گیا سلمٰی‘ الیاس کے ساتھ چلی گئی اور انور اپنے دونوں بچوں کو سینے سے لگا کر بیٹھ گیا۔ بچے چھوٹے تھے اس لئے سمجھ ہی نہ سکے کہ ان پر کیا قیامت گزر گئی ہے وہ دونوں معصوم نظروں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بڑا عدنان چھ سال کا تھا اور چھوٹا عمران پانچ سال کا تھا

☆

سلمٰی کے چلے جانے کے بعد انور کی پریشانی مزید بڑھ گئی تھی۔ گھر اور بچوں کو سنبھالنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ امجد اس کا بچپن کا دوست تھا وہ دونوں ایک دوسرے سے دل کی بات کہہ لیتے تھے۔ انور نے امجد کو بھی سلمٰی کا سارا معاملہ بتا دیا تھا۔ امجد نے اس پر کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن اب وہ بچوں اور انور کو پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی ثریا خاصی بد اخلاق عورت تھی اس لئے وہ انور کے بچوں کو اپنے گھر لے جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ادھر انور کا اس دنیا میں صرف ایک بھائی اختر کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اور اختر اپنی فیملی کے ساتھ ملائشیا میں رہ رہا تھا۔
”انور!...... میں نے تیرے لئے ایک بات سوچی ہے یار!“ ایک روز امجد نے کہا وہ دونوں اس وقت امجد کی دکان میں بیٹھے تھے۔
”کیا بات سوچی ہے؟“ انور بولا۔
”دیکھ تو مجھ سے کئی مرتبہ یہ کہہ چکا ہے کہ عورت ذات پر سے تیرا اعتبار اٹھ گیا ہے لیکن یار!...... دنیا میں صرف ایک ہی طرح کی عورتیں نہیں ہیں...... بہت اچھی‘ وفادار اور محبت کرنے والی عورتیں بھی تو موجود ہیں۔“ امجد نے کہا تو انور نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔
”کیا کہنا چاہتا ہے تو؟“
امجد نے ایک گہرا سانس لیا اور سر جھکا کر بولا۔
”تم ایک اور شادی کر لو۔“
”کیا؟“ انور بلاتوقف بولا۔
”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تمہیں ایسا کر ہی لینا چاہیے۔“
”لیکن میں یہ......“
”بچوں کا مسئلہ ہے یار۔“ وہ انور کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو!...... میری نظر میں ایک اچھی عورت ہے۔ ہے تو طلاق یافتہ لیکن...... تمہارے لئے بہت مناسب رہے گی۔ اسے اس کے شوہر نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق دے دی تھی۔ دل ٹوٹا ہوا ہے اس عورت کا...... تمہاری بھی ایسی ہی صورتِ حال ہے‘ میرا خیال ہے کہ اگر تم دونوں شادی کر لو تو بچوں کی بھی مناسب دیکھ بھال ہو سکتی ہے اور تم

دونوں کا دکھ بھی خاصی حد تک کم ہو جائے گا۔“
انور سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ”امجد!...... تم یہ تو بالکل ٹھیک کہتے ہو کہ بچوں کا مسئلہ ہے ان کی وجہ سے میں اُلجھ کر رہ گیا ہوں اور پھر بچوں کی درست طور پر نگہداشت بھی نہیں ہو پا رہی ہے۔ انہیں ماں کے روپ میں ایک عورت کی ضرورت تو ہے...... تم اگر پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہو کہ اس عورت سے شادی کے بعد میری زندگی بہتر ہو جائے گی تو میں یہ شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔“
امجد نے انور کا شانہ تھپتھپایا اور بولا۔ ”میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کی ہے۔“
”ٹھیک ہے تو تم اس سے بات کر لو۔“ انور نے کہا۔
”لیکن...... تم اسے میری بیماری کے بارے میں بتا دینا۔“
”وہ میں بتا چکا ہوں۔“
”کیا؟“ انور نے چونک کر امجد کی طرف دیکھا۔ ”تو اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے پہلے ہی بات کر چکے ہو؟“
”ہاں...... میں نے اس سے بات کی تھی۔ اس نے رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کے لئے سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہوگی کہ اسے دو بچے مل جائیں گے...... یار وہ اولاد کے لئے ترسی ہوئی عورت ہے۔ تمہارے بچوں کو بھرپور پیار دے گی۔“
”بس بس...... میں بھی یہی چاہتا ہوں‘ مجھے عورت کی ضرورت بچوں ہی کے لئے ہے۔“ انور بولا۔
”تم بے فکر رہو۔“ امجد نے ایک بار پھر انور کا شانہ تھپتھپایا۔ ”میں آج رات ہی اس سے بات کر لوں گا۔ وہ میرے سسرال میں دور پرے کی رشتہ دار لگتی ہے میری...... اس کا نام امینہ ہے۔“
”ٹھیک ہے تم اس سے بات کر لو۔“ انور نے کہا۔

☆

امینہ‘ انور کی بیوی بن کر اس کے گھر آ گئی۔ انور نے اس سے کہا۔ ”دیکھو امینہ! میرے گزرے ہوئے حالات اور میری جسمانی حالت سے تم اچھی طرح واقف ہو لہٰذا اس سلسلے میں میری خواہش ہوگی کہ تم ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے میرا دل ٹوٹے‘ مجھے دُکھ پہنچے۔ اس کے علاوہ میں تمہیں ہر طرح کی آسائش اور خوشیاں دینے کی کوشش کروں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں مالی طور پر خوش حال ہوں‘ تم میرے ساتھ ایک بے فکری کی زندگی گزار سکتی ہو‘ مجھے تو چاہے تم توجہ اور محبت دو یا نہ دو لیکن میرے بچوں کا پوری طرح خیال رکھنا۔“
”میں جانتی ہوں کہ آپ کے کیا مسائل اور حالات ہیں۔ اب میں آپ کی بیوی بن گئی ہوں اور میں بے وفا عورتوں میں سے نہیں ہوں۔ میں ان عورتوں میں سے ہوں جن کے لئے ان کا شوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بس آپ بے فکر رہیں آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ امینہ بولی۔
وقت گزرنے لگا اور امینہ نے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی ایک شوہر پرست عورت ہے۔ وہ نہ صرف عدنان اور عمران کو ماں کا پیار دے رہی تھی بلکہ انور کا بھی ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ ادھر انور کا مرض رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا۔
سلمٰی کے طلاق والے واقعے کو تقریباً آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ انور کو پتہ چلا تھا کہ وہ الیاس کے ساتھ حیدر آباد چلی گئی ہے۔ ان لوگوں نے شادی کر لی ہے اور وہ وہیں رہ رہے ہیں۔ ایک روز انور‘ امجد کی دکان پر پہنچا۔ چند عام سی باتوں کے بعد امجد نے انور سے کہا۔ ”تمہیں سلمٰی کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“
”نہیں...... کیا ہوا؟“ انور نے فوراً چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”اس نے الیاس کو بھی چھوڑ دیا۔“
”اوہ...... یہ کیا کیا اس نے؟“ انور افسوس کرنے والے انداز میں بولا۔
”بُرا نہیں ماننا انور...... ہو سکتا ہے تمہارے دل میں اس کے لئے اب بھی کوئی نرم گوشہ ہو لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ایسی عورتیں کبھی کسی ایک مرد کی ہو کر نہیں رہ سکتیں۔ انہیں مردوں کا چسکا لگ جاتا ہے اور وہ بھی ایسی ہی عورت تھی۔ اب دیکھ لینا وہ جس آدمی کے ساتھ گئی ہے اس کے

ساتھ بھی زیادہ عرصہ نہیں رہ سکے گی۔" امجد دل کی بات زبان پر لے آیا۔

"ہاں......" انور نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم ٹھیک ہی کہتے ہو امجد ایسی عورتیں کسی ایک مرد کی ہو کر نہیں رہ سکتیں...... اور...... یہ بات بھی درست ہے کہ میرے دل میں اب بھی اس کے لئے نرم گوشہ ہے۔"

"بہرحال!...... اب تم اسے بھول جاؤ تو بہتر ہے۔ امینہ کی صورت میں تمہیں ایک اچھی بیوی مل گئی ہے۔ تمہیں اس سے کوئی شکایت تو نہیں ہے ناں؟" امجد بولا۔

"نہیں...... مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں بلکہ میں تو اس کا شکر گزار ہوں کہ اس نے آ کر میری زندگی کو سنبھالا دیا ہے۔ اس نے مجھے خوشیاں دی ہیں، میرے بچوں کو ماں کا پیار دیا ہے۔ میں اس کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔" انور نے کہا۔

"بس اب تم سلمٰی کے خیالات کو دل سے نکال دو۔ دیکھو...... ہر کسی کو اپنے کیئے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے اور آج نہیں تو کل سلمٰی بھی اپنے کیئے کی سزا بھگتے گی۔ اس نے جو کچھ بویا ہے وہ کل اسے کاٹنا ہی پڑے گا۔" امجد نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"میں تو بھول ہی چکا ہوں اس کو...... لیکن اس کے ساتھ میں نے اچھا وقت گزارا ہے، بس اسی لئے وہ میری یادوں میں رہتی ہے اور رہے گی، میں اپنی یادوں سے اسے الگ نہیں کر سکتا۔" انور بولا۔

"اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو...... وہ ہوٹل والا آ رہا ہے۔ اس سے چائے منگو لیتے ہیں۔" امجد نے کہا وہ اس موضوع کو بدلنا چاہتا تھا اور ہوٹل والے کو دیکھ کر اسے یہ موضوع بدلنے کا موقع مل گیا تھا۔

وقت نے گزرنا تھا اس لئے وہ گزر گیا اور اس دوران بہت سی تبدیلیاں آ گئیں۔ عدنان اور عمران اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنا اپنا بزنس کرنے لگے تھے۔ عدنان نے بلڈرز کا کام شروع کر دیا تھا اور عمران ایکسپورٹ امپورٹ کر رہا تھا۔

انور اور امینہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان دونوں میں بہت زیادہ محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ انور اکثر امینہ کا شکریہ ادا کرتا رہتا تھا کہ اس نے اس کی اور اس کے بچوں کی زندگی سنوار دی تھی جبکہ امینہ ایسے موقع پر ہمیشہ اس سے یہ کہا کرتی تھی کہ وہ اس سے اس طرح کی باتیں کیوں کرتا ہے۔ کیا وہ اسے غیر سمجھتا ہے؟ جس پر انور کہتا تھا کہ وہ تو اس کی جان ہے لیکن جب وہ اپنی زندگی کے حوالے سے بہت خوش اور پرسکون ہوتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کر دیتا ہے کیونکہ اسی نے اس کی اجڑی ہوئی زندگی کو سنوارا ہے۔

عدنان کی شادی کی بات شہر کے ایک بہت امیر کبیر گھرانے میں چل رہی تھی۔ لڑکی کا نام فائزہ تھا اور اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اس کے والد نعیم مرزا ایک بہت بڑے بزنس مین تھے۔ عدنان اور فائزہ نے ایک تقریب میں ایک دوسرے کو پسند کیا تھا۔ ان کی کچھ اور ملاقاتیں ہوئی تھیں اور انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عدنان اور عمران، امینہ کو ہی اپنی ماں سمجھتے تھے اور اسے ماں ہی کی طرح عزت و درجہ دیتے تھے۔ عدنان نے امینہ کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا تھا اور امینہ نے یہ بات انور کو بتا دی تھی وہ دونوں فائزہ کے گھر جا کے اسے دیکھ اور پسند کر آئے تھے اور منگنی کی تاریخ بھی لے آئے تھے۔ آج شام منگنی کی رسم ہونی تھی۔

"ارے خالہ!...... تمام تیاریاں مکمل کروا لی ہیں تم نے!" امینہ نے اپنی بوڑھی ملازمہ سے پوچھا۔ سب گھر والے اس ملازمہ کو خالہ ہی کہتے تھے۔

"ہاں بیٹی!...... میں نے تو تمام تیاریاں مکمل کروا لی ہیں، بس تم ایک نظر تمام چیزیں دیکھ لو۔" خالہ نے جواب دیا۔

وہ دونوں دوسرے کمرے میں آ گئیں۔ وہاں منگنی کی تمام چیزیں رکھی تھیں۔ ان کا جائزہ لینے کے بعد امینہ نے خالہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لگتا تو ہے خالہ کہ یہ تمام چیزیں پوری ہیں پھر بھی سوچ لیں کہیں کچھ رہ نہ جائے۔"

"ٹھیک ہے بیٹی!" خالہ نے کہا۔

شام پانچ بجے کے قریب عدنان آ گیا۔ "چلو بیٹا!...... اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، ہم چھ بجے تک نکل جائیں گے۔" امینہ نے اس سے کہا۔

"ابھی تیار ہوا امی!" کہہ کر عدنان تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد گھر کے تمام لوگ تیار ہو گئے۔ سب لوگ بہت خوش تھے لیکن انور کے دل میں ایک خلش سی تھی اُسے سلمٰی یاد آ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ آج جو کچھ امینہ کر رہی ہے وہ تو سلمٰی کو کرنا چاہیے تھا۔

"کیا بات ہے ابو کیا سوچ رہے ہیں؟" عدنان نے انور کے پاس آ کر کہا تو انور چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آ گیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں...... کچھ نہیں بیٹا!...... بس میں یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں کسی چیز کی کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے کیونکہ بس اب تھوڑی ہی دیر بعد ہم لوگوں کو روانہ ہونا ہے۔"

"ارے ابو!...... آپ اور امی کو اس غم میں دُبلے ہوئے جا رہے ہیں کہ کہیں کسی چیز کی کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے۔ ارے بابا، میں نے خود کئی بار چیک کر لیا؟ ہر چیز موجود ہے، کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔" عدنان بولا۔

"اور میں نے بھی چیک کر لیا ہے بھئی!" عمران نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

انور اور عدنان اس کی بات پر ہنس دیئے۔ اسی وقت امینہ بھی کمرے میں آ گئی۔ اس نے انور سے کہا۔ "بھئی ہم لوگ تو پوری طرح تیار ہیں، اگر آپ کہیں تو چلیں؟"

"ہاں ہاں بھئی بالکل چلو۔" انور اٹھتے ہوئے بولا۔

ذرا ہی دیر بعد ان لوگوں کی گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔ سب سے آگے گاڑی میں انور، عدنان، عمران اور امینہ تھے۔ عدنان ڈرائیونگ کر رہا تھا انور اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا جبکہ امینہ اور عمران دونوں پچھلی نشست پر موجود تھے۔ ان کی گاڑی کے پیچھے ایک ویگن اور دو کاریں تھیں جن میں انور، امینہ، عدنان اور عمران کے رشتہ دار اور دوست سوار تھے۔

ایک سگنل پر گاڑیاں رُک گئیں۔ سب لوگ سگنل گرین ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ انور بلا ارادہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور پھر اس کی نظر ایک بوڑھی بھکارن پر پڑی۔ اُسے دیکھتے ہی انور کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ بھکارن ان سے اگلی گاڑی کی کھڑکی پر کھڑی بھیک مانگ رہی تھی۔ انور جذباتی کیفیت کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

وہ بھکارن آہستہ آہستہ ان کی گاڑی کی طرف آنے لگی اور پھر وہ عدنان کی کھڑکی پر آ گئی۔

"بیٹا!...... کچھ دیتا جا...... خدا تجھے سکھی رکھے گا۔" بھکارن نے عدنان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے التجا کی۔

عدنان کی عادت تھی کہ وہ بھکاریوں کو بھیک نہیں دیتا تھا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ یہ حق دار نہیں ہوتے بلکہ بھیک مانگنا ان کا کاروبار ہوتا ہے۔ اسی لئے عدنان نے اس بھکارن کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔

انور نے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے سو کا نوٹ نکال کر بھکارن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

بھکارن نے جونہی اس کی طرف دیکھا تو وہ چونک گئی۔ انور نے چند لمحے اس سے نظریں ملائے رکھیں اور پھر سگنل کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت سگنل گرین ہو گیا اور عدنان نے گاڑی چلا دی۔ اس نے انور پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "ابو!...... ان لوگوں کو بھیک نہ دیا کریں یہ لوگ حق دار نہیں ہوتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا!...... لیکن...... میں نے سوچا کہ شاید وہ حق دار ہے۔" انور نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور دل میں بولا۔ "بیٹا!...... تم کیا جانو کہ وہ کتنی حق دار تھی، ہاں اگر تم بھی یہ جان لیتے کہ وہ تمہاری ماں تھی تو تم سمجھ لیتے کہ وہ کتنی حق دار تھی...... لیکن افسوس کہ وہ اپنے تمام حقوق سے خود ہی دستبردار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

او۔۔۔ رکشے والے

سری لنکا کی کہانی

راجا پراکٹر/اعجاز راہی

تیسری دنیا کی غریب سے غریب تر عوام کی امنگوں کی ترجمان۔ وہ بھی اپنے بیٹے کو ترقی کرتے دیکھنا چاہتا تھا

(کیا کبھی اس نے پہلے بھی یہ کام کیا ہے۔

(اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا) کیا ایک رکشا ڈرائیور کی زندگی کا یہ لازمی حصہ ہے۔ آسان کمائی...... لیکن نہیں)

اس نے ایک نوٹ کا اور اضافہ کر دیا۔ وہ قدرے جھکا نہیں......

(نہیں نہیں...... میرا بیٹا...... آج نہیں...... آج نہیں کبھی نہیں)

سہ پہر کا سورج پگھلے ہوئے لوہے کی طرح اور سڑک تپتے ہوئے تندور کی طرح سرخ تھی۔ راسن چپچپے پسینے میں شرابور رکشے کے فٹ ریسٹ پر بیٹھا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس درخت کے نیچے جہاں رکشا کھڑا تھا۔ سورج کی کرنیں چھن چھن کر اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک پمفلٹ تھا جس کو کبھی پڑھتا اور کبھی اس سے پنکھے کا کام لیتا۔

''او...... بدبخت......'' اچانک وہ کوّے کو دیکھ کر چلایا جس نے رکشے کے ہڈ پر بیٹ کر دی تھی۔

''میرا رکشا......'' اس نے غصے میں پمفلٹ ایک طرف پھینک دیا اور پتھر اٹھانے کے لیے ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس کے پٹھے اور کولہے کی رگیں متحرک بازو کے ساتھ ابھر آئیں' لیکن جب اس کا ہاتھ رک گیا تو وہ دوبارہ معمول پر آ گئیں۔ اس کی تنگ اور سیاہ آنکھوں میں ہم دردانہ رویے کی لکیریں واضح تھیں۔ اس کے موٹے ہونٹ پان اور چھالیہ کھانے کے سبب بھورے ہو گئے تھے۔ دانت بدرنگ اور مسوڑھے کتھئی تھے' لیکن چہرے پر درد آشنا دل کی نرماہٹ چھائی ہوئی تھی۔

اسی اثنا میں کوّا اڑ گیا تھا۔ راسن خیالوں سے باہر آ گیا۔ اس نے رکشا سنبھالا اور سڑک پر چل پڑا۔ اس کے پاؤں تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ اس کے سامنے جنرل اسپتال تھا جہاں سے میڈیکل کے طلبا باہر نکل رہے تھے۔ اس نے سوچا...... کاش وہ اپنی بیوی کو یہاں داخل کرا سکتا...... لیکن افسوس...... اس نے ایک لمبی سانس لی اور لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے گھنٹی بجائی۔ چلتے ہوئے رکشے کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی اسی تیزی سے خیالوں کے جھمیلے طے کر رہا تھا۔ اس نے تھیلی نکالی' چھالیہ منہ میں رکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

اس کی ماں اور دایہ دونوں ہی ٹھیک ہیں' لیکن اس کی بیوی...... اگر داخلہ مل جاتا تو......) یہ طالب علم۔ اتنے جوان اتنے ذہین' اتنے ہوشیار...... اس قدر خوش...... کیا اس کا بیٹا بھی...... ہاں کیوں نہیں۔''

اس نے سوچا...... اور خود ہی اپنے احمقانہ خیالات کی نفی بھی کرنے لگا۔ پھر اس کے ذہن میں وہ پمفلٹ آ گیا جسے وہ درخت کے نیچے پھینک آیا تھا جس میں لکھا تھا۔

سب کے لیے مفت تعلیم

یکساں مواقع

ایک ہاکر لڑکا وزیر اعظم بن گیا۔

''رکشا...... اور رکشے والے......'' وہ خیالات کی دنیا سے نکل آیا اور تیزی کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے دو نوجوان لڑکوں کے پاس رکشا روک دیا...... کپڑا نکالا اور سیٹ صاف کرنے لگا۔

''ماسوتی کافی ہاؤس......'' ایک نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جلدی...... بہت جلدی۔'' دوسرا بھی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا اور دھوپ کی عینک لگا رکھی تھی۔



راسن نے آہستگی سے رکشا سڑک پر ڈالا اور ایک رفتار قائم کرنے کی کوشش کی، جسے وہ آخر تک برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دونوں لڑکوں کی طرف دیکھا وہ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنس رہے تھے لیکن جب راسن سے ان کی نظریں ملیں تو یک دم سنجیدہ ہوگئے۔

"جناب......" راسن بولا۔ "جناب کتنے عرصے میں آدمی ڈاکٹر بن جاتا ہے۔"

"تیز چلاؤ...... رکشے والے...... تیز چلاؤ...... تم لوگ باتیں بہت کرتے ہو۔"

عینک والے نے کہا اور پھر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ چند لمحوں کے بعد دوسرا نوجوان ہنس کر بولا۔

"پانچ سال...... پانچ ہزار روپے...... لیکن ہم یہ مدت تمہارے رکشے میں نہیں گزار سکتے...... بس اب تیز چلو۔"

"جناب...... جناب" مگر وہ دونوں پھر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ رکشا چلتا رہا۔ اس کا ذہن بیٹے کو ڈاکٹر بنانے اور آنکھیں، ہاتھ اور پاؤں رکشے اور ٹریفک میں گم ہوگئے۔ اس نے کافی ہاؤس کے سامنے رکشا روک دیا۔ کافی ہاؤس کی طرف بڑھتے ہوئے عینک والے نوجوان نے اسے انتظار کرنے کو کہا اور ساتھ ہی اس پارسل کی حفاظت کا خیال دلایا، جو نشست پر چھوڑے جا رہے تھے۔

وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا پارسل کی حفاظت اور ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ دھوپ کی شدت رکشے کے ہڈ سے گزر کر اس کے سیاہ جسم میں داخل ہوتی رہی۔ اس کی نظریں خوب صورت کافی ہاؤس کے شیشوں پر جمی تھیں۔ دروازہ کھلتا، تو ایک لمحے کے لیے اس میں طمانیت جاگتی، مگر اپنی سواریوں کو نہ پا کر وہ پھر انتظار میں ڈوب جاتا۔ خاصی دیر تک انتظار کرنے کے بعد اس نے سوچا۔

"ان کے انتظار میں ساری عمر نہیں گزار سکتا۔ مجھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے آج بہت زیادہ پیسوں کی ضرورت ہے۔" اس نے خود کو حوصلہ دیا اور قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ کافی ہاؤس کے دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا۔ صاف ستھری وردی میں ملبوس ایک ویٹر نے اسے اندر آنے سے منع کیا۔

"دو مسافر نوجوان اندر آئے تھے۔ میرا کرایہ ان کی طرف ہے۔" اسی اثنا میں ایک اور ویٹر آ گیا۔ اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔

"تمہارا کرایہ...... دو نوجوان...... وہ تو کبھی کے جا چکے ہیں۔ غالباً ایک گھنٹہ قبل...... دوسرے دروازے سے......"

"اوہ......" اس نے دونوں کے چہرے پر تمسخرانہ اور متکبر مسکراہٹ دیکھ کر کہا۔ "میرے رکشے میں وہ ایک پارسل بھی چھوڑ گئے ہیں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے رکشے کی طرف آیا۔ پارسل اخباری کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ اسے کھولا۔ جوتے کے خالی ڈبے میں پھٹے پرانے کاغذ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے غصے سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور پوری شدت سے کاندھوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہنے لگا تو اس کا مطلب ہے کہ مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ اسے حیرت تھی۔

"پانچ سال...... اور پانچ ہزار روپے...... اور مجھے چند آنوں کے لیے دھوکا دیا گیا۔" اس نے سر کو جھٹکا۔ جیسے اس کے دل میں ان لڑکوں کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر...... ڈاکٹر...... میرا بیٹا بھی......" اس کے اندر ایک دکھ جاگ گیا۔ "نہیں میرا بیٹا...... دھوکے باز نہیں۔"

اسی اثناء میں ایک ٹرام اس کے قریب سے گزری اور اگلے اسٹاپ پر جا کر رک گئی۔ اس میں سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا اترے۔ انہوں نے بے ترتیب اسکول یونیفارم پہن رکھی تھی۔ بال بکھرے اور کاندھوں پر بستے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اس کے رکشے کی طرف بڑھے۔

"ادھر...... اُدھر...... احتیاط سے...... آہستہ آہستہ۔" اس نے نرم لہجے میں بچوں سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔" وہ خوش

...ی اور محبت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"گھر...... گھر......" بچے چیخے...... "تیزی سے ...ئے......" "تیزی سے رکشے والے...... تیزی سے...... تم ...ہت ست ہو۔"

وہ انہیں جانتا تھا۔ یہ چاول کے ایک تاجر کے بیٹے ...۔ تاجر بہت امیر آدمی تھا۔

"بچو...... بچو۔ بیٹھ جاؤ...... گر جاؤ گے۔"

(بہت شریر...... ہاں...... ہاں...... میرا بیٹا بھی اسی ...رح اسکول جائے گا۔) اس کے اندر تجسس پیدا ہوا کہ یہ ...چے اسکول میں کیا کرتے ہیں۔ اس نے رفتار بڑھاتے ...ئے پوچھا۔

"بچو...... تم اسکول میں کیا کرتے ہو...... کیا سیکھتے ہو؟"

"تیز چلو تیز...... تم تو کانپتے ہوئے بوڑھے گھوڑے ...۔" لڑکے نے جواب میں کہا۔ "گھر میں بندھی ہوئی ...ئے سے بھی زیادہ ست ہو۔" لڑکے اور لڑکی نے ایک ...اور اس کے کاندھے پر ہاتھ مارا اور پھر دونوں کھلکھلا کر ...س پڑے۔

"باز آؤ...... بچو...... باز آؤ۔" اس کے لہجے میں خوش...ار احتجاج تھا۔ بچے چند لمحے چپ رہ کر اس کے لیے ...ئی نیا نام سوچنے لگے۔ کچھ سوچتے ہوئے لڑکے نے اپنا ...م نکالا اور اس کی نب کو اس کی پیٹھ میں چبھو دیا۔ وہ سی ...کے تڑپ گیا۔ دونوں بچے اسے تکلیف میں دیکھ کر ...س دیے۔ لڑکے نے پھر یہی عمل دہرایا۔

"دیکھو...... دیکھو...... ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔" اس نے ...لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "دیکھو خون نکل آیا ہے اور ایک ...سے ہی اسٹیئرنگ گھما کر کوٹھی کے اندر داخل ہوگیا۔

"امی...... امی۔" لڑکی چیخی اور لڑکے نے ہاتھ چھڑانے ...کوشش کی۔

"میرا بیٹا...... ہائے میرا بیٹا...... ہاتھ چھوڑو...... تم نے ...ت کیسے کی میرے بیٹے کو ہاتھ لگانے کی۔ نیچ کہیں ...۔" بڑے دروازے سے برآمد ہونے والی خاتون دور سے ہی چیختی ہوئی باہر آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

اس نے لڑکے کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"اونچ...... کمینے...... میرے بچے کو ہاتھ مت لگاؤ۔"

عورت کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے رکشا گیٹ سے نکالا اور سڑک پر آ گیا۔

"رکشا...... او رکشا۔" وہ آواز کی طرف متوجہ ہوا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"کہاں جائیں گے۔" اس نے پوچھا۔

اس شخص نے اپنا گلا صاف کیا اور رکشے والے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ پکڑا ہوا تھا۔ رکشے والے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"کہاں جائیں گے جناب۔" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"براہمن خاتون...... صاف ستھری براہمن خاتون کے پاس لے چلو۔"

دس روپے کا نوٹ اس کے قریب...... اور قریب آ گیا تھا۔ اس کے کانوں میں آواز آ رہی تھی...... اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

(کیا کبھی اس نے پہلے بھی یہ کام کیا ہے۔ (اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا) کیا ایک رکشا ڈرائیور کی زندگی کا یہ لازمی حصہ ہے۔ آسان کمائی...... لیکن نہیں) اس نے ایک نوٹ کا اور اضافہ کر دیا۔ وہ قدرے جھکا نہیں...... (نہیں نہیں...... میرا بیٹا...... آج نہیں...... آج نہیں کبھی نہیں)

اس نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور تیزی سے پیڈل گھمانے لگا۔

اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ اترنے لگا۔ اس نے جلدی سے رکشا سنبھالا۔ اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھا اور رکشا سڑک پر دوڑنے لگا اور دوڑتا ہی چلا گیا۔ شہر ختم ہوگیا۔ شہر کے ہموار مضافات میں ایک بڑے درخت کے نیچے گھاس پھونس سے چند جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔

وہ رکشے کو دوڑاتا رہا۔ اس کی سانس پھول چکی تھی۔ پاؤں تھک گئے مگر رکشے کی رفتار میں فرق نہ آیا۔ کچی بستی میں داخل ہونے کے بعد پیڈل کے ساتھ گھومتے پاؤں رک گئے۔ رکشا آہستہ آہستہ تیسرے مکان کے سامنے جا رکا۔ راسن نے جھونپڑے کے سامنے بنے بانس اور گھاس کے گیراج میں رکشے کو کھڑا کیا اور جھونپڑے کے سامنے آ گیا جہاں ایک بوڑھی عورت جس کا گوشت اس کی ہڈیوں نے چھوڑ دیا تھا اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔

"پیسے...... مجھے حاملہ بہو کے لیے پیسے چاہئیں۔"

اس کی جیب میں جو کچھ بھی تھا' اس نے ماں کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ ماں نے پہلے اپنی ہتھیلی پر رکھے پیسوں اور پھر نفرت بھری نظروں سے راسن کی طرف دیکھا اور اندر داخل ہونے لگی۔ راسن نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر بوڑھی ماں نے روک دیا۔

"وہ اندر داخل ہوگئی اور دروازہ بند کرلیا۔

راسن گھر کے سامنے ہی گھاس پر بیٹھ کر آنے والے لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں وقفے وقفے سے آنے والی درد اور کرب کی آوازیں اس کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتی رہیں۔ بڑھتی ہوئی آوازوں کے ساتھ رات نے بھی کچی جھونپڑیوں پر اپنا سایہ ڈالنا شروع کردیا۔ چند ستارے آسمان پر ابھر کر' گھور اندھیرے کی چادر میں شگاف ڈالنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ رکشے کے پاس آیا اور مٹی کے تیل کا لیمپ جلا کر رکشے کے فٹ ریسٹ پر بیٹھ گیا۔

اچانک اس کے اندر ایک جذبہ بیدار ہوا۔

"میرا رکشا...... میرا رکشا۔"

اس کی دھیمی آواز اس کے گرد حلقہ کرنے لگی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا جھاڑن لے کر رکشے کو صاف کرنے لگا۔ پھر پالش کی ڈبیا نکالی اور پالش سے رکشے کی دن بھر کی تھکن کی میل اتارنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے ہاتھ کی حرکت کے ساتھ اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے پر اطمینان ابھر آیا تھا' لیکن ہونٹوں پر ایک شکایت تھی' جو بڑبڑاہٹ کے ساتھ ہوا کے دوش میں گم ہوتی جارہی تھی۔ وہ خود ہی سوال کرتا اور خود ہی جواب دیتا۔ وہ نہ سوال سے مطمئن تھا' نہ جواب سے...... اس کے سامنے مسائل تھے' مسائل کا حل نہیں تھا۔ وہ صرف سوچ سکتا تھا اور سوچتا رہا۔ چاند رات کے اندھیروں کو چیر کر اس تک روشنی پہنچانے لگا۔ اب اس کا رکشا بھی چمک آیا تھا۔ اس نے اطمینان اور تعریفی نظروں سے رکشا کی طرف دیکھا۔ فٹ ریسٹ پر لیٹ گیا اور نہ جانے کب نیند کی آغوش میں جا سویا۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے چاروں طرف ایک آواز پھیلی ہوئی تھی۔ اجنبی آواز...... جسے اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس نے چاروں اور پھیلے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ لیمپ دوبارہ روشن کیا' جو بتی پر گل آنے کی وجہ سے بجھ چکا تھا۔ معاً اس کے کانوں میں ماں کی جانی پہچانی مدہم سی آواز سنائی دی' لیکن اسی لمحے ماں کی آواز پر ایک اور مدھم آواز غالب آ گئی۔

"یہ لڑکا ہے...... لڑکا...... مبارک ہو۔"

اس نے لیمپ کی کمزور روشنی میں پالش سے چمکتے رکشے پر نظریں دوڑائیں۔ اس نے جذبات بھرے انداز میں اسٹیئرنگ پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے وہ اسکول جاتے بچے کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔

میرا رکشا...... میرا بیٹا...... میرا رکشا۔

اسی لمحے اس کا دل روشنی اور خوشی سے منور ہوگیا۔ اسے پہلے بار زندگی میں معنویت محسوس ہوئی۔ وہ اپنی محنت پر شرمندہ نہیں تھا۔

میرا رکشا۔

میرا بیٹا۔

وہ بڑبڑایا۔

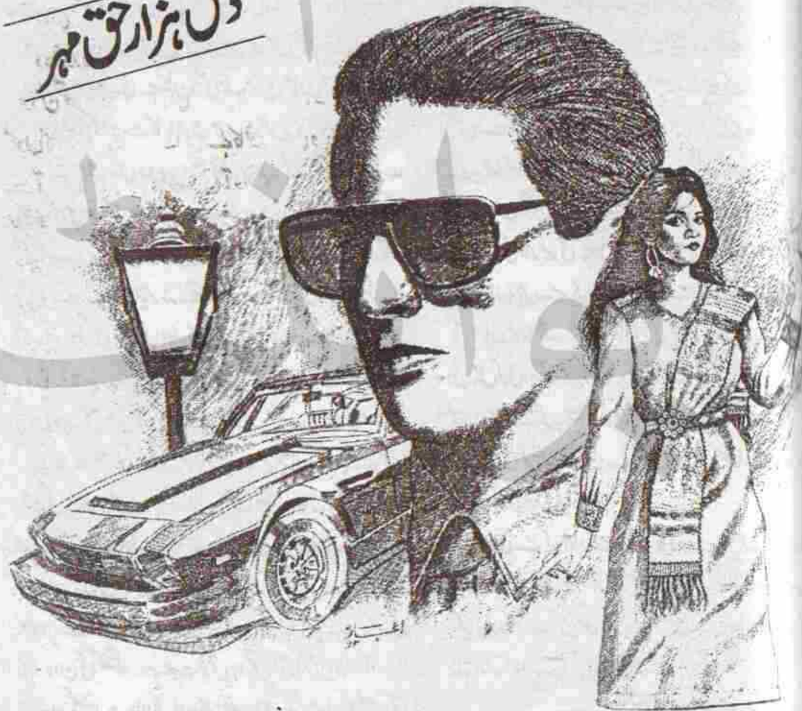
اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا اس کی قوت میں اضافے کا سبب ہوگا...... اس کے رکشے کی طرح......

☆☆☆

افسوس ہے کہ ہمارے باپ کا وہ روپیہ جس سے ہماری شادی بہ آرام اور بروقت ہوسکتی تھی۔ اب مخالفت کا سبب بن گیا اور ہمارے عزیز واقارب جنہیں ہمیں بیاہنے میں ہاتھ بٹانا تھا۔ ہمارے قاتل بن بیٹھے۔

ذیشان عبداللہ

دس ہزار حق مہر



میرے باپ نے مرتے وقت معقول جائداد چھوڑی تھی۔ ...کو میں نے گھر میں دیکھا یا سنا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ...ں ہزار روپے سے کم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ زیور' برتن' کپڑا ...ور سامان بھی کافی مقدار میں تھا۔ بدقسمتی سے میرے بھائیوں ...چلن اچھا نہیں رہا۔ وہ فضول خرچ عیاش اور شرابی تھے۔ لیکن ...ری دانشمند اماں نے تمام روپیہ اور زیور وغیرہ کسی نہ کسی طرح ...لوٹا کرلیا۔ اور بھائیوں کو اس پر کچھ بھی اختیار نہ رہا۔

ہم سب آٹھ بہن بھائی تھے۔ تین بہنیں شادی شدہ تھیں۔ ...ن کے خاوند اپنی اپنی جگہ خوشحال تھے۔ تین بھائی تھے جو اپنی گزر کسی نہ کسی طرح کرلیتے تھے۔ البتہ ہم دو بہنیں نابالغ تھیں جو اس تمام جائداد کی مالک سمجھی جاتی تھیں۔

جس وقت میرے باپ کا انتقال ہوا میری عمر صرف چودہ سال کی تھی میری چھوٹی بہن کی عمر ۱۳ سال کی ہوگی اور ہم دونوں مدرسہ میں تعلیم پاتی تھیں۔

گو ہماری عمر اور جسمانی حالت ۱۴۔ اور ۱۳ سال کی عمر میں ہی شادی کے قابل تھی۔ لیکن ماں کی نظریں لڑکیاں پھر بھی چھوٹی ہی ہوتی ہیں۔ ہماری ماں کا خیال تھا کہ دو تین سال کے اندر ہی اندر وہ ہماری شادی کردیں گی۔ روپیہ بری بلا ہے۔ ہماری ماں

کو یہ فکر تھی کہ روپیہ کم نہ ہو اور گزرِ اوقات جائداد کے کرایہ یا سود یا کسی تجارت سے ہو جایا کرے۔ ہمارے ایک معزز بہنوئی نے ہماری ماں کو ایسا سبز باغ دکھایا کہ اس نے اپنی تمام پونجی اس کے حوالے کر دی۔ اس روپیہ سے کاروبار کو وسعت دی گئی اور سر بفلک عمارتیں تیار کی گئیں اور ہماری ماں کو بھی چالیس روپیہ ماہوار گزارہ کے لیے ملتا رہا۔

یہاں تک تو کچھ اعتراض نہیں ہے کہ ہمارے کسی بہنوئی یا دوسرے عزیز نے اس روپیہ سے فائدہ اٹھایا۔ آخر روپیہ کسی نہ کسی کام آنا ہی تھا۔ اور ہمارے ہاں بھی ایک بہنوئی سے دوسرے بہنوئی کے ہاتھ میں اور پھر کسی تیسرے کے ہاتھ میں برابر تبدیل ہوتا رہا اور ہمیں صرف گزارہ ہی ملتا رہا۔ لیکن اعتراض ہے تو اس چیز پر کہ روپیہ کی اس تبدیلی اور آمد و رفت سے ہماری ماں کی جیب خالی ہو گئی۔ اور وہ اپنی ضروریات کے لیے اپنے مقروضین کی دستِ نگر بن بیٹھی۔ جن سے انہیں دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ میں چودہ سال کی عمر میں یتیم ہوئی اور اب میری عمر ۲۹ سال کی ہے لیکن ابھی تک میری شادی نہیں ہو سکی۔

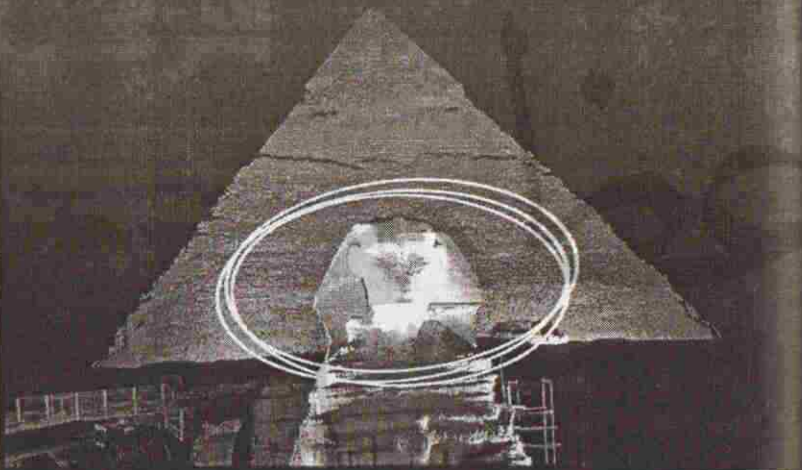
اس تمام مصیبت کا باعث میرے عزیز و اقارب ہیں۔ جن کے قبضہ میں روپیہ ہوتا تھا۔ جب کہیں رشتہ کی بات چیت ہوتی تو جس صاحب کے پاس روپیہ جمع ہوتا وہ یہ سمجھ کر کہ اب روپیہ کا ایک معقول حصہ انہیں واپس دینا پڑے گا۔ جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ وہ ہر رشتہ میں سو سو کیڑے نکالتے اور کسی جگہ بھی ہماری بات پختہ نہ ہونے دیتے۔ اگر کوئی رشتہ چار و ناچار منظور ہی کرنا پڑتا۔ تو میرے بہنوئی دس ہزار روپیہ حق مہر اور سو روپے ماہوار پاکٹ خرچ کا مطالبہ کرتے۔ اکثر لوگ اس مطالبہ سے پریشان ہو جاتے اور رشتہ کی بات پختہ نہ ہوتی۔ اس وقت ہمارے بہنوئی کہتے کہ ہماری بہنیں کوئی گائے بھینس نہیں ہیں کہ ہم ایسے ہی انہیں گھر سے نکال دیں۔ زمانہ بہت نازک ہے اور ہمیں اپنی بہنوں کے حقوق کی بہ خوبی حفاظت کر لینی چاہیے۔ میری والدہ ان کی گفتگو سے بہت خوش ہوتیں اور انہیں ہمارا اور اپنا خیر خواہ سمجھتیں۔ حالانکہ ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ رشتہ نہ ہو۔ اور انہیں روپیہ واپس نہ دینا پڑے۔

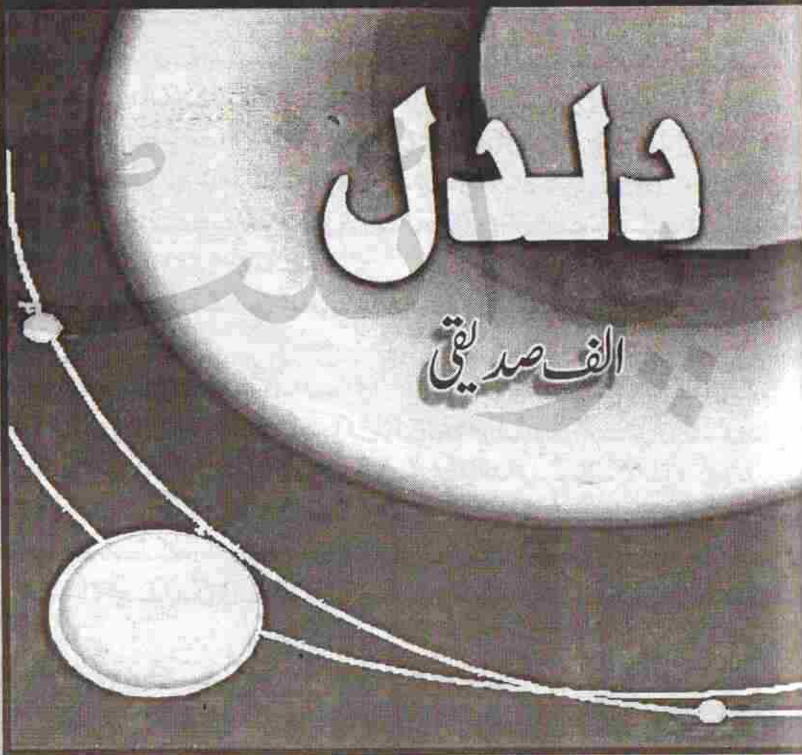
اس دس ہزار روپے کے حق مہر کے مطالبہ نے ہمارا کہیں نہ ہونے دیا۔ یہاں تک کہ میری عمر ۱۴ سال سال تک جا پہنچی۔ اس کے بعد ہمارا روپیہ کچھ بھائیوں ہتھیا لیا۔ کچھ جن سے قرضہ لینا تھا۔ انہوں نے دبا لیا۔ والدہ نے اخراجات میں اٹھا دیا۔ اب لے دے کر دس ہزار کی رقم رہ گئی تھی۔ جس میں کچھ مکانات گرو تھے یا ادھر قرضہ دے رکھا تھا۔

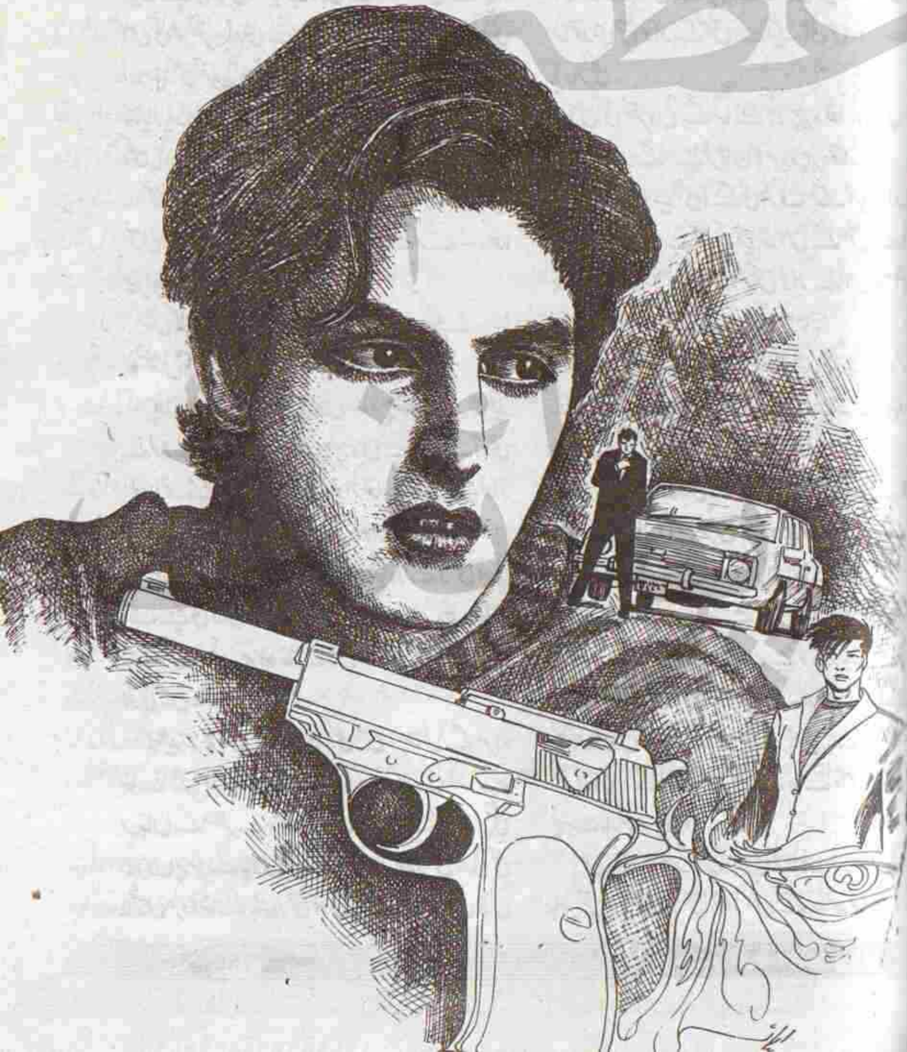
آخری دو تین سال ہماری شادی کے انتظامات گزرے۔ ہماری عمروں کی زیادتی اب شادی میں رکا بننے لگی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ لڑکیاں تو بوڑھی ہو گئی ہیں۔ پوچھتا کہ ان کی اب تک شادی کیوں نہیں ہوئی۔ کوئی کچھ کوئی کچھ۔ اس پر ہمارے بھائیوں نے جو ہمارے روپے کے دشمن تھے۔ مزید مشکلات پیدا کر رکھی تھیں۔ اگر کہیں بن بھی جاتی تو ہمارے بھائیوں کی خفیہ کارستانیوں سے کام بگڑ جاتا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت میری ماں کا مرنا جس سے تمام شیرازہ ہی بکھر گیا۔ ماں مر گئیں کچھ سامان روپیہ بھائیوں نے ہتھیا لیا۔ باقی سب کچھ بہنوئیوں کے ہے۔ یا ان لوگوں کے پاس جو ہمارے مقروض ہیں۔ میری ۲۹ سال کی اور میری چھوٹی بہن کی ۲۸ سال کی ہے اور ہنوز کنواریاں ہیں۔ میری اس تحریر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم شا کی زیادہ خواہشمند ہیں۔ شادی کی عمر گزر چکی ہے۔ ہمار دل میں کوئی امنگ اور کوئی خواہش اب باقی نہیں رہی۔ ہم عزیز و اقارب کو یہ بتلانے کی ضرورت محسوس کرتی ہیں کہ ۲۹ سال کی عمر تک انہوں نے کیوں گھر میں بٹھائے رکھا پر یہ ظلم کیوں توڑا گیا۔

افسوس ہے کہ ہمارے باپ کا وہ روپیہ جس سے ہمار شادی بہ آرام اور بروقت ہو سکتی تھی۔ اب مخالفت کا سبب گیا اور ہمارے عزیز و اقارب جنہیں ہمیں بیاہنے میں بٹانا تھا۔ ہمارے قاتل بن بیٹھے۔

☆☆☆







دلدل

الف صدیقی

معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتی ایک خوبصورت تحریر

ہاں۔ جمشید نے کہا۔ مہلت تو ختم ہو چکی ہے۔ لیکن میں اس کے پاس جاؤں گا اور اس سے کہوں گا کہ وہ مجھے چند روز کی مہلت اور دے دے، تاکہ میں رقم کا بندوبست کرلوں۔ میں اس سے یہ بھی کہوں گا کہ میں کوشش کے باوجود ابھی تک رقم کا بندوبست نہیں کرسکا ہوں۔

جلدی چلے جاؤ بھائی جمشید۔ عبدالرحمان نے اس کو مشورہ دیا۔ تمہارے پاس اب اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ خدا کرے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے۔ مجھے ضرور بتانا کہ شیدے کے ساتھ تمہاری کیا بات چیت ہوئی۔

میں تمہارے پاس سے ابھی سیدھا اسی کے پاس جارہا ہوں۔ جمشید نے کہا۔ جو کچھ بھی بات چیت ہوگی تم کو ضرور اس کے بارے میں بتاؤں گا۔

جمشید وہاں سے چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد عبدالرحمان نے ارشاد اور رحمت علی کو اس صورت حال کے بارے میں بتادیا عبدالرحمان، خود بھی پریشان تھا اور وہ دونوں بھی اس کی پریشانی میں شریک ہوگئے۔

راؤ صاحب تو اپنا دامن صاف بچا گئے۔ ارشاد نے کہا۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شیدا کوئی معمولی آدمی نہیں ہے، بلکہ اس کی پہنچ بہت دور دور تک ہے اور خدا جانے کون کون لوگ اس کی سرپرستی کررہے ہیں۔ جو ایک بڑے پولیس افسر نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس نے ایک لڑکے کو تاوان کے لیے اغوا کررکھا ہے۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

صرف یہی نہیں، بلکہ تھانے والے کھلم کھلا اس کے تنخواہ دار ایجنٹوں کا کام کررہے ہیں۔

بڑے بڑے لوگ، سیاست داں، لیڈر، جاگیردار، طرح طرح کے مجرموں کی سرپرستی کرتے ہیں، انہیں تحفظ فراہم کرتے ہیں اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عبدالرحمان نے کہا۔ شیدا کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس کی پشت پر بہت بڑے بڑے لوگ موجود ہیں۔ ویسے ہی وہ سابق پولیس والا ہے۔ اسی لیے وہ اس قدر بے خوفی اور ڈھٹائی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہے۔

اس رات کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد، جمشید دوبارہ عبدالرحمان کے پاس آگیا وہ بہت زیادہ پریشان، سراسیمہ اور خوفزدہ نظر آرہا تھا۔

شیدے سے میری ملاقات نہیں ہوسکی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں عبدالرحمان کو بتایا۔ اس کے آدمی نے مجھے اندر جانے ہی نہیں دیا۔ اس نے یہ کہہ کر مجھے روک دیا کہ شیدا آج بہت مصروف ہے اور مجھ سے نہیں مل سکتا۔ میں نے اپنا نام بتایا، بہت سمجھانے کی کوشش کی، خوشامد بھی کی لیکن وہ تو جیسے پتھر بن گیا تھا۔ اس نے صاف منع کردیا اور مجھے اندر جانے ہی نہیں دیا...... اب میں کیا کروں بھائی عبدالرحمان۔

اب تم انتظار کرنے کے علاوہ اور کیا کرسکتے ہو۔ عبدالرحمان نے کہا۔ کل دن میں پھر کوشش کرنا۔

ہاں......! جمشید نے کہا۔ صبح ہی سے جا کر اس کے دروازے پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ کسی نہ کسی وقت تو وہ ملاقات کے لیے بلا ہی لے گا۔

لیکن جمشید کو دوبارہ شیدے کے گھر جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

اسی رات کو دیر گئے مقامی تھانے سے ایک کانسٹیبل جمشید کے گھر آیا۔

تم نے تھانے میں اپنے بیٹے کی گمشدگی کی اطلاع کروائی تھی نا۔ اس نے پوچھا۔

ہاں ہاں، کروائی تھی......! جمشید نے سخت اضطراب و ہیجان کے عالم میں کہا۔ کیا وہ مل گیا۔ اس کا کوئی پتا چل گیا۔

یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک زیر تعمیر مکان کے پاس ایک بچے کی لاش دستیاب ہوئی ہے۔ کانسٹیبل نے کہا۔ اس کی عمر تقریباً وہی ہے جو تم نے اپنے بچے کی بتائی تھی اور حلیہ بھی تقریباً ویسا ہی ہے۔ لاش کو پولیس نے اسپتال پہنچادیا ہے۔ تم چل کر اسے ایک نظر دیکھ لو۔ خدا نہ کرے کہیں وہ تمہارا بیٹا نہ ہو۔

نہیں نہیں۔ جمشید نے لرز کر کہا۔ وہ...... وہ میرا بیٹا نہیں ہوسکتا...... خدا نہ کرے...... خدا نہ کرے...... وہ میرا بیٹا کیوں ہونے لگا۔

چل کر دیکھ لو تاکہ تمہیں پورا اطمینان ہوجائے......! کانسٹیبل نے کہا۔

اچھا...... اچھا...... چلتا ہوں...... چلتا ہوں۔ جمشید نے لرزتے ہوئے کہا اور اپنے پڑوس سے بھی ایک آدمی کو ساتھ لے لیا جس کا نام حق نواز تھا...... وہ اور حق نواز، دونوں کانسٹیبل کے ساتھ اسپتال روانہ ہوگئے

اسپتال کے مردہ خانے میں سفید چادر سے ڈھکی ہوئی ایک بچے کی لاش رکھی ہوئی تھی، سر سے پاؤں تک چادر میں ڈھکی ہوئی۔ مردہ خانے میں اور بھی کئی لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔

جمشید نے اس سے پہلے کبھی کسی اسپتال کے مردہ خانے میں قدم نہیں رکھا تھا اور وہ یہاں کی فضا سے، یہاں کے منظر سے، سخت دہشت زدہ تھا۔ لمبی اور پتلی میزوں پر سر سے پاؤں تک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی کئی لاشیں مردہ خانے میں رکھی ہوئی تھیں، لیکن بچے کی لاش صرف ایک ہی تھی۔ کانسٹیبل نے جمشید کو سیدھا اس کے پاس لے جا کر کھڑا کردیا تھا۔

مردہ خانے کی فضا میں ٹھنڈک اور سیلن تھی، اور بہت ہی عجیب قسم کی ناگوار بو بسی ہوئی تھی۔ جمشید کے اعصاب تو جیسے جواب دیئے جارہے تھے۔

یہ ہے۔ کانسٹیبل نے بچے کی لاش کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ اس کو دیکھ لو۔

حق نواز آگے بڑھا اور اس نے چادر کا کونہ آہستہ سے لاش کے چہرے کو کھول دیا۔ اور اس ساتھ ہی حق نواز کے حلق سے ایک ہلکی سی، وحشت آواز نکلی۔

اس کی نظروں کے سامنے جو چہرہ تھا، وہ اس پڑوسی جمشید کے بیٹے فرقان کا مردہ چہرہ تھا۔

اسی وقت جمشید بھی آگے کی طرف جھک آیا تھا اور اس نے بھی اس چہرے کو دیکھ لیا تھا اس کے حلق سے ایک بڑی بھیانک چیخ نکلی اور اگر حق نواز نے اس کو مضبوطی سے پکڑ نہ لیا ہوتا تو شاید وہ نیچے گر پڑتا۔

ارے یہ تو میرا فرقان ہے۔ جمشید شدید درد و کرب کے عالم میں چلایا۔ یہ میرا فرقان ہے۔ میرا بیٹا ہائے یہ کیا ہوگیا۔

صبر سے کام لو بھائی۔ کانسٹیبل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اچھی طرح سے دیکھ لو اور پہچان لو۔ اس کے بعد ہی باقی قانونی کارروائی کی جائے گی۔

ارے مار دیا میرے بیٹے کو۔ جمشید چلا چلا کر رو رہا تھا۔ ارے ظالموں نے میرے بیٹے کو مار دیا۔

حق نواز نے اس کو سنبھالا۔ کچھ وقت ضابطے کی کارروائیوں میں صرف ہوا اور پھر جمشید سے کہا گیا کہ کل دوپہر کے بعد آکر لاش لے جائے، اس وقت تک پوسٹ مارٹم ہوچکا ہوگا۔

جس وقت جمشید گریہ وزاری کرتا ہوا مردہ خانے سے باہر نکل رہا تھا۔ تو حق نواز اس کے ساتھ تھا اور اس

سنبھالے ہوئے تھا۔ پولیس والے نے ایک منٹ کے لیے حق نواز کو اپنے پاس بلا لیا اور جمشید چند منٹ کے لیے اکیلا رہ گیا۔ اسی وقت ایک شخص کسی جانب سے تیزی سے جمشید کے پاس پہنچا۔ اس شخص نے اپنے سر پر ایک چادر اس طرح ڈال رکھی تھی کہ اس کا آدھے سے زیادہ چہرہ چھپ گیا تھا اور اس کی شکل کو پہچاننا ناممکن تھا۔

بیٹا تو گیا۔ اس نامعلوم شخص نے جمشید کے بالکل پاس پہنچ کر بہت ہی ہلکی، پراسرار سرگوشی میں کہا۔ لیکن ابھی دو بیٹیاں تمہارے گھر میں موجود ہیں۔ اپنی زبان پر قابو رکھنا۔ کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ اور بھی زیادہ پچھتاؤ گے۔

اس کے ساتھ وہ شخص تیزی سے چلتا ہوا وہاں سے غائب ہوگیا۔ جمشید کے دماغ میں ایک تازہ دھماکا ہوا اور اس کے جسم سے رہی سہی جان بھی نکلنے لگی۔ وہ تو بالکل تباہ ہوگیا تھا۔ زبردست مارے اور رونے نہ دے والی بات تھی۔ وہ کسی سے اپنا دکھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

فرقان کے مارے جانے کی خبر رات کو ہی سارے محلے میں پھیل گئی تھی۔ اور لوگ جمشید کے گھر پہنچنا شروع ہوگئے تھے۔ یہ بات تو سب کو معلوم تھی کہ جمشید کا بیٹا فرقان اچانک غائب ہوگیا تھا۔ لیکن محلے میں عبدالرحمان کے علاوہ اور کسی کو بھی یہ بات نہیں معلوم تھی کہ فرقان کی گمشدگی کے اس معاملے کا شیدے بدمعاش سے بھی کوئی تعلق بنتا تھا۔ جمشید نے کسی کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ کسی نے اس سے رہائی کے عوض تاوان طلب کیا تھا۔

چنانچہ کئی لوگ اس سے قتل کی وجہ کے بارے میں پوچھ رہے تھے لیکن جمشید کے پاس ان کو بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ ان میں سے کسی کو بھی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ شیدے بدمعاش نے اس سے تاوان طلب کیا تھا۔ وہ جب اس کے بارے میں سوچتا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی دونوں معصوم بیٹیوں کے چہرے گھوم جاتے اور اس کا دل لرزنے لگتا۔ بیٹا تو نہیں رہا تھا۔ اب یہی دونوں بیٹیاں ہی تو اس کی زندگی کا سہارا تھیں۔ اس کے اور اس کی بیوی کے لیے بڑھاپے میں اگر کوئی سہارا بن سکتا تھا تو وہ بس یہی اس کی دونوں بیٹیاں تھیں۔ جن سے دونوں ماں باپ ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ اور جمشید اپنی بچیوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شیدے کی جانب سے اس کو ڈھکے چھپے الفاظ میں نہیں، بلکہ واضح طور پر دھمکی مل چکی تھی کہ وہ اس کا نام درمیان میں نہ لائے اور جمشید اپنی بچیوں کی خاطر اپنا منہ بند رکھنے کے لیے مجبور تھا۔ اس نے نفیسہ کو بھی اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ اس کو کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

اگرچہ نفیسہ کا دماغ شدت غم سے ماؤف سا ہوا جارہا تھا لیکن خوف کا نہایت مستحکم اور مہلک جذبہ غم سے بھی زیادہ قوی تھا۔ یہ خوف اس کو اپنے پورے خاندان کے لیے، جس میں اس کا شوہر اور اس کی دونوں بیٹیاں شامل تھیں، لاحق تھا۔ اور اس خوف نے رنج و الم کی انتہائی شدت کے باوجود بھی اصل بات کو اس کی زبان پر نہیں آنے دیا۔ وہ شیدے کو کوستی رہی۔ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی موت کی دعائیں کرتی رہی، لیکن دل ہی دل میں۔ با آواز بلند تو وہ ایسا کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

جمشید کے گھر پہنچنے والوں میں عبدالرحمان اور اس کے دونوں کرایہ دار بھی شامل تھے۔ وہاں جا کر عبدالرحمان کو ساری صورت حال کا علم ہوا۔ لیکن وہ اصل باتیں، جو جمشید نے کسی کو بھی نہیں بتائی تھیں، عبدالرحمان کو بعد میں ہی، جمشید کی زبانی معلوم ہوسکیں۔ عبدالرحمان تو جمشید کے بغیر کچھ کہے ہوئے ہی سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ اسے اس بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ فرقان کو کس نے قتل کیا ہے۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

کاش...... میں نے اپنی بیوی کی بات مان لی ہوتی۔ غم کا مارا ہوا جمشید تنہائی میں رو رو کر عبدالرحمان سے کہہ

رہا تھا۔ میری بیوی تو اس بات کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی کہ میں کسی پولیس افسر وغیرہ سے بات کروں۔ اس کا تو اصرار یہی تھا کہ میں شیدے بدمعاش کو رقم ادا کروں۔ اور فرقان کو اس کے پنجے سے چھڑا لوں۔ لیکن میں نے ہی حماقت کی۔ میں پولیس والوں کے چکر میں رہا کہ ان کے ذریعے میرا کام بن جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اتنے بڑے بڑے پولیس افسر بھی میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

یہ بات تو تم کو بہت پہلے ہی جان لینی چاہیے تھی۔ عبدالرحمان نے کہا۔ تم کو خود ایک پولیس والے نے ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ تم اپنے بیٹے کی تلاش کے سلسلے میں شیدے بدمعاش سے بات کرو۔ اس سے تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ بدمعاشوں کے حوصلے کس قدر بلند ہیں اور وہ کتنی بے خوفی اور ڈھٹائی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ انہیں پورا بھروسہ ہوتا ہے کہ کوئی ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ شیدے نے تم سے کھل کر بات کی۔ اس کو ذرا بھی ڈر نہیں لگا کہ تم پولیس کے پاس جا کر اس کی شکایت بھی کر سکتے ہو۔

میری بدنصیبی بھائی عبدالرحمان۔ جمشید نے روتے ہوئے کہا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں...... بس بیوقوفی کا شکار ہو گیا اور اب دیکھو...... میرے بیٹے کو قتل کر دینے کے بعد بھی اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ میں اس بات کا ذکر کسی اور سے نہ کروں۔ ورنہ وہ میری بیٹیوں کو بھی قتل کروا دے گا۔ کیسا اندھیر مچا ہوا ہے میرے بھائی...... کیسا اندھیر ہے۔

اندھیر تو ہے بھائی جمشید۔ عبدالرحمان نے ایک لمبی اور گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ اور ہمیں اسی اندھیر میں زندگی گزارنی ہے۔ اس سے کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔

میں تو لٹ گیا۔ برباد ہو گیا بھائی عبدالرحمان۔ جمشید رو رو کر کہہ رہا تھا۔ میں اب کیا کروں۔ کس کے پاس جاؤں...... کس سے فریاد کروں...... میری کون سنے گا۔

کوئی نہیں سنے گا۔ عبدالرحمان نے انتہائی بددلی کے ساتھ کہا۔ کسی سے فریاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو نقصان ہو گیا، اس کی تو کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اب اس بات کی کوشش کرو کہ مزید کوئی نقصان نہ ہونے پائے۔ تمہاری بچیوں کو خدا سلامت رکھے۔ ان کی جان بچانے کی فکر کرو۔

ہاں بھائی۔ جمشید نے روتے ہوئے کہا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ کہیں، کوئی بھی انصاف کرنے والا نہیں ہے۔ غریب آدمی کے لیے تو بربادی ہی بربادی ہے۔

جمشید نے عبدالرحمان کو اعتماد میں لے کر جو کچھ بھی بتایا تھا۔ وہ عبدالرحمان کے ذریعے ارشاد اور رحمت علی تک پہنچ گیا۔

جمشید اور اس کی بیوی نفیسہ، دونوں انتہائی غمگین ہونے کے ساتھ ساتھ، بہت زیادہ خوفزدہ بھی تھے۔ ان کی زندگی کا اصلی سہارا تو ان سے چھن چکا تھا اور دو بیٹیوں کی صورت میں اب جو کچھ ان کے پاس بچا تھا۔ اس کے چھن جانے کا خوف بھی لاحق تھا۔ اس کو بچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی زبانوں کو بند رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سینوں میں اٹھنے والے غم و غصے، نفرت اور احتجاج کے طوفانوں کو اندر ہی اندر کچل ڈالا اور اس آگ کو باہر نہیں آنے دیا جو ان کے وجود کو جھلسائے ڈال رہی تھی۔ بیٹا تو مارا ہی جا چکا تھا۔ بیٹیوں کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا اور بیٹیوں کا معاملہ تو اور بھی زیادہ نازک تھا۔

وہ دونوں خاموش رہے، اور جمشید نے عبدالرحمان کے علاوہ اور کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن عبدالرحمان کے ذریعے ارشاد اور رحمت علی کو اس معاملے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔

فرقان کے قتل کے واقعے سے اس سارے علاقے میں زبردست سنسنی پھیل گئی تھی۔ لوگوں کے درمیان خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی تھی اور سب لوگوں نے

اپنے اپنے بچوں کی زیادہ موثر طور پر حفاظت شروع کر دی تھی۔

پولیس نے بڑی سرگرمی کے ساتھ قاتلوں کی تلاش شروع کر دی تھی اور اس سلسلے میں کئی آدمیوں کو زیر حراست بھی لے لیا تھا جن سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ کچھ لوگوں کو شامل تفتیش بھی کر لیا تھا۔ جمشید سے بھی تفصیلی پوچھ گچھ کی گئی تھی اور پولیس والے اس سے یہ جاننا چاہتے تھے کہ آیا اس کو کسی پر شبہ ہے۔

کسی کے ساتھ تمہاری ذاتی یا خاندانی قسم کی دشمنی ہے۔ پولیس افسر نے جمشید سے پوچھا۔

نہیں جناب۔ جمشید نے کہا۔ میں مزدور آدمی ہوں نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں۔ میرا نہ کسی سے کوئی جھگڑا ہے نہ کوئی دشمنی ہے۔

کوئی خاندانی جھگڑا وغیرہ۔ پولیس افسر نے مزید سوال کیا۔

نہیں۔ جمشید نے جواب دیا۔ ہمارا کسی سے کوئی خاندانی جھگڑا وغیرہ نہیں ہے۔

کوئی ایسا شخص جس پر تم کو اپنے بیٹے کے اغوا اور اس کے قتل کا شبہ ہو۔

نہیں...... کوئی نہیں......! جمشید نے جواب دیا۔ مجھے کسی پر شبہ نہیں ہے۔

اور یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا کرتے وقت جمشید کو بڑی شدت کے ساتھ اس بات کا دکھ ہو رہا تھا کہ وہ سفید جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ خود جانتا تھا اور خوب جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کو اغوا کرنے والے اور قتل کرنے والے کون لوگ ہیں۔ مگر اس کا المیہ یہ تھا کہ اس کی زبان پر مہر لگی ہوئی تھی۔

ٹھیک ہے۔ پولیس افسر نے کہا۔ پھر تم ایسا کرنا، اگر اس سلسلے میں کوئی بھی بات تمہارے علم میں آئے یا کسی ذریعے سے کچھ معلوم ہو تو فوراً پولیس کو مطلع کر دینا۔

ٹھیک ہے جناب۔ جمشید نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

جس میں دکھ کے ساتھ ایسا نفرت آمیز غصہ بھی شامل تھا جس کا وہ برملا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا اور بس دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا سکتا تھا۔

پولیس والے چلے گئے اور جمشید نے سخت مایوسی، نا امیدی، کبیدگی اور بے بسی کے عالم میں اپنے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

کیسی ہولناک بے بسی تھی، بے چارگی اور کسمپرسی کا کیسا شدید عالم تھا...... وہ سب کچھ جانتا تھا۔ اپنے بیٹے کو اغوا کرنے والوں اور اسے قتل کرنے والوں سے بخوبی واقف تھا لیکن وہ ان کا کچھ بگاڑنا تو درکنار، ان کے خلاف لب کشائی کی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس، تھانہ، تفتیش، یہ سب کس قدر بے معنی، پرفریب اور مہمل باتیں تھیں۔ جن کا اصل حقائق سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔

ارشاد اور رحمت علی سارے حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے اور انہیں پل پل کی خبر تھی۔ ان دونوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور ان کے جسموں میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔

صابرہ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا۔ وہ اگرچہ انتہائی افسوس ناک اور قابل مذمت تھا، لیکن پھر بھی، اتنا تو ہوا تھا کہ صابرہ کی جان بچ گئی تھی اور وہ زندہ سلامت گھر واپس آ گئی تھی، اگرچہ اس کی رہائی کے عوض تاوان کی ایک بڑی رقم ارشاد اور رحمت علی کو اپنے پاس سے ادا کرنی پڑی تھی۔ لیکن عبدالرحمان کے بیٹے فرقان کو تو ان ظالموں نے قتل ہی کر ڈالا تھا۔ اس کی رہائی کے عوض انہیں رقم نہیں ملی تھی، اس لیے انہوں نے اس کو ختم کر ڈالا تھا۔

معلوم نہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے اور کتنے خون کیے ہوں گے اور آئندہ بھی یہ لوگ مزید کتنے خون کریں گے۔ رحمت علی نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے پیسے وصول کرتے رہیں گے اور جو

کوئی بھی ان کو پیسے دینے سے انکار کرے گا۔ یا پیسوں کا بندوبست نہیں کر سکے گا، اسے یہ بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر دیں گے۔

نہیں رحمت علی۔ ارشاد نے گہری سنجیدگی کے ساتھ، قدرے غمزدہ لہجے میں کہا۔ اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ہم اب ان کو یہ سب کچھ نہیں کرنے دیں گے۔

ہاں ارشاد۔ رحمت علی نے کہا۔ ایسا بہت ہو چکا۔ اس سے زیادہ ظلم نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ برداشت کر سکتے ہیں۔ اب حساب چکانے کا وقت آ گیا ہے۔

زندگی اور موت تو انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ارشاد نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ کس کام کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ ہو سکتا ہے، پہلا قدم اٹھاتے ہی موت ہم پر چھاپہ مار دے اور ہمیں دھر دبوچے۔ لیکن ہم اس چیز کو نہیں روک سکتے۔ کوئی بھی نہیں روک سکتا رحمت علی۔ یہ تو سب قدرت کے کھیل ہیں۔ جس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن انسان کے ہاتھ میں ایک چیز ضرور ہے اور وہی سب سے زیادہ ضروری ہے اور لازمی چیز ہے اور وہ ہے انسانی حوصلہ اور ہمت...... ہمت کرنا انسان کا کام ہے۔ آگے خدا کی مرضی۔ چاہے تو کامیاب بنائے یا ناکام بنائے۔

ہمیں تو بس اپنا کام شروع کر دینا ہے۔ رحمت علی نے کہا۔ اگر زندہ بچے تو کیا کہنا اور اگر مر گئے تو غم نہیں۔ اپنا تو کوئی رونے والا بھی نہیں ہے۔

ہاں یار۔ ارشاد نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اپنا بھی یہی حال ہے۔ کوئی رونے والا، کوئی یاد کرنے والا نہیں ہے۔ اگر مر گئے تو یاد کرنے والا اور آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اس رات وہ دونوں بہت دیر تک اپنے عملی پروگرام کی تیاری میں مصروف رہے۔ وہ دیر تک گھر سے باہر، ایک چھوٹے سے پارک میں بیٹھے رہے اور تنہائی میں بیٹھے ہوئے اپنے پروگرام کی تیاری کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

اگلا دن انہوں نے خاصا مصروف گزارا۔ انہیں کئی چیزوں کی ضرورت تھی، جو انہوں نے دور دراز کے علاقوں سے حاصل کیں۔

رات کو وہ دونوں معمول کے مطابق گھر آ گئے۔ کچھ دیر تک عبدالرحمان اور حسنہ سے ان کی ملاقات رہی۔ عبدالرحمان اور حسنہ، دونوں بہت خوفزدہ تھے۔ جمشید کے بیٹے فرقان کی موت ان کے لیے بھی ایک بڑا المیہ تھی۔ ان کی اپنی بیٹی صابرہ ایسے ہی انجام سے دوچار ہونے سے بال بال بچی تھی۔

خدا تم دونوں کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔ حسنہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اگر تم لوگوں نے بروقت ہماری مدد نہ کی ہوتی تو ہماری صابرہ......! حسنہ کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

خدا کا شکر کرو چاچی۔ ارشاد نے کہا۔ اس نے صابرہ کو نئی زندگی دے دی۔ ہم نے بھلا کیا کیا ہے۔ اگر خدا کی مرضی نہ ہوتی تو ہم کیا کر سکتے تھے۔

جمشید نے بہت بڑی غلطی کی۔ عبدالرحمان نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ اگر وہ شیدے کی بات مان لیتا تو آج اس کا بیٹا زندہ ہوتا۔ مگر وہ تو اعلیٰ پولیس افسر کے چکر میں پڑا رہا اور اس پولیس افسر نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔

پولیس والے جب خود ہی مجرموں کے ساتھ ملے ہوئے ہوں، تو آپ ان سے اور کیا امید کر سکتے ہیں۔ ارشاد نے آہستہ سے کہا۔ ہماری پولیس تو شیدے جیسے بدمعاشوں کی ہی ایک شکل بن کر رہ گئی ہے اور ہم لوگ اس سارے گٹھ جوڑ کے آگے کتنے کمزور اور بے بس ہیں۔

جو لوگ بھی ان سے ٹکرانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا انجام خوفناک ہوتا ہے۔ رحمت علی نے کہا۔ ہم نے تو بہت اچھا کیا چاچا، کہ ان کتوں کے آگے ہڈی ڈال دی اور اپنی صابرہ کو ان سے چھڑا لائے۔

کچھ دیر کے بعد بات چیت کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور سب لوگ سونے کے لیے چلے گئے۔

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی جب ارشاد اور رحمت علی نے اپنی عملی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان دونوں نے کچھ دیر کی نیند لے لی تھی دونوں بہت آہستہ آہستہ، بغیر کوئی آواز پیدا کیے ہوئے، کام کر رہے تھے۔ وہ کمرے کے دوسری طرف، گھر کے دوسرے سوئے ہوئے لوگوں کی طرف سے، بہت محتاط تھے۔ ان لوگوں کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

ذرا دیر بعد، جب انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ دونوں کی شکلیں اتنی زیادہ بدل چکی تھیں کہ وہ ایک دوسرے کو بالکل بھی پہچان نہیں سکتے تھے۔

واہ......! رحمت علی نے ہنستے ہوئے، سرگوشی میں ارشاد سے کہا، جس کے چہرے پر ایک ترشی ہوئی، گول سفید داڑھی نے اس کو اچانک ایک عمر رسیدہ، سفید بالوں والا آدمی بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے سر پر بھی سفید رنگ کی ایک گول، کپڑے کی ٹوپی اس طرح پہن رکھی تھی کہ اس کے سر کے سارے بال اس ٹوپی کے نیچے چھپ گئے تھے۔

کیا واقعی میں پہچانا نہیں جا رہا ہوں۔ ارشاد نے سرگوشی میں پوچھا۔

ہاں۔ رحمت علی نے جواب دیا۔ تم بالکل نہیں پہچانے جا رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی شخص تم کو نہیں پہچان سکے گا۔ جب میں بھی تم کو نہیں پہچان سکا، تو پھر بھلا کوئی دوسرا شخص کیونکر پہچان سکتا ہے۔

یہ بہت اچھا ہے۔ ارشاد نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔ اور تمہاری شکل بھی بالکل پہچاننے میں نہیں آ رہی ہے۔ اس نے اپنی نظریں رحمت علی کے چہرے پر گاڑ دیں، جو کہ اب رحمت علی کا چہرہ نہیں رہا تھا۔ یہ تو کسی اور ہی آدمی کا چہرہ تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی، سیاہ اور نوکدار مونچھیں تھیں اور سر پر کسی ہوئی ایک پگڑی۔ اس نے دونوں کانوں میں کافی بڑے بڑے بالے بھی پہن رکھے تھے۔

ضروری سامان کے دو الگ الگ تھیلے تو انہوں نے رات کو ہی تیار کر لیے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ یہاں سے نکلیں اور اپنی کارروائی کا آغاز کریں۔

جس وقت وہ دونوں خاموشی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ وہ رات کا آخری پہر تھا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا طاری تھا اور سارے لوگ گہری نیند میں تھے۔ یہ رات کا وہ وقت تھا جب سونے والوں کی نیند سب سے زیادہ گہری ہوئی ہے اور معمولی سے شور سے آنکھ کھلنے کا خدشہ نہیں ہوتا۔

ارشاد اور رحمت علی نے گزشتہ کافی دنوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کے بعد شیدے کے اڈے کی شبانہ سرگرمیوں کا بہت اچھی طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ رات کو کب تک کاروبار جاری رہتا ہے اور کب اڈہ بالکل خالی ہو جاتا ہے اور اس میں صرف تینوں مستقل رہنے والے، یعنی شیدا، زبیر اور صدیق رہ جاتے ہیں۔

رات کے آخری پہر تک باہر سے آنے والے سارے لوگ اڈے سے چلے جاتے تھے۔ ان میں وہ بھی شامل ہوتے تھے جو کھلم کھلا آتے تھے اور وہ بھی، جو رات کی تاریکی میں منہ چھپا کر آتے تھے اور رات کی تاریکی میں ہی وہاں سے غائب ہو جاتے تھے۔ منشیات خریدنے والے، جوا کھیلنے والے۔ مختلف قسم کی جرائم پیشہ سرگرمیوں کے لیے خدمات حاصل کرنے والے اور دوسرے بہت سارے لوگ۔

رات کے آخری پہر تک سب کچھ ختم ہو جاتا تھا اور اڈہ بالکل خالی ہو جاتا تھا۔

رحمت علی اور ارشاد احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ چلتے

ہوئے، خاموش، ویران اور نیم تاریک جگہوں میں سے گزرنے لگے۔ سارے مکان اور ان کے تمام مکین گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر طرف گہرے سناٹے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے در و دیوار نے بھی سانس روک لی ہے۔

وہ دونوں پوری طرح چوکنے تھے۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح سے علم تھا کہ رات کو اس علاقے میں کوئی پولیس پارٹی گشت کے لیے نہیں آتی۔ یہ شیدے بدمعاش کا علاقہ تھا اور یہاں اس کو اپنی من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ محلے کے کسی شخص میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کے خلاف پولیس میں کوئی رپورٹ کرتا۔ سب ہی لوگ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ شیدے کو مقامی پولیس کی مکمل سرپرستی حاصل ہے اور شیدے کے خلاف شکایت کرنے کا مطلب ہے نہ صرف شیدے سے دشمنی مول لینا، بلکہ پولیس سے بھی دشمنی مول لینا۔ اس لیے لوگ خاموشی سے اس کی زیادتیوں کو برداشت کرتے رہتے تھے۔

وہ دونوں کئی گلیوں سے گزر کر شیدے کے مکان تک پہنچ گئے اور راستے میں انہیں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی اور اب وہ دونوں شیدے کے مکان کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔

یہاں کچھ دیر رک کر انہوں نے صورت حال کا نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ جائزہ لیا۔

مکان کے اندر اور باہر دونوں جگہ سناٹے کا راج تھا۔ ارشاد نے اپنا ایک کان دروازے کے ساتھ لگا کر غور سے سننے کی کوشش کی، جبکہ رحمت علی چوکسی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔

اس کے بعد وہ دونوں مکان کے عقبی حصے میں چلے گئے۔ جہاں ایک بہت ہی پتلی سی گلی تھی جس میں سے صرف پیدل ہی گزرا جاسکتا تھا۔ سوائے سائیکل یا موٹر سائیکل کے اور کوئی سواری اس گلی میں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔

انہوں نے تو سب کچھ پہلے سے دیکھ رکھا تھا اور وہ نیم تاریکی میں، بلکہ مکمل تاریکی میں بھی اپنا کام بخوبی کرسکتے تھے۔ انہیں پہلے سے اچھی طرح معلوم تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

یہ ایک دو منزلہ مکان تھا اور اس کی زمینی منزل کی چھت کا ایک حصہ عقبی سمت میں باہر کی طرف نکلا ہوا تھا۔ یہ جگہ ایسی تھی جہاں رسی پھنسائی جاسکتی تھی لیکن دیکھنا یہ تھا کہ آیا چھت کے اس باہر کی طرف نکلے ہوئے حصے میں اتنی جان ہے کہ وہ ایک پورے آدمی کا بوجھ اٹھا سکے۔

رسی پھینکنے کا کام ارشاد نے کیا۔ یہ اس کے لیے بالکل نیا کام تھا اور اسے اس کا کوئی سابقہ تجربہ نہیں تھا۔ رحمت علی نے بھی اس سے پہلے اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اگرچہ دونوں نے، بہت سارے دوسرے لڑکوں اور نوجوانوں کے ساتھ مل کر، خرکاروں کے ڈیرے پر زبردست حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ تاہم، ان کارناموں میں اس قسم کا کوئی کام شامل نہیں تھا۔

لیکن وہ سیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اب جو کچھ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس میں بے شمار نئے اور ان جانے مراحل آتے تھے۔ انہیں بتدریج ان سارے مراحل سے گزرنا تھا۔ سب کچھ سیکھنا تھا۔ وہ سارے کام سیکھنے تھے جو انہوں نے اس سے پہلے کبھی بھی نہیں کیے تھے۔

ارشاد کو چوتھی کوشش میں کامیابی حاصل ہوئی اور رسی چھت کے نکلے ہوئے حصے میں ایک ابھری ہوئی جگہ میں پھنس گئی۔ ارشاد نے اس کو کھینچنا شروع کیا۔ رسی تننے لگی، یہاں تک کہ وہ پوری طرح تن کر سخت ہوگئی۔ دونوں نے باری باری رسی کو کھینچ کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا۔ وہ اپنی جگہ پر سختی کے ساتھ جمی ہوئی تھی۔

رسی کی طرف سے کسی قدر مطمئن ہوجانے کے بعد، طے شدہ منصوبے کے تحت، ارشاد نے اس پر چڑھنا شروع کیا۔ ارشاد رحمت علی سے بڑا تھا اور اس کا وزن بھی رحمت علی سے زیادہ تھا۔ اگر یہ رسی ارشاد کا وزن سنبھال لیتی تو پھر یہ رحمت علی کا وزن تو زیادہ آسانی کے ساتھ سہار سکتی تھی۔

ارشاد رسی کو پکڑ کر اس پر بندروں کی طرح چڑھنے لگا اور رحمت علی نے نیچے سے رسی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ پوری طرح سے مستعد، اور اس بات کے لیے تیار تھا کہ اگر خدانخواستہ رسی ٹوٹ جائے اور ارشاد نیچے گرنے لگے تو وہ ارشاد کو سہارا دے سکے اور اس کو زیادہ چوٹ لگنے سے محفوظ رکھ سکے۔

رحمت علی کے پکڑ لینے کی وجہ سے رسی ادھر ادھر جھول نہیں رہی تھی، بلکہ ایک ہی جگہ پر مضبوطی اور سختی کے ساتھ تنی ہوئی تھی۔ ارشاد اس تنی ہوئی رسی پر آہستگی اور احتیاط کے ساتھ چڑھتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔

بالآخر وہ اوپر تک جا پہنچا اور پھر وہ چھت پر تھا۔ رسی نے اور چھت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی چیز نہیں ٹوٹی تھی۔

اور اب رحمت علی کی باری تھی۔ ارشاد نے اوپر پہنچنے کے بعد رسی کو اور بھی زیادہ مضبوطی سے اور اچھی طرح چھت کے نکیلے حصے میں پھنسا دیا اور اب اس کے الگ ہوجانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ چھت کا وہ حصہ بھی پوری طرح سے مضبوط تھا۔

رحمت علی نے بسم اللہ کہہ کر رسی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ارشاد اوپر موجود تھا اور رسی کو پکڑے ہوئے تھا۔ تاہم، وہ رسی کو جھولنے سے نہیں روک سکتا تھا۔

رحمت علی کا کام اس لحاظ سے ارشاد کے کام کے مقابلے میں زیادہ مشکل تھا کیونکہ رسی برابر ادھر ادھر جھول رہی تھی اور ایسی جھولتی ہوئی رسی کی مدد سے اوپر چڑھنے کا یہ تجربہ رحمت علی کے لیے بالکل نیا تھا۔ تاہم، ارشاد کے مقابلے میں اس کو یہ آسانی ضرور حاصل تھی کہ رسی کے نکل جانے یا ٹوٹ جانے کا خطرہ نہیں تھا، کیونکہ رحمت علی کا وزن ارشاد کے مقابلے میں کم تھا۔

ارشاد کی طرح رحمت علی بھی ایک بالکل نئے تجربے سے دوچار ہو رہا تھا اور اس تجربے سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ خطرے کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے خوشی ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ، پیر جما جما کر رسی پر چڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ اوپر پہنچ گیا۔ جہاں ارشاد اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گویا ایک دوسرے کو اس پہلی کامیابی پر مبارک باد دی اور ایک دوسرے کا حوصلہ بھی بڑھایا۔

دونوں نے چھت پر رک رک کر، اپنے گرد و پیش کا اور نیچے کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ انہیں ہر طرف گہرے سناٹے کا ہی احساس ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مکان کے اندر کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

وہ دونوں ذرا دیر تک وہیں بیٹھے رہے، اور پھر سیدھے کھڑے ہونے کے بجائے، رکوع کی سی حالت میں جھک کر چلتے ہوئے، چھت پر سے نیچے اتر آئے۔ یہاں زینے میں کوئی دروازہ نہیں تھا اور وہ چھت پر سے باآسانی اتر کر پہلی منزل پر آگئے۔

پوری منزل پر سناٹا تھا۔ یہاں اس منزل پر کئی کمرے تھے۔ شیدے کو اور اس کے دونوں ساتھیوں کو نیچے والی منزل پر ہونا چاہیے تھا۔

یہ بات ان کو پہلے سے معلوم تھی کہ رات کو سارے ہنگاموں کے ختم ہوجانے کے بعد شیدا اور اس کے دونوں ساتھی نیچے والی، یعنی زمینی منزل پر ہی سوتے ہیں اور اس وقت بالائی منزل کے سب کمرے خالی ہوجاتے ہیں۔

ان دونوں نے بڑی آہستگی اور ہوشیاری کے ساتھ اس منزل کے کمروں کا جائزہ لیا۔ اس سرسری اور مختصر سے جائزے کا مقصد صرف یہ دیکھنا تھا کہ آیا وہاں کوئی آدمی تو موجود نہیں ہے۔ ان کے پاس ٹارچیں موجود

تھیں لیکن وہ ان کا استعمال بہت کم اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ کر رہے تھے۔

اوپری منزل کے کسی بھی کمرے میں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں پوری طرح سے مطمئن ہو گئے۔ یہ ساری منزل خالی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ اس مکان میں جو کوئی بھی لوگ ہیں، وہ صرف زمینی منزل پر موجود ہیں۔

پہلی منزل سے زمینی منزل تک پہنچ جانے کا مرحلہ بھی کوئی دشوار گزار ثابت نہیں ہوا۔ زینے میں ایک دروازہ تھا اور وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ اگر دروازے میں تالا موجود ہوتا تو ان کے پاس اس کا بھی حل موجود تھا۔ وہ دروازے کے ذریعے جانے کے بجائے، دوبارہ چھت پر واپس جا کر رسی کے ذریعے نیچے اتر سکتے تھے۔ وہ اس کے لیے تیار تھے۔ لیکن انہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ انہیں دروازہ کھلا ہوا ملا، اور وہ نیچے اتر گئے۔

نیچے اترنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ گھر کے دروازے کے پاس جا کر اندر سے اس کی کنڈی کھول دی۔

دروازے میں اندر سے صرف کنڈی لگی ہوئی تھی۔ کوئی تالا نہیں تھا۔

شیدے اور اس کے ساتھیوں کو اپنی طاقت پر، اپنی حیثیت پر اور اپنی دھاک پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ ان کے مکان میں چوری چھپے گھسنے کی کوشش کرنا تو درکنار، کوئی شخص اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بھلا کس میں اتنی جرات تھی جو ان کے ساتھ ایسا کرنے کی کوشش کرتا! اس لیے وہ اپنے مکان کی حفاظت کی طرف سے بھی زیادہ فکر مند نہیں رہتے تھے۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ کوئی ان کو گھر میں گھس کر مارنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔

دروازہ کھولنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔ اب باہر جانے کا راستہ کھل گیا تھا۔

مکان کی نچلی منزل میں بھی بالکل سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی بھی شخص موجود نہیں ہے۔

مکان کا اندرونی حصہ بھی ان کے لیے نیا تھا۔ انہیں یہاں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا، سوائے اس کے کہ ان تینوں کو اسی جگہ، اسی حصے میں، کہیں موجود ہونا چاہیے۔

انہوں نے سب سے پہلے شیدے کو تلاش کر لیا۔ وہ انہیں پہلے ہی کمرے میں مل گیا۔ وہ ایک چارپائی پر بے خبر سو رہا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا اور اس کی مدھم روشنی میں پلنگ پر بے خبر سویا ہوا شیدا صاف نظر آ رہا تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رحمت علی نے جھٹ سے اپنی جیب میں سے رومال نکالا اور سوئے ہوئے شیدے کے منہ پر لگا دیا۔ شیدے کے جسم میں ایک لمحے کو ایک ہلکی سی، غیر محسوس سی، تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی اور پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

وہ دونوں فوراً ہی اس کمرے سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے شیدے کو بے ہوش کر دیا تھا اور اب یہی کام انہیں اس کے باقی دونوں ساتھیوں کے ساتھ کرنا تھا اور بہت زیادہ محتاط اور چوکس رہنا تھا۔ ان دونوں میں سے کسی کے بھی جاگ جانے کی صورت میں کام خراب ہو سکتا تھا۔

وہ دونوں دوسرے کمرے میں داخل ہوئے، یہ خالی تھا۔

زبیر اور صدیق انہیں تیسرے کمرے میں ملے۔ وہ دونوں دو برابر برابر بستروں پر سو رہے تھے۔

رحمت علی نے اپنا کام کرنے میں ایک منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں لگایا۔ اسے سب کچھ بہت جلدی کرنا تھا۔ ایک منٹ کے اندر رحمت علی نے بے ہوشی کی دوا سنگھا

زبیر اور صدیق، دونوں کو ہی بے ہوش کر دیا۔

ارشاد نے ان دونوں کو ہلا جلا کر دیکھا وہ دونوں بے ... ں تھے۔

کاش، ہم ان کو اس طرح مار سکتے کہ انہیں علم ہو جاتا ... ئی ان کو ختم کر رہا ہے۔

ارشاد نے آہستہ سے کہا۔ لیکن افسوس کہ فی الوقت ... ے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ ہمارے پاس ... آتشیں ہتھیار نہیں ہے جس کی مدد سے ہم انہیں ... یکنڈ میں ڈھیر کر دیں۔

... اس بات کا تو واقعی افسوس رہے گا کہ ہم انہیں بتا کر ... نہیں کر سکے۔ ارشاد نے سرگوشی کی۔ مگر خیر...... کوئی ... ہیں۔ ان منحوسوں کا انجام ان کے اپنے دوسرے ... وں کے لیے، اور ان جیسے بہت سے دوسروں کے ... عبرت ناک ہوگا۔

...، پھر اس کا قصہ پاک کرو۔ رحمت علی نے بھرائی ... آواز میں کہا۔

... اد نے اپنے کرتے کی جیب میں سے ایک لمبا ... نکالا اور اس کی نوک کو زبیر کی گردن پر رکھ دیا۔

... علی دم سادھے ہوئے اس خوفناک اور روح ... منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس کے لیے ... قتل کا یہ منظر کوئی پہلا اور نیا منظر نہیں تھا۔ وہ تو اس ... ایسے کتنے ہی مناظر دیکھ چکا تھا۔ اس قسم کا سب ... منظر تو اس نے جیل میں دیکھا تھا۔ جب اس کی ... کے سامنے ایک قیدی عورت کو دوسری قیدی ... نے ہلاک کر دیا تھا اور پھر، خرکاروں کے ڈیرے ... کی تاریخ تو ایسے خوں چکاں واقعات سے بھری ...

... نے بہت آہستگی کے ساتھ چاقو زبیر کی گردن ... شروع کر دیا۔ رحمت علی نے زبیر کے بستر پر ... چادر کو اٹھا کر ارشاد کے جسم کے سامنے کر دیا ... ارشاد کا لباس خون کے دھبوں سے محفوظ رہے۔

زبیر کے گلے سے خون نکلنے لگا جو رفتہ رفتہ فوارے کی شکل اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ ارشاد نے چاقو کا پورا دستہ اس کی گردن میں پیوست کر دیا۔ اور پھر جب اس نے چاقو کو باہر نکالا تو خون اور بھی زیادہ تیزی کے ساتھ بہنے لگا۔ اس نے اس کی گردن پر ایک وار اور کیا اور ایک اور سوراخ بنا دیا۔

بس، اب اس میں جان نہیں ہے۔ رحمت علی نے آہستہ سے کہا۔

ٹھیک ہے۔ ارشاد نے کہا۔ اور اس کے بعد وہ صدیق کی طرف متوجہ ہوا۔

صدیق بے ہوشی کے عالم میں تھا اور یہ ایک ایسی بے ہوشی تھی جس سے اس کو ہوش میں نہیں آنا تھا۔

ارشاد نے صدیق کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو اس نے زبیر کے ساتھ کیا تھا۔ اور چاقو سے اس کے نرخرے کو کاٹ دیا۔ رحمت علی نے اس کے آگے چادر تان دی تھی اور اس طرح ارشاد کا لباس خون آلود ہونے سے محفوظ رہا۔

دونوں موذی ختم ہو گئے۔ ارشاد نے چاقو کے پھل کو صدیق کے بستر سے صاف کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ اب دیکھیں، کس کو اغوا کرتے ہیں، کس کے لواحقین سے رقم وصول کرتے ہیں اور کس بچے کو رقم نہ ملنے کے نتیجے میں قتل کرتے ہیں۔

بہت مال کمایا ہے حرام زادوں نے۔ رحمت علی نے دانت پیس کر کہا۔ اب ان کو اوپر جا کر معلوم ہوگا کہ ان کا وہ مال ان کے کس کام آئے گا۔

وہ دونوں واپس شیدے کے کمرے میں پہنچے اور جیسے ہی وہ شیدے کے بستر کے قریب پہنچے۔ ایک عجیب اور نہایت خطرناک بات رونما ہوئی۔

اسی وقت شیدے نے آنکھیں کھول دیں اور ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں میں سخت

وحشت، حیرت اور بے یقینی تھی۔ شاید وہ اس منظر پر بالکل یقین نہیں کرسکتا تھا جو اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

ارشاد اور رحمت علی کے لیے بھی یہ منظر غیر متوقع اور تقریباً ناقابل یقین تھا۔ ان کا تو یہ محکم خیال تھا کہ شیدے کو ابھی کافی دیر تک ہوش نہیں آئے گا لیکن شیدا تو ہوش میں آچکا تھا! شاید وہ پورے طور پر ہی ہوش میں آگیا تھا اور وقت سے کافی پہلے ہی۔

کون۔ کون ہو تم لوگ۔ اچانک شیدے کی زبان سے سخت گھبراہٹ اور بدحواسی کے عالم میں یہ الفاظ ادا ہوئے اور اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔

ارشاد اور رحمت علی کے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ شیدے کا اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوش میں آجانا ان دونوں کے اپنے خاتمے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔

اور خود شیدے کے لیے بھی یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یہ دو اجنبی، نامعلوم کس طرح سے گھر کے اندر داخل ہوگئے تھے اور کیا کرنا چاہتے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی دوست تو ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ صرف دشمن ہی ہوسکتے تھے۔

ارشاد نے زبردست پھرتی، چابک دستی اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے شیدے کو بستر سے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ قبل اس کے کہ شیدا بستر سے اٹھ سکتا، ارشاد نے نہایت سرعت کے ساتھ اپنا چاقو اس کی گردن میں اتار دیا۔

شیدے کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی اور اس نے اپنے ہاتھوں کو اوپر لا کر ارشاد کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی، لیکن رحمت علی نے اس کی اس کوشش کو فوراً ناکام بنا دیا۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اچھل کر اس کے سینے پر ایک بھرپور لات رسید کی۔ اس کے ساتھ ارشاد نے تیزی سے چاقو کی نوک اس کی گردن میں پیوست کردی اور پھر وہ اسے آگے ہی آگے دھکیلتا گیا اور اس نے اپنے ہاتھ کو تیزی سے ادھر ادھر بھی گھمایا۔

ارشاد ایک ہاتھ سے شیدے کی گردن پر چاقو چلا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کا منہ دبا رکھا تھا۔ تاکہ وہ چلا نہ سکے۔ شیدے کے حلق سے صرف گھٹی گھٹی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

رحمت علی غیر معمولی مستعدی، حاضر دماغی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے تیزی کے ساتھ ایک چادر گھسیٹ لی تھی جو بستر پر رکھی ہوئی تھی اور اسے شیدے کی گردن کے آگے لگا دیا تھا۔ اس طرح اس نے خود کو اور ارشاد کو خون کے چھینٹوں سے بڑی حد تک محفوظ کرلیا تھا۔

اور کتنے بچوں کو اغوا کرے گا تو کتے کی اولاد۔ رحمت علی نے دانت پیس کر اس سے کہا۔ کتنے بچوں کو رقم نہ ملنے کی وجہ سے قتل کرے گا۔ بول......اور کتنے انسانوں کا خون پیے گا تو۔

شیدے کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں اور ان دھندلاتی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت تھی۔ یہ ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری وقت کی آنکھوں کی وحشت تھی۔ ارشاد اور رحمت علی۔ دونوں اس کی آنکھوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

شیدے کا نرخرہ کٹ چکا تھا، اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوگئی تھیں اور اس کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔ ان دونوں نے اس کو چھوڑ دیا۔

وقت کم تھا۔ کچھ دیر بعد صبح ہونے والی تھی اور اس سے پہلے انہیں کئی ضروری کام انجام دینے تھے۔

ان دونوں نے فوراً ہی گھر کی تلاشی شروع کردی اور اس کام کا آغاز انہوں نے شیدے کے کمرے سے ہی کیا۔

شیدے کے کمرے کی الماری میں سے انہیں بھاری رقم ملی۔ گننے کا نہ تو وقت تھا نہ ضرورت۔ انہوں نے

سارے نوٹوں کو اپنے تھیلوں میں ٹھونس لیا اور الماری کے سامان کو بے دردی سے باہر کھینچ کر ادھر ادھر پھیلا دیا۔ الماری میں بہت سے کاغذات وغیرہ بھی موجود تھے، لیکن ان سے انہیں نہ تو کوئی دلچسپی تھی اور نہ ان کی جانچ کرنے کا ان کے پاس وقت تھا۔ انہوں نے صرف نوٹ بھرے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

زبیر اور صدیق کے کمرے کی الماری میں سے بھی ان کو اچھی خاصی رقم ملی، جسے انہوں نے گنے بغیر اپنے تھیلے میں بھر لیا اور الماری کے سامان کو فرش پر بکھیر دینے کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی کمرے کو بھی بے ترتیب کردیا۔

اس کے بعد وہ دونوں خاموشی سے، دروازہ کھول کر، مکان سے باہر نکل گئے۔ ان دونوں کو اپنے چہرے چھپانے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ یہ چہرے ان کے چہرے نہیں تھے۔

ویسے انہیں چہرے چھپانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا پھیلا ہوا تھا اور دور و نزدیک کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ انہوں نے مکان کے دروازے کو اچھی طرح سے بھیڑ دیا اور وہاں سے چلے آئے۔

گلیوں گلیوں گزرتے ہوئے وہ واپس اپنے مکان تک آگئے اور اپنے کمرے میں داخل ہوگئے۔ ان دونوں کے جسموں پر بالکل سیاہ رنگ کے لباس تھے اور اندھیرے میں وہ محض پرچھائیوں کی طرح نظر آرہے تھے۔

ان کا کمرہ انہیں اسی حالت میں ملا جس حالت میں وہ اس کو چھوڑ کر گئے تھے۔

گلی میں بالکل اندھیرا تھا اور کسی نے ان کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں مطمئن تھے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا ہے۔

کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کرلینے کے بعد انہوں نے جلدی جلدی اپنا میک اپ اتارا، اور لباس تبدیل کیے۔ کمرے کی بہت ہلکی روشنی میں ان کے لیے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ آیا ان کے لباس پر خون کے کچھ چھینٹے آئے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے فوراً ہی دونوں جوڑوں کو کپڑے کے دو الگ الگ تھیلوں میں ٹھونس دیا اور اس کے بعد جلدی جلدی ہاتھ منہ دھونے لگے۔

انہیں لیٹنے یا سونے کا وقت بالکل نہیں مل سکا۔ گھر میں پلے ہوئے مرغ نے بانگ دی، اور اس کے ساتھ ہی آس پاس کے کئی اور گھروں سے بھی مرغوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ صبح ہو رہی تھی۔

ان دونوں نے روز کی طرح اپنے کام پر جانے کی تیاری شروع کردی۔ اندر گھر میں عبدالرحمان اور حسنہ بھی بیدار ہو چکے تھے۔

دن کا آغاز ہو رہا تھا اور ذرا ہی دیر کے بعد اس واردات کا علم ہو جانا تھا۔ اور ساتھ ہی سارے علاقے میں سنسنی پھیل جانی تھی۔ لیکن ان دونوں کو اس وقت تک وہاں نہیں رکنا تھا۔

وہ دونوں تو معمول کے مطابق گھر سے نکل گئے۔ اس وقت تک شیدے اور اس کے اڈے کے بارے میں کوئی خبر نہیں پھیلی تھی۔

وہ دونوں اپنے گھر سے نکلنے کے بعد سیدھے منڈی نہیں پہنچے، بلکہ وہ ایک اور جگہ گئے۔

انہوں نے اس جگہ کو پہلے ہی اپنے کام کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ یہ شہر کے مضافات میں ایک ویران اور غیر آباد جگہ میں درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا۔ جس میں ایک بہت پرانا درخت ایسا بھی تھا جس کے تنے میں بالائی حصے پر ایک کھوہ واقع تھی جو کہ کافی گہری تھی۔ انہوں نے ایک ڈوری کے سرے پر پتھر باندھ کر اس کھوہ کی گہرائی کا پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا۔

درختوں کے اس جھنڈ کے قریب ہی گندے پانی کا ایک جوہڑ بھی واقع تھا۔

انہوں نے سب سے پہلے تو اپنے ان کپڑوں کو، جو

انہوں نے گزشتہ شب استعمال کئے تھے، تھیلوں میں سے نکال کرانہیں کچھ بھاری پتھروں کے ساتھ باندھا اور گندے پانی کے جوہڑ میں پھینک دیا یہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ ان پر خون کے دھبے ہیں یا نہیں ہیں۔

شیدے کے اڈے سے لوٹی ہوئی ساری رقم کو انہوں نے پہلے ہی کپڑے کے ایک بڑے تھیلے میں ٹھونس لیا تھا اور اس تھیلے کے منہ پر انہوں نے خوب مضبوطی سے ایک ڈوری باندھ لی تھی۔ انہوں نے تھیلے کو کھوہ کے اندر لٹکا دیا اور لمبی ڈوری کے ایک سرے کو کھوہ کے اوپری حصے کے ذرا نیچے ایک باہر کی طرف نکلے ہوئے ٹھنٹھ سے اچھی طرح باندھ دیا۔ یہ ٹھنٹھ ایسی جگہ تھا کہ باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔ اسے یا تو صرف اندر ہاتھ ڈال کر محسوس کیا جا سکتا تھا یا ٹھنٹھ کے قریب جا کر اس میں اندر کی طرف منہ ڈال کر اس کو دیکھا جا سکتا تھا۔

انہوں نے شیدے کے اڈے سے حاصل کردہ ساری رقم کو اس اندھے کنویں میں لٹکا دیا اگرچہ انہوں نے اپنی طرف سے تو پوری احتیاط اور حفاظت کا بندوبست کیا لیکن پھر بھی انہیں پورا یقین نہیں تھا کہ انہیں یہ رقم واپس مل جائے گی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی اتفاقی واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ اس بھاری رقم سے محروم ہو سکتے تھے۔ لیکن انہیں اس کی کوئی خاص فکر بھی نہیں تھی۔ کون سی ان کی اپنی رقم تھی......! سارا بدمعاشوں کا مال تھا۔ اگر کوئی لے بھی جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا......! تاہم، انہیں بڑی حد تک یقین تھا کہ کوئی اس رقم کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ کیونکہ وہاں تک کسی کی رسائی کا امکان بہت کم تھا۔

انہوں نے اس امر کی پوری طرح تشفی کر لی تھی کہ انہیں کوئی دیکھ نہیں رہا ہے۔ وہ سارا علاقہ سنسان تھا۔ اور وہاں سناٹے اور دہشت کا راج تھا۔

انہیں اپنا کام مکمل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اور جب وہ وہاں سے اپنا کام پورا کر کے رخصت ہونے لگے تو اس وقت صبح کو پوری طرح نمودار ہوئے صرف کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔

وہ دونوں وہاں سے سیدھے منڈی چلے گئے۔ جہاں پہنچتے ہی انہوں نے اپنا روزمرہ کا کام شروع کر دیا۔ وہ اب منڈی کے مزدور تھے۔ بوجھ اٹھانے والے۔ عام غریب مزدور، اور انہوں نے روز کی طرح مزدوری کرنی شروع کر دی۔

منڈی میں کتنے ہی دوسرے مزدوروں کے علاوہ بہت سارے دکان دار اور بیوپاری وغیرہ بھی ان کو اچھی طرح جان گئے تھے۔ اور ان کے ناموں سے واقف تھے۔ کئی تو اس جگہ سے بھی واقف تھے جہاں وہ کرائے پر رہتے تھے۔

اس کے علاوہ، ایک اور بہت اہم بات تھی جو ان کے بارے میں بہت سارے لوگوں کو معلوم تھی۔ اور وہ یہ کہ وہ دونوں بے حد ایمان دار تھے۔

منڈی کے کئی دکان داروں نیز بیوپاریوں کو اس کا بہت اچھی طرح سے تجربہ تھا۔ اور انکے اس تجربے سے دوسرے دکان دار اور بیوپاری وغیرہ بھی پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان دونوں مزدوروں نے کتنے ہی ایسے گاہکوں کا قیمتی سامان ان کے گھروں یا مختلف ٹھکانوں پر پہنچایا تھا جنہوں نے ان کے ہاتھ کافی بڑی بڑی رقمیں دکان داروں کو بھجوائی تھیں، اور دکان داروں کو وہ رقمیں ہمیشہ بالکل پوری کی پوری ملی تھیں۔ دونوں مزدور لین دین کے بہت کھرے اور بہت زیادہ ایماندار تھے۔ منڈی کے کتنے ہی دکان دار اس امر کی گواہی دے سکتے تھے۔ کہ ان دونوں مزدوروں کا جرائم کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو بہت ایماندار اور اچھے لوگ تھے۔ انہوں نے گزشتہ روز بھی منڈی میں کام کیا تھا۔ اور وہ آج بھی منڈی میں کام کر رہے تھے۔

کام کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا تھا۔ انہوں نے

صبح سے اب تک کافی سامان ڈھویا تھا۔ اور اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ انہیں کچھ دیر کے لیے کام بند کر کے ہوٹل میں جا کر کھانا کھانا تھا۔

وہ اس وقت صادق حسین کی دکان میں موجود تھے۔ ایک گاہک کا کوئی سامان، جو اس نے اس دکان سے خریدا تھا۔ انہوں نے اس شخص کی گاڑی میں لاد دیا تھا۔ اور اب وہ آخری کھیپ لینے کے لیے آڑھتی کی دکان میں داخل ہو رہے تھے۔

ارے...... کیا نام ہے تمہارا...... سیٹھ صادق نے ارشاد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کو ارشاد حسین کا نام یاد نہ ہو۔ یا وہ اس کے نام سے بالکل ناواقف ہو۔ یہ تو اس کا تکیہ کلام تھا۔ گفتگو کے دوران وہ بار بار اس فقرے کا استعمال کرتا تھا۔ اور کوئی بھی سننے والا اسکے اس سوال کے جواب میں اپنا نام نہیں بتاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سیٹھ صادق حسین کو فی الحقیقت اس کا نام جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کا نام بخوبی جانتا ہے۔ وہ...... تم جہاں رہتے ہو نا، تمہارے علاقے کا ایک بہت بڑا بدمعاش تھا شیدا...... جانتے تھے اس کو۔

ہمارا بدمعاشوں سے کیا تعلق سیٹھ۔ ارشاد نے ہنس کر کہا۔ ہم بھلا اس کو کیا جانیں۔ ہاں اس کا نام البتہ سنا ہے کہ علاقے کا شاید سب سے بڑا بدمعاش ہے۔

ہاں...... ہاں...... وہی...... وہی...... میرا مطلب ہے کیا نام ہے تمہارا۔ تمہارے علاقے کا بہت بڑا بدمعاش تھا وہ...... اس کو کسی نے قتل کر ڈالا۔

اچھا...... ارشاد نے کسی بھی قسم کی دلچسپی کا اظہار کئے بغیر کہا۔ کیا کسی دشمن نے مار دیا۔

اب یہ تو پولیس پتا لگائے گی کہ کس نے مار دیا...... سیٹھ صادق حسین نے کہا۔ وہ اکیلا نہیں مارا گیا ہے۔ اس کے اور ساتھی بھی مارے گئے ہیں جو اس کے ساتھ ہی اڈے پر رہتے تھے۔

بدمعاشوں کا تو ایک نہ ایک دن یہی حشر ہوتا ہے جی...... دکان میں موجود ایک اور آدمی نے کہا۔ یا تو وہ کسی نہ کسی دن پولیس کی گولیوں کا شکار ہو کر کتے کی موت مارے جاتے ہیں۔ اور یا پھر کسی دوسرے بدمعاش کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔

ہاں جی...... ان سالوں کا یہی حشر ہوتا ہے، ایک دن کیا نام ہے تمہارا۔ سیٹھ صادق حسین نے کہا۔ شیدا تو علاقے کے بہت سے دکانداروں اور کاروباری لوگوں وغیرہ سے وصول کرتا تھا۔ لاکھوں روپے ماہانہ کی آمدنی تھی اس کی، کیا نام ہے تمہارا۔ اور اڈے پر جو بدمعاشی کے کاروبار تھے اس کی کمائی الگ تھی۔

اب اوپر جا کر کمائی کرے گا۔ دکان میں موجود دوسرے شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔ سب کھایا پیا ایک ہی جھٹکے میں نکل گیا۔

مگر اس سے کیا حاصل ہوگا۔ کیا نام ہے تمہارا۔ سیٹھ صادق حسین نے کہا۔ ایک شیدا مر گیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ اس کی جگہ کوئی اور شیدا آن موجود ہوگا۔ جہاں سے شیدے نے اپنا کام چھوڑا ہے، وہاں سے وہ اپنا کام شروع کر دے گا۔ یہ سب کچھ اسی طرح چلتا رہے گا۔ جب تک پولیس مجرموں کے ساتھ ملی رہے گی، تب تک مجرم عیش کرتے رہیں گے۔

عیش بھی کرتے رہیں گے اور کتے کی موت مارے بھی جاتے رہیں گے۔

دوسرے آدمی نے کہا۔ ایک نہ ایک دن تو یہی انجام ہونا ہے ان کا۔

ارشاد اور رحمت علی بڑے غور سے اس گفتگو کو سن رہے تھے اگرچہ اس بات چیت کا ایک ایک لفظ ان کے دل و دماغ میں محفوظ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ ایسا ظاہر کر رہے تھے جیسے انہیں اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور واقعی، تھا بھی ایسا ہی۔ منڈی میں کام کرنے والے دو غریب مزدوروں کو بھلا کسی نامی گرامی

بدمعاش اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی واردات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں وہاں سے واپس چلے آئے۔ جب تک انہیں مکمل کر تنہائی میسر نہیں آ گئی ،انہوں نے اس معاملے کے بارے میں آپس میں کوئی رائے زنی نہیں کی۔ خبر پھیل چکی ہے...... تنہائی ملتے ہی ارشاد نے رحمت علی سے سرگوشی میں کہا۔ تینوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔

بھلا بچنے کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔ رحمت علی نے سرگوشی میں جواب دیا۔ جو حالت ہوئی تھی ان کی ،اس کے بعد بھلا وہ کیسے بچ سکتے تھے۔

ان دونوں نے معمول کے مطابق سارا دن منڈی میں کام کیا۔ اور وہاں اپنی موجودگی کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کروایا۔

شام کو جب وہ دونوں معمول کے مطابق گھر واپس آئے تو انہوں نے عبدالرحمٰن کو بے چینی کے عالم میں اپنا منتظر پایا۔

کچھ سنا تم نے۔ عبدالرحمٰن نے ان کے کمرے میں آ کر سرگوشی میں کہا۔ اس کی بیوی حسنہ بھی اس کے ساتھ آئی تھی۔ شیدے اور اس کے دونوں ساتھیوں کو کسی نے قتل کر ڈالا۔

ارے۔ ان دونوں کی زبان سے سخت حیرت کے عالم میں ایک ساتھ یہ الفاظ ادا ہوئے۔

کیسے۔ کب۔ رحمت علی نے جلدی جلدی کہا۔ کیا کسی سے کوئی جھگڑا ہو گیا تھا ان لوگوں کا۔

کچھ پتا نہیں۔ عبدالرحمٰن نے ہیجانی انداز میں کہا۔ رات کو کوئی ان کے گھر میں گھس کر ان کو قتل کر کے چلا گیا۔

عبدالرحمٰن نے ان دونوں کو اس واقعے کی معلوم تفصیلات بتائیں۔

احمد دودھ والا، روزانہ کی طرح اس صبح کو بھی اپنے مقررہ وقت پر شیدے کے دروازے پر پہنچا۔ اور اس نے دروازے کی بیل بجائی۔ دروازے میں کال بیل لگی ہوئی تھی۔ کچھ دیر گزر جانے کے بعد، احمد نے دوبارہ بیل بجائی۔ کیونکہ کوئی نکل کر نہیں آیا تھا۔ اس بار بھی کافی دیر ہو گئی۔ اور کسی نے جواب نہیں دیا۔ احمد دودھ والے کے لیے یہ قدرے حیرت انگیز بات تھی۔ کیونکہ اسے کبھی بھی اتنی دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ کوئی نہ کوئی دروازہ کھولنے اور دودھ لینے کے لیے آ ہی جاتا تھا۔ لیکن آج کوئی نہیں آ رہا تھا۔

بیل خراب بھی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بیل بجنے کی ہلکی سی آواز کو باہر سے سن سکتا تھا۔ باہر موجود شخص کو معلوم ہو جاتا تھا کہ اندر بیل بج رہی ہے۔ اس نے بار بار بیل بجائی۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

اس نے آہستہ سے دروازے پر ہاتھ مارا اور اس کے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ بہ آسانی کھل گیا۔

گھر کے اندر بہت گہرا سناٹا تھا۔

احمد دودھ والا گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ اس نے کھلے ہوئے دروازے سے گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد، پڑوس کے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔

اس مکان میں عدالت کا ایک ریٹائرڈ پیش کار رہتا تھا جس کا نام صابر علی تھا۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ شیدے کا تنخواہ دار ہے، اور کئی پولیس والوں ،وکیلوں اور عدالتی حکام وغیرہ کے ساتھ شیدے کے خفیہ روابط میں مدد کرتا ہے۔ اور شیدے کو مفید مشورے بھی فراہم کرتا ہے۔

احمد دودھ والا بھی اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ ریٹائرڈ پیش کار صابر علی سے شیدے کے خاص تعلقات ہیں۔ اور پوری گلی میں صرف صابر علی ہی ایک ایسا شخص ہے جو شیدے کے معاملات سے کوئی سروکار رکھ سکتا ہے۔

اس نے صابر علی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا ذرا دیر کے

بعد صابر علی خود باہر نکل کر آیا وہ صرف تہبند اور بنیان میں ملبوس تھا۔ وہ احمد دودھ والے کو اپنے دروازے پر دیکھ کر قدرے متعجب ہوا۔ کیونکہ وہ احمد سے دودھ نہیں لیتا تھا۔ اس کے گھر تو ایک دوسری دکان سے دودھ آتا تھا۔

صابر بھائی۔ احمد ...... دودھ والے نے کہا۔ آج معلوم نہیں کیا بات ہے، شیدے کے گھر سے کوئی نکل کر نہیں آیا۔ اور دروازہ بھی اندر سے کھلا ہوا ہے۔

اچھا۔ صابر علی نے حیرت سے کہا۔ اس کے لہجے میں تشویش کا عنصر بھی شامل تھا۔ دروازہ اندر سے کھلا ہوا ہے۔ اور کوئی نکل کر نہیں آیا۔

ہاں صابر بھائی ...... احمد نے کہا۔ میں گھنٹیاں بجا بجا کر تھک گیا...... خدا معلوم کیا بات ہے ...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔

اچھا...... چلو دیکھتے ہیں۔ صابر علی نے کہا اور واپس گھر کے اندر چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد وہ کرتا پہن کر دوبارہ گھر سے باہر آیا۔

وہ دونوں شیدے کے مکان کے دروازے پر پہنچے جو کہ کھلا ہوا تھا۔ صابر علی بھی اندر داخل نہیں ہوا، بلکہ اس نے کھلے ہوئے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اندر گہرے سناٹے اور ویرانی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

صابر علی نے گھنٹی بجائی، اور کئی بار بجائی اندر گھنٹی بجنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ لیکن کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔

اسی وقت فخر الدین اس طرف سے گزرا۔ فخر الدین چند مکانات پیچھے رہتا تھا اور کسی پرائیویٹ دفتر میں کام کرتا تھا۔ پڑھا لکھا آدمی تھا۔

ارے بھائی فخر الدین صاحب۔ صابر علی نے اس کو روکتے ہوئے کہا۔ یہاں ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔

کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ فخر الدین نے رکتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

شیدے کے گھر کے اندر سے دستک کا کوئی جواب نہیں آ رہا ہے اور دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔ پہلے کافی دیر تک احمد گھنٹیاں بجاتا رہا۔ پھر میں نے بھی گھنٹیاں بجائیں ،لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

پھر...... فخر الدین نے خشک انداز میں کہا۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ صابر علی نے کہا۔ ہم دونوں چل کر دیکھیں کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

نہیں جناب ...... فخر الدین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میں کسی کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں داخل ہونا غلط سمجھتا ہوں۔

لیکن ...... صابر علی نے جلدی سے کہا۔ یہ کوئی ...... کوئی تشویش ناک صورت حال بھی تو ہو سکتی ہے۔

یقیناً ہو سکتی ہے ...... فخر الدین نے کہا۔ اور اس کا حل میری نظر میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ آپ اس کی اطلاع پولیس کو دے دیجئے۔ پولیس والے خود ہی آ کر دیکھ لیں گے۔

وہ تو میں دوں گا۔ صابر علی نے جلدی سے کہا۔ لیکن اگر اس سے پہلے ذرا ہم لوگ۔

نہیں جناب ...... فخر الدین نے کہا۔ میں اس معاملے میں نہیں پڑوں گا۔ آپ اگر خود اندر جانا چاہتے ہیں تو ضرور جائیے۔ لیکن میں نہیں جاؤں گا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

صابر علی نے اسے زیر لب ایک موٹی سی گالی دی۔

اچھا جی میں تو چلا ...... احمد دودھ والے نے صورت حال کی سنگینی کو اچانک سمجھتے ہوئے کہا۔ ابھی تو سارا کام پڑا ہے۔ بہت سے گھروں میں دودھ پہنچانا ہے۔ گاہک انتظار کر رہے ہوں گے۔

اور اس کے ساتھ ہی وہ صابر علی کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے سائیکل پر سوار ہو گیا۔ صابر علی اس کو آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔

صابر علی نے تنہا مکان کے اندر نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس

کے بجائے وہ سیدھا تھانے چلا گیا۔ اور اس نے وہاں جا کر اس عجیب وغریب واقعہ کی اطلاع دے دی۔ تھانے میں تو اس کو تقریباً سبھی لوگ جانتے پہچانتے تھے۔ ایس ایچ او نے ایک اے ایس آئی اور چند سپاہیوں کو اس کے ساتھ کر دیا۔

جس وقت یہ لوگ شیدے کے دروازے پر پہنچے۔ اس وقت تک تقریباً وہاں گلی میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ شیدے کے گھر سے کوئی جواب نہیں آ رہا ہے۔ احمد دودھ والا، جہاں جہاں بھی دودھ لے کر گیا، وہ دودھ کے ساتھ ساتھ اس خبر کو بھی تقسیم کرتا گیا۔ لوگوں نے اس خبر کو سنا، لیکن کسی نے بھی شیدے کے گھر کے اندر قدم نہیں رکھا۔

جب پولیس وہاں پہنچی تو بہت سارے لوگ اپنے گھروں کے دروازوں کے آگے کھڑے ہوئے تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی شیدے کے گھر کے اندر نہیں گیا تھا۔

پولیس نے صابر علی کے علاوہ محلے کے چند اور معتبرین کو اپنے ساتھ لے لیا اور پھر یہ لوگ شیدے کے مکان کے اندر داخل ہوئے۔ سب سے پہلے یہ لوگ شیدے کے کمرے میں داخل ہوئے۔

یہاں ایک ناقابل یقین اور ہولناک منظر ان کا منتظر تھا۔

شیدے کی خون آلود لاش اس کے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی گردن کٹی پھٹی تھی۔ اور اس میں سے بہنے والا خون، ڈھیروں خون، آس پاس پھیل کر جم گیا تھا۔ اور اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ہلاکت کو کافی وقت گزر چکا ہے۔ گردن کے کٹے پھٹے سوراخوں میں سے کچھ خون اب بھی نکل رہا تھا۔

اف میرے خدا...... صابر علی بدحواس ہو کر چیخا...... اسے تو کسی نے مار دیا...... تبھی کوئی دروازے پر نہیں آ رہا تھا۔

مرنے والے دروازے پر نہیں آیا کرتے صابر علی۔ ایک پولیس والے نے لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

دوسرے کمرے کو بھی دیکھو۔ صابر علی نے لرزتے ہوئے کہا۔ زبیر اور صدیق دوسرے کمرے میں سوتے تھے۔

وہ سب لوگ دوسرے کمرے میں پہنچے صابر علی اس گھر کی ایک ایک چیز سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ زبیر اور صدیق کون سے کمرے میں سوتے ہیں۔

اس کمرے کا منظر پہلے والے کمرے سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔

یہاں ایک کے بجائے دو لاشیں تھیں۔ اور ان دونوں کے بھی گلے کٹے ہوئے تھے۔

یہ لاشیں زبیر اور صدیق کی تھیں۔ وہ دونوں مر چکے تھے...... شیدے کی طرح ان کو بھی کسی نے قتل کر ڈالا تھا۔

صاف ڈکیتی اور لوٹ مار کا کیس معلوم ہوتا ہے۔ ایک پولیس والے نے دونوں کمروں کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈاکو اور لٹیرے سارا مال لوٹ کر لے گئے ہیں۔ خدا جانے کیا کیا لے گئے ہیں۔ اب تو کوئی بتانے والا بھی موجود نہیں ہے۔

صابر علی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پولیس والوں کے ساتھ اندر آنے والوں میں محلے کے ایک شخص نعیم اللہ نے ایک لمبی اور گہری سانس لی، اور پھر آہستہ سے بڑے درد بھرے لہجے میں بولا، ایسے کاموں کے انجام بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

صابر علی نے سرد اور خشک نظروں سے اس کی طرف دیکھا، لیکن کہا کچھ نہیں۔

محلے میں تین افراد کے قتل کی خبر سے ایک سنسنی پھیل گئی تھی۔ خبر تو فوراً ہی پھیل گئی۔ اور بہت سارے لوگ شیدے کے دروازے پر اور اس کے قریب آ کر جمع ہو گئے۔

پولیس والوں نے اپنی تفتیش شروع کر دی۔ تھانے اطلاع بھیج دی گئی تھی اور پولیس کی مزید نفری اور ایک تحقیقاتی ٹیم آن پہنچی تھی۔ گلی میں پولیس کی کئی کئی

...لیں نظر آ رہی تھیں۔

...لے کے بہت سارے لوگوں سے، اور خاص طور سے ...یوں سے پوچھ گچھ ہوئی، لیکن کوئی بھی شخص اس سلسلے ...کوئی روشنی نہیں ڈال سکا۔

...بدالرحمن نے اپنی تفصیلی گفتگو ختم کی تو ارشاد نے اس ...سوال کیا۔ تم سے تو کسی نے کچھ نہیں پوچھا چاچا۔

...ھو سے۔ عبدالرحمن نے جلدی سے کہا۔ نہیں...... مجھ ...تو کسی نے کچھ نہیں پوچھا اور مجھ سے کیوں پوچھیں ...۔ میرا مکان تو وہاں سے کافی دور ہے۔

...ات مکان کی نہیں ہے چاچا۔ ارشاد نے سرگوشی میں ...۔ پولیس والوں کو تو یہ بات ضرور ہی معلوم ہو گی کہ ...رہ کو شیدے نے ہی اغوا کروایا تھا، اور اس نے اس ...رہائی کے عوض تم سے رقم لی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس ...ے تم سے پوچھ گچھ کریں، تو تم سچائی سے کام لینا۔ اگر ...و سے اس بات کا حوالہ دیں کہ تمہاری بیٹی کو شیدے ...اغوا کیا تھا۔ اور تم نے اس کی رہائی کے عوض شیدے ...رقم دی تھی، تو انکار نہ کرنا۔ ایک بار سچ بول دینے سے ...ی ہزار بار جھوٹ بولنے سے بچ جاتا ہے۔

...اں۔ تمہاری یہ بات تو صحیح ہے۔ عبدالرحمن نے کہا۔ ...... ایسا نہ ہو کہ پولیس والے شک کریں۔

...لیس والے اس صورت میں زیادہ تنگ کر سکتے ہیں ...ان کو غلط بتایا جائے۔ ارشاد نے کہا۔ معلوم تو ان کو ...کچھ ہے۔ اور اس رقم میں سے، جو کہ شیدے نے تم ...وصول کی تھی، پولیس والوں کا حصہ بھی لازماً ہو گا۔ ...لئے اگر وہ لوگ اس سلسلے میں خود سے بات چھیڑیں ...انکار مت کرنا...... صاف صاف بتا دینا کہ شیدے ...م کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے پولیس کو درمیان میں ...نے کی کوشش کی یا کسی اور سے اس بات کا ذکر کیا، تو ...ری بیٹی کو جان سے مار دیا جائے گا۔

...ں ٹھیک ہے۔ عبدالرحمن نے کہا۔ اور یہ سب کچھ سچ ...۔ اس میں غلط بات تو کوئی بھی نہیں۔

اس لئے تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے چاچا۔ رحمت علی نے بھی اس کی ہمت بندھائی۔ سچ بتا دینا تو سب سے زیادہ اچھی بات ہے۔

مجھے تو ان تینوں کے مارے جانے کی بہت ہی خوشی ہوئی ہے۔ حسنہ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ بہت ہی اچھا ہوا، تینوں مارے گئے کتے کی موت ...... ڈاکوؤں اور قاتلوں کو دوسرے ڈاکوؤں اور قاتلوں نے لوٹ لیا۔ بہت ہی اچھا ہوا۔

لیکن یہ دوسرے ڈاکو اور قاتل تھے کون۔ عبدالرحمن نے گویا اپنے آپ سے سوال کیا۔

کوئی بھی ہو سکتے ہیں چاچا۔ رحمت علی نے کہا۔ بدمعاشوں کی کون سی کمی ہے۔ سارا شہر بلکہ سارا ملک بدمعاشوں سے بھرا پڑا ہے۔

اور بدمعاشوں کو تو بدمعاش ہی مارتے ہیں۔ ارشاد نے کہا۔ وہ کہتے ہیں نا چاچا، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔

ہاں۔ حسنہ جلدی سے بولی۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ ان بدمعاشوں سے کوئی بدمعاش ہی نمٹ سکتا تھا۔

رات گزر گئی اور کوئی خاص بات رونما نہیں ہوئی۔ عبد الرحمن سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے کوئی نہیں آیا اور نہ ہی اس کو تھانے بلوایا گیا۔ اور ان دونوں سے تو کسی تفتیش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

انہوں نے شیدے اور اس کے دونوں ساتھیوں کو ٹھکانے لگا کر بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیتا تھا۔ اور وہ اپنی اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ انہوں نے ایک بہت اچھی ابتدا کی ہے۔

انہوں نے اس شہر میں رہ کر بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔ جو کچھ وہ سیکھنا اور جاننا چاہتے تھے۔ وہ انہوں نے سیکھ اور جان لیا تھا۔ اور صرف سیکھا اور جانا ہی نہیں تھا۔ اس کا عملی استعمال بھی کر کے دیکھ لیا تھا۔

انہیں اب لاہور میں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور نہ ہی منڈی میں بوجھ ڈھونے کا بے حد مشقت طلب کام

کرنے کی ضرورت تھی۔ پیسے تو ان کے پاس پہلے بھی اچھے خاصے تھے، لیکن اب تو ان کے پاس لوٹ کا مال بہت بڑی مقدار میں موجود تھا۔ انہوں نے تو بڑے بڑے نوٹوں کی ان گڈیوں کو گنا ہی نہیں تھا جو انہوں نے شیدے کے گھر سے لوٹی تھیں۔ تاہم، ان کا اندازہ تھا کہ وہ رقم لاکھوں روپے پر مشتمل تھی۔

لیکن وہ اس واردات کے فوری بعد یہاں سے نہیں جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس بارے میں پہلے ہی سوچ لیا تھا اور فیصلہ کرلیا تھا انہیں اس گھر سے فوری طور پر رخصت ہوکر اپنے آپ کو مشتبہ نہیں بنانا تھا۔ اور عبد الرحمن کو مشکل میں نہیں ڈالنا تھا۔

تینوں بدمعاشوں کے قتل کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران پولیس بڑے پیمانے پر تفتیش کررہی تھی۔ اور اس نے شبے میں بہت سے دوسرے بدمعاشوں کو گرفتار کرلیا تھا اور ان سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر اصل قاتل نہ تو اب تک گرفتار ہوسکے تھے اور نہ ہی کسی نے ان کی نشاندہی کی تھی۔ وہیں کے جاسوس بدمعاشوں کے دوسرے گروہوں کے اندر قاتلوں کو تلاش کررہے تھے۔ لیکن انہیں کچھ نہیں مل سکا تھا۔

اب ہم یہاں بس ایک ہفتے تک اور رہیں گے، اور اس کے بعد یہاں سے چل پڑیں گے۔ اس شام ارشاد نے رحمت علی سے کہا۔ اب کام شروع ہوچکا ہے۔ ہم نے آغاز تو کردیا ہے، اب اس کو انجام تک پہنچانا ہے۔

ہاں ارشاد۔ رحمت علی نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ ابھی تو ہمیں بہت سارے کام کرنے ہیں۔

بس ذرا یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے۔ ارشاد نے کہا۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ عبد الرحمن کو کوئی مشکل درپیش نہ آئے۔ وہ اگر کسی مشکل میں پھنستا تو پھر اس کی مدد کرنے والا یہاں کوئی نہیں ہوگا۔

بیشک۔ رحمت علی نے کہا۔ اور ہم اس کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لئے کچھ دن تو رکنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے ایک ہفتے سے زائد بھی رکنا پڑے۔

ہاں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے...... ارشاد نے کہا۔ شاید اس سے بھی زیادہ وقت لگ جائے۔

آنے والے دنوں میں ان کے معمولات میں رتی برابر کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح منڈی میں جاکر کام کرتے رہے۔ اس دوران پولیس شیدے کے قاتلوں کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتی رہی۔ جن چند بدمعاشوں کو شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کو جلد ہی عدم ثبوت کی بنا پر رہا کردیا گیا۔

پولیس والوں نے محلے کے جن لوگوں سے اس سلسلے میں تفتیش اور باز پرس کی ان میں عبد الرحمن شامل نہیں تھا۔ پولیس والے عبد الرحمن کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ایک سیدھا ایماندار غریب سرکاری ملازم ہے اور اس کا نہ تو بدمعاشوں کے کسی گروہ سے تعلق ہے۔ اور نہ ہی وہ اس قسم کا آدمی ہے کہ قتل و غارت گری اور بدمعاشی کے دھندوں میں ملوث ہو۔ اس لیے پولیس نے اس سے پوچھ گچھ کو تضیع اوقات سمجھا۔

پولیس والوں نے جمشید سے بھی کوئی پوچھ گچھ نہیں کی، جس کے اغوا شدہ بیٹے فرقان کو شیدے نے تاوان نہ ملنے کے باعث ہلاک کرڈالا تھا۔ ارشاد اور رحمت علی کو اس بات کا علم تھا کہ پولیس والوں کو فرقان کے قتل کی حقیقت کا اچھی طرح علم ہے، اور وہ جانتے ہیں کہ فرقان کو اغوا کرانے والا، اور تاوان کی عدم ادائیگی کی صورت میں اس کو قتل کروانے والا شیدا ہی تھا۔ لیکن وہ اس راز کو ظاہر نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جمشید کو بھی شامل تفتیش نہیں کیا۔

شیدے کے گھر کو پولیس نے لاک کردیا تھا۔ اور وہ لاک تھا۔ محلے والوں نے چند روز تک تو اس معاملے میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ بات پرانی ہوتی گئی۔ چونکہ معاملے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

اور کوئی نئے گوشے بے نقاب نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے لوگوں کی دلچسپی میں بھی کمی واقع ہوتی گئی تھی۔

قتل اور ڈکیتی کی اس واردات کو پندرہ دن گزر گئے...... عبد الرحمن سے کسی نے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔ ارشاد اور رحمت علی نے اب وہاں سے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

اب ہم دو ایک روز میں یہاں سے چلے جائیں گے چاچا۔ ارشاد نے اس شام کو عبد الرحمن سے کہا۔

ارے۔ کہاں۔ کیوں۔ عبد الرحمن نے سخت متعجب اور پریشان ہوکر پوچھا۔ تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو۔ کیا میرے گھر میں تمہیں کوئی تکلیف ہے۔

ہم گھر نہیں بدل رہے ہیں چاچا...... رحمت علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ بھلا تمہارے گھر میں کیا تکلیف ہوسکتی ہے۔ اور تمہارے گھر سے اچھا گھر ہمیں اور کہاں مل سکتا ہے۔ بات یہ ہے چاچا کہ ہم لوگ لاہور سے ہی جارہے ہیں۔ اس شہر سے جارہے ہیں۔

لاہور سے جارہے ہو۔ مگر کیوں۔ عبد الرحمن نے پوچھا۔

بات یہ ہے چاچا کہ یہاں منڈی کی خالی خولی مزدوری میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ ارشاد نے سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ زندگی گزر جائے گی اور بس۔ مزدوری ہی کرتے رہیں گے۔ کچھ نہیں ملے گا۔ کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں طرح طرح کا روزگار ہے۔ اور بہت روزگار ہے۔ کوئی ایسی لائن پکڑ لیں گے جس میں اچھی آمدنی کا امکان ہو، اور پھر اس کے بعد کوشش کریں گے کہ باہر نکل جائیں۔ ایک دفعہ اگر قسمت نے ساتھ دے دیا تو پھر سمجھو کہ وارے نیارے ہوجائیں گے۔

ہاں ...... یہ تو ہے۔ عبد الرحمن نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ جن لوگوں کو باہر جانے کا موقع مل گیا، انہوں نے وہاں جاکر بہت کمائی کی ہے اور خوب کمائی کررہے ہیں۔ مگر شرط یہی ہے کہ موقع مل جائے۔

ہاں چاچا۔ رحمت علی نے کہا۔ موقع ملنے کی ہی شرط ہے۔ اور ہم کوشش کریں گے کہ ہم کو موقع مل جائے۔

پھر مجھے تمہارے لئے رقم کا بھی بندوبست کرنا ہوگا۔ عبد الرحمن نے پرخیال انداز میں کہا۔ کب تک جانے کا ارادہ ہے تمہارا۔

بس یہی کوئی دو چار دن میں۔ ارشاد نے کہا۔

عبد الرحمن کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے آثار پیدا ہوئے۔ اتنی جلدی۔ بیٹا، میں اتنی جلدی رقم کا بندوبست کیسے کرپاؤں گا۔ مشکل ہوگی۔ مجھے تھوڑی مہلت دو دو۔

تم کون سی رقم کی بات کررہے ہو۔ چاچا۔ ارشاد نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

ارے...... اس رقم کی بات کررہا ہوں جو تم نے صابرہ کی رہائی کے لئے شیدے کو دینے کے لیے مجھے دی تھی۔ عبد الرحمن نے کہا۔ بھلا اور کون سی رقم کی بات کروں گا۔

تم اس رقم کو فی الحال بھول جاؤ چاچا۔ ارشاد نے کہا۔ ہم نے وہ رقم اپنی چھوٹی بہن کی مدد کے لئے دی تھی۔ اور ہم تم سے اس رقم کی واپسی کا کوئی تقاضا نہیں کررہے ہیں۔

ٹھیک ہے کہ تم تقاضا نہیں کررہے ہو۔ عبد الرحمن نے کہا۔ لیکن میرے اوپر تو تمہارا یہ قرض ہے اور مجھے بہر حال اسے ادا کرنا ہے۔

نہیں چاچا۔ ارشاد نے کہا۔ یہ رقم ہماری طرف سے اپنی بہن کی مدد کے لیے تھی۔ اور بہنوں کو دی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔

کیسی باتیں کرتے ہو ارشاد۔ اچانک عبد الرحمن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اتنی بڑی رقم ...... اگر تم کوئی امیر لوگ ہوتے تو بات پھر بھی سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن تم لوگ تو خود اتنے غریب ہو۔

کوئی بات نہیں چاچا۔ رحمت علی بولا۔ ہم غریب سہی۔ مگر یہ ہماری طرف سے اپنی بہن کے لیے ایک تحفہ ہے۔

یہ بہت بڑا تحفہ ہے...... عبد الرحمن نے دبے لفظوں میں کہا۔ میرے اندر اتنے بڑے تحفے کو قبول کرنے کی ہمت نہیں ہے۔

اس بات کو بھول جاؤ چاچا۔ ارشاد نے کہا۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ کرنے کے لیے اور بھی بہت سی باتیں ہوں گی۔ اور بھی بہت سے کام ہوں گے۔

گھر کے سب لوگوں کو اس خبر سے تکلیف پہنچی تھی کہ ارشاد اور رحمت علی اب لاہور چھوڑنے والے تھے۔

جانے سے پہلے انہیں بہت خاموشی کے ساتھ ایک کام اور بھی کرنا تھا...... اور وہ انہوں نے کرلیا۔ ان کے پاس اس کے لیے وسائل موجود تھے۔

اتنے عرصے تک لاہور میں رہنے کے باعث وہ اس شہر سے اچھی طرح، واقف ہوگئے تھے۔ اور یہاں کی زیر زمین دنیا کے بارے میں بھی بہت کچھ جان چکے تھے۔ انہوں نے یہ معلوم کرلیا تھا کہ انہیں آتشیں اسلحہ کہاں سے مل سکتا ہے۔

وہ دونوں اس شخص کے سامنے نہیں آئے۔ جس نے کافی قیمت لے کر ان کے لیے دو عدد اور جدید قسم کے ریوالوروں کا بندوبست کیا تھا جن کے ساتھ سائلنسر بھی تھے جنہیں بوقت ضرورت ان پر لگایا جاسکتا تھا۔

اس آدمی کے سامنے صرف ارشاد آیا تھا۔ اور وہ بھی حلیہ تبدیل کر کے۔ اس نے اس شخص سے جب بھی ملاقات کی، رات کے وقت ملاقات کی۔ اور اس کمال کا میک اپ کیا کہ کسی دیکھنے والے کو اس پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوسکتا تھا۔

ان کے پاس اب دو ریوالور تھے، جن کے ساتھ سائلنسر بھی تھے۔ ان کے علاوہ، گولیوں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ ان کے ساتھ تھا۔

وہ بہت ہوشیاری اور چوکسی کے ساتھ حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور شیدے اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے سلسلے میں پولیس جو کچھ کر رہی تھی۔ وہ اس سے واقف رہنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ تاحال پولیس کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اور مجرموں کا کوئی سراغ حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ خطرے سے باہر تھے۔

وہ دونوں عبدالرحمن کے گھر سے رخصت ہوئے، عبدالرحمن اس وقت ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ اور اس کی عدم موجودگی میں وہ گھر سے رخصت ہوگئے۔ اس جگہ پہنچے جہاں انہوں نے شیدے کے گھر سے لوٹا ہوا خزانہ چھپا کر رکھا تھا۔

انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اس درخت تک جا پہنچے جس کی کھوہ میں انہوں نے رسی سے باندھ کر رقم کا تھیلا لٹکایا تھا۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ تھیلا جوں کا توں اپنی جگہ پر موجود تھا۔ نہ تو کسی نے ان کو دیکھا تھا اور نہ کوئی اس کی موجودگی سے واقف ہوسکا تھا۔

انہوں نے درختوں کے اس کنج میں ایک محفوظ جگہ پر بیٹھ کر پہلے تو دوربین کی مدد سے دور دور تک کے علاقے کا جائزہ لیا۔ اور جب ان کو اس امر کا پورا یقین ہوگیا کہ دور دور تک کوئی انسان موجود نہیں ہے، تو پھر انہوں نے نوٹوں کو گننا شروع کیا۔

جس دن سے یہ نوٹ ان کے ہاتھ لگے تھے، اس دن سے آج تک انہوں نے ان کو گنا نہیں تھا۔ اس دن کے بعد سے تو انہوں نے ان نوٹوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ آج پہلی بار وہ ان کو دوبارہ دیکھ رہے تھے۔ اور پہلی بار ان کا شمار کر رہے تھے۔

شمار کرنے کا کام ارشاد کر رہا تھا اور رحمت علی دوربین ہاتھ میں لئے ہوئے دور دور تک نظریں دوڑا رہا تھا۔ وہ مسلسل یہ کام کر رہا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں تھا۔

ارشاد نے وہ سارے نوٹ گنے۔ اور اس میں اس کو کافی وقت بھی لگا۔ وہ کوئی پونے تین لاکھ روپے کی رقم تھی۔

ارشاد نے رحمت علی کو گنتی کے بارے میں بتایا۔

کافی بھاری رقم ہے۔ رحمت علی نے سرگوشی میں کہا۔ بہت کام آئے گی۔

اڈے میں شاید اور جگہوں پر بھی چھپی ہوئی رقم موجود

ہوگی۔ ارشاد نے کہا۔ لیکن ہمارے پاس اس کو تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا اور نہ ہی ہم کو رقم کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت تھی۔ جو کچھ مل گیا۔ وہی بہت زیادہ ہے۔

انہوں نے کپڑے کے اس تھیلے کو ایک پرانے سے چمڑے کے بیگ میں رکھ لیا۔ جس میں اور چیزوں کے علاوہ ان کے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور اور گولیاں بھی تھیں۔ ان سب چیزوں کو انہوں نے ان پرانے کپڑوں کی تہوں کے نیچے چھپایا تھا جنہیں انہوں نے اس بیگ میں بھر رکھا تھا۔ بیگ اگرچہ پرانا اور بوسیدہ تھا، لیکن تھا بہت مضبوط اور خالص چمڑے کا بنا ہوا۔ اس کی زپ بھی بہت مضبوط تھی۔

اس بیگ کو کوئی بھی شخص با آسانی کھول سکتا تھا۔ اس میں لاک کا کوئی نظام سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ ایسے پھٹیچر سے بیگ پر بھلا کس کی نظر پڑ سکتی تھی۔

انہیں اب ملتان جانا تھا...... لاہور میں ایک عرصہ گزار لینے، اور اپنے آپ کو آنے والے وقتوں کے لیے پوری طرح سے تیار کر لینے کے بعد۔ اب وہ ملتان کا رخ کر رہے تھے۔ جہاں ان کو کئی لوگوں سے حساب چکانا تھا۔ یہ ان لوگوں کے، اور کچھ دوسرے لوگوں کے حسابات چکانے ہی کی ضرورت تھی۔ جو انہیں ایک بار پھر ملتان کی طرف لے جا رہی تھی۔

وہ اس جگہ سے رقم لے کر روانہ ہوگئے۔ اور اب ان کا رخ ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا۔

وہ لاہور سے ملتان، بذریعہ ٹرین بھی بہ آسانی جاسکتے تھے اور بذریعہ بس بھی۔ بلکہ اب تو زیادہ تر لوگ بسوں کے ذریعے سفر کو ہی زیادہ آسان اور پرسہولت تصور کرتے ہیں۔

لیکن ان لوگوں نے بس کے بجائے ٹرین کا سفر کرنے کو ترجیح دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بسوں پر اکثر پولیس والے چھاپے مارا کرتے تھے۔ شہر سے باہر جانے والی بسوں پر چھاپے مارتے تھے۔ اور مسافروں کے سامان کی بھی تلاشی لی جاتی تھی۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ ہر ایک بس کی تلاشی لی جائے، کیونکہ یہ تو ناممکن تھا۔ البتہ اگر کوئی مخبری ہوجاتی تھی، یا کسی شخص کے بارے میں پتہ چل جاتا تھا کہ پولیس سے معاملہ کیئے بغیر کوئی شخص یا گروہ، کچھ ممنوعہ مال لے کر جا رہا ہے، یا ڈاکوؤں وغیرہ کی تلاش ہوتی تھی، تو اس صورت میں بس پر چھاپہ مارا جاسکتا تھا۔ گویا اس بات کا امکان بہرحال موجود تھا کہ بس پر چھاپہ مارا جاسکتا ہے۔ جب کہ ٹرین کے سفر میں ایسی کوئی صورت حال درپیش نہیں آتی تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے ریلوے اسٹیشن پہنچے اور انہوں نے ملتان کے ٹکٹ خرید لئے۔ وہ گاڑی کے آنے سے کافی پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ اور مسافروں کے ہجوم میں گھل مل گئے تھے۔

کچھ دیر بعد ٹرین آگئی اور وہ دونوں ایک ڈبے میں سوار ہوگئے۔ ان کے پاس اس ایک بوسیدہ لیکن مضبوط سے بیگ کے علاوہ، جس میں انہوں نے ہتھیار اور رقم رکھی ہوئی تھی۔ ایک بیگ اور تھا، جو اس بیگ سے بالکل مختلف تھا۔

انہوں نے دونوں بیگوں کو ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر الگ الگ رکھ دیا۔ ویسے تو یہ دونوں ہی کے لیے ضروری تھا کہ وہ رقم اور ہتھیاروں والے بیگ پر خاص طور سے نظر رکھیں، لیکن طے شدہ پروگرام کے تحت بنیادی طور پر یہ ذمہ داری رحمت علی کو سونپی گئی تھی کہ وہ اس بیگ پر باقاعدگی سے نظر رکھے جس میں رقم اور ہتھیار تھے۔ اور اگر کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا، یعنی کوئی تلاشی وغیرہ ہوتی، تو وہ دونوں اس بیگ کی ملکیت سے صاف انکار کردیتے۔

لیکن ملتان پہنچنے تک ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ نہ تو ڈبے میں کوئی تلاشی وغیرہ ہوئی۔ نہ ان کے لئے کوئی اور مسئلہ پیدا ہوا۔ وہ اپنے سامان کے ساتھ بخیریت ملتان پہنچ گئے۔

اب وہ ایک بار پھر ملتان میں تھے...... یہاں اس شہر میں ان کے جاننے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور انہیں اپنے آپ کو ان لوگوں سے بچانا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ کو بالکل پوشیدہ رکھیں۔

سب سے پہلے تو انہیں اپنی رہائش کا، اور اپنے بیش قیمت خزانے کی حفاظت کا بندوبست کرنا تھا۔ وہ اس ساری رقم کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اور ہتھیاروں کو تو خاص طور سے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ فوری طور پر خود کو کسی مشکل میں نہیں پھنسانا چاہتے تھے۔

ملتان میں بھلا کون سی ایسی جگہ تھی جس سے ارشاد واقف نہ ہو۔ وہ تو اس شہر کی رگ رگ کو پہچانتا تھا۔

اس نے تو ملتان آنے سے پہلے ہی مضافات میں واقع ایک پرانے کھنڈر کے بارے میں سوچ لیا تھا جہاں اس خزانے کو بہ آسانی اور بحفاظت چھپایا جا سکتا تھا۔ وہ جگہ رحمت علی کی بھی دیکھی ہوئی تھی۔ اور رحمت علی نے بھی اس سے کلی طور پر اتفاق کیا تھا۔

انہوں نے ملتان پہنچنے کے بعد ایک معمولی سے مسافر خانے میں قیام کیا۔ یہاں کمرے بھی دستیاب تھے۔ اور الگ الگ چارپائیاں بھی، جن پر بستر موجود ہوتے تھے۔ انہوں نے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ اس میں ٹھہر گئے۔

اگلے دن سہ پہر کو وہ دونوں مضافاتی علاقے میں واقع اس پرانے کھنڈر میں گئے جہاں انہیں اپنا خزانہ چھپانا تھا۔ خزانہ وہ اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔ جو اس وقت بیگ میں نہیں، بلکہ کپڑے کے ایک تھیلے میں تھا۔ یہ کافی بڑا تھیلا تھا۔ اور انہوں نے اس کو کئی تہوں میں موڑ لیا تھا۔

وہ سارا علاقہ ویرانی اور بربادی کی علامت تھا۔ ایک پرانے قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی چہار دیواری دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اندر ٹوٹی پھوٹی دھنسی ہوئی۔ قبروں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ نہ جانے کتنی صدیوں پرانا قبرستان تھا۔ اور یہاں آخری مردہ نہ جانے کتنے برس پہلے دفن کیا گیا تھا۔ ساری قبروں پر صدیوں کی کہنگی طاری تھی۔

ارشاد کی نظر میں وہ ٹوٹی ہوئی قبر تھی جو ایک گھنے درخت کے پیچھے واقع تھی۔ وہ ایک بار استاد حیدر علی کے گیراج کے ایک گاہک کے ساتھ ایک جنگلی بوٹی کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور وہ بوٹی ایک ایسی قبر کے دہانے پر ملی تھی جو اندر سے بالکل خالی تھی۔ وہاں سے ہڈیوں کا پنجر بھی شاید کوئی اٹھا کر لے گیا تھا۔ اور ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

ان دونوں نے دوربین سے دور دور تک کا اچھی طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ لیکن کوئی شخص موجود نہیں تھا۔

اطمینان سے کام کرلو۔ رحمت علی نے اپنی آنکھوں پر لگی ہوئی دوربین کو چاروں طرف گھماتے ہوئے کہا۔ کہیں کوئی موجود نہیں ہے۔

ٹھیک ہے۔ ارشاد نے کہا۔ میں نیچے اترتا ہوں۔ تم ذرا چاروں طرف پوری طرح نظر رکھنا۔

رحمت علی اپنا کام کرتا رہا۔ اور ارشاد نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر میں سے اینٹیں اٹھانی شروع کر دیں۔ اور ذرا دیر میں کافی اینٹیں اٹھا لیں۔

پھر اس نے تھیلے کو وہاں رکھ دیا اور اوپر سے دوبارہ اینٹیں رکھ دیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جگہ پہلے جیسی ہو گئی۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کا ایک ڈھیر تھا جس میں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ٹوٹی ہوئی اور دھنسی ہوئی بہت سی قبروں کے اندر ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ اور اس کے علاوہ بے شمار کچی قبریں تھیں جو دھنسی ہوئی تھیں اور بھیانک انداز میں منہ کھولے ہوئے گڑھوں کی شکل میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

بس اب ٹھیک ہے۔ رحمت علی نے ڈھیر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اب کچھ پتا نہیں چلے گا۔

ارشاد بھی اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ اس نے جگہ کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ اور اس کے بعد وہ باہر آ گیا۔

دونوں نے وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے ایک بار پھر اچھی طرح سے اطراف کا جائزہ لیا۔ اور پھر پوری طرح سے مطمئن ہو جانے کے بعد وہاں سے واپس چل پڑے۔

اس روز انہوں نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔ باقی سارا وقت وہ اپنے کمرے میں رہے اور آرام کرتے رہے۔ دن میں آرام کرنے کی تو ان کی عادت ہی چھوٹ گئی تھی۔ سارا دن منڈی میں کام کرتے کرتے، بوجھ ڈھوتے ڈھوتے، ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے تھے۔ ہفتے میں ایک دن کی بھی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ منڈی تو کبھی بند ہی نہیں ہوتی تھی۔ البتہ یہ تھا کہ وہ کبھی کبھار خود ہی ایک دن کی چھٹی کر لیتے تھے اور شہر میں ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے لئے نکل جاتے تھے۔

آج بہت دنوں کے بعد وہ بالکل فارغ اور بڑے آرام سے تھے۔ لیکن فی الحقیقت وہ آرام سے نہیں تھے۔ آنے والے وقت کا ہیجان، درپیش کاموں کا اضطراب ان کی نس نس میں موجیں مار رہا تھا۔

اگلے روز انہوں نے شام کے وقت اپنے حلیے میں محض معمولی سی تبدیلیاں کی تھیں۔ اور وہ یہ کہ ذرا بڑی بڑی مونچھیں لگائیں۔ اور اس کے بعد وہ اپنے چہروں کو چادروں سے اچھی طرح ڈھانپ کر مسافر خانے سے نکل گئے۔ کسی نے ان کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔

شام کے جھٹپٹے میں وہ ڈھلن کے مکان کے قریب موجود تھے۔

ڈھلن وہ پیشہ ور بدمعاش تھا جو کرائے کے قاتل کا کام کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سے خوفناک کام کرتا تھا۔

ڈھلن وہ شخص تھا جس نے ارشاد کے تایا شمشاد اور اس کے بیٹے زبیر کے ایما پر ملتان میں ارشاد اور رحمت علی کے گیراج میں آگ لگا دی تھی۔ جس میں ان کا تیسرا ساتھی قادر جل کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اور وہ دونوں کافی زخمی ہو گئے تھے۔ اور انہیں اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔ قادر ان کا عزیز ترین دوست، مر گیا تھا۔ اور انہیں اس کی موت کا بے حد قلق ہوا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا دیہاتی لڑکا تھا۔ جو ایک گاؤں سے روزگار کی تلاش میں ملتان آیا تھا۔ اور پھر یہیں رہنے لگا تھا۔ اس کا کبھی کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ نہ کسی سے اس کی دشمنی تھی۔ وہ اچھا خاصا استاد حیدر علی کے گیراج میں کام کر رہا تھا۔ جہاں سے وہ ارشاد اور رحمت علی کے ساتھ کام کرنے کے لیے ان کے گیراج میں آ گیا تھا۔ اور پھر ان ظالموں نے گیراج میں آگ لگا دی قادر جل کر مر گیا۔

قادر کی موت ان لوگوں پر قرض تھی۔ اور وہ اس قرض کو اتارنے کی غرض سے ہی ملتان آئے تھے۔ ملتان میں سب سے پہلے انہیں ڈھلن اور نواب علی سے نمٹنا تھا۔ یہی وہ دونوں آدمی تھے جنہوں نے ان کے گیراج میں آگ لگائی تھی اور انہیں جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو بچ گئے تھے۔ مگر بے چارہ قادر جل کر مر گیا تھا۔

وہ ڈھلن کے مکان کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ انہیں ڈھلن نظر آ گیا۔ وہ کہیں سے موٹر سائیکل پر آ رہا تھا۔ اسنے اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر موٹر سائیکل روکی۔ اور پھر دروازے کی گھنٹی بجانے لگا۔

دروازہ کھولنے والا ایک اجنبی شخص تھا۔ ڈھلن مکان کے اندر چلا گیا۔ اور دروازہ بند ہو گیا۔

انہوں نے ڈھلن کو دیکھ لیا تھا۔ ڈھلن زندہ تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے زندہ تھا۔

یہ مکان ان لوگوں کا اڈہ تھا۔ اس میں ڈھلن، نواب علی، اور اس گروہ کے دوسرے لوگ رہتے تھے۔ یہاں کوئی عورت یا بچے وغیرہ نہیں رہتے تھے۔ ڈھلن اور نواب علی۔ دونوں کے اصلی گھر ملتان سے باہر، مضافاتی گاؤں میں تھے۔ اور ان کے خاندان کے لوگ وہیں رہتے تھے۔ یہ دونوں، جن کے گروہ میں اور بھی کئی لوگ شامل تھے۔ ملتان شہر میں جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث

کرسکتا تھا۔ یہ لوگ ملتان کے علاوہ، شہر سے باہر بھی وارداتیں کرتے تھے۔ جہاں کہیں کا بھی کنٹریکٹ مل جاتا تھا۔ وہاں جاکر خاموشی سے اپنا کام کردیتے تھے۔

ارشاد اور رحمت علی کافی دیر تک اس علاقے میں موجود رہے۔ انہیں یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ ڈھلن زندہ ہے۔ اور ملتان میں ہی موجود ہے۔ اور اب نواب علی کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔

اس قسم کے پیشہ ور بدمعاشوں کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ارشاد نے آہستہ سے رحمت علی سے کہا۔ کبھی کسی مخالف گروہ کا آدمی ان کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ کبھی کسی اصلی یا نقلی پولیس مقابلے میں مارے جاسکتے ہیں۔ اگر کبھی لین دین کے معاملات میں پولیس والوں سے جھگڑا ہوجاتا ہے تو پولیس والے خود ہی ان کو مروادیتے ہیں۔

میں نواب علی کی زندگی کی دعا مانگتا ہوں...... رحمت علی نے آہستہ سے کہا۔

اس شخص کو زندہ ہونا چاہیے، ہمیں وہ مردہ نہیں، زندہ چاہیے۔

اسے زندہ ہونا چاہیے۔ ارشاد نے کہا۔ وہ ضرور زندہ ہوگا۔

وہ کافی دیر تک وہاں موجود رہے۔ اور آس پاس کی جگہوں کے چکر لگاتے رہے۔ لیکن انہیں نواب علی کہیں نظر نہیں آیا۔

زیادہ دیر تک اس مشتبہ انداز میں گھومنا ان کے لیے نقصان دہ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ وہاں سے واپس ہوئے، اور شہر میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔

نواب علی اکثر رات کو دولت خاں کے ہوٹل پر جاتا ہے۔ ارشاد نے آہستہ سے کہا۔ کبھی کبھار ڈھلن بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور وہاں ان ہی جیسے کچھ لوگوں کا مجمع ہوتا ہے۔

ہاں ...... ہاں ...... رحمت علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے، پرجوش لہجے میں کہا۔ مجھے یاد آیا۔ دولت خاں سے تو اس کی کافی دوستی ہے۔ ایک بار دولت خاں اپنی

آیا تھا تو نواب علی اس کے ساتھ میں تھا۔

چلو، اسی طرف چلتے ہیں...... ارشاد نے کہا۔ کم از کم ہم ایک بار اس کو دیکھ لیں اور اس بات کی تصدیق ہوجائے کہ وہ زندہ سلامت ہے اور شہر کے اندر موجود ہے...... پھر آگے کی سوچیں گے۔

وہ دونوں دولت خاں کے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے، اور کچھ دیر کے بعد وہاں پہنچ گئے۔ دولت خاں کا ہوٹل ویسے تو چائے اور کھانے کا ہوٹل تھا۔ لیکن اس میں خفیہ طور پر منشیات کا دھندہ بھی ہوتا تھا۔ اور ضرورت مند گاہکوں کو، جن کی تعداد خاص خاص لوگوں پر مشتمل تھی۔ منشیات فراہم کی جاتی تھیں۔ یہ سارا کاروبار ہوٹل کے ایک عقبی کمرے میں ہوتا تھا۔ جو سامنے سے نظر بھی نہیں آتا تھا۔ اس کمرے میں لوگ بیٹھ کر نشہ کرتے بھی تھے، اور یہاں سے منشیات لے کر بھی جاتے تھے۔ اس کمرے میں خاص خاص لوگوں کے علاوہ ہر شخص کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

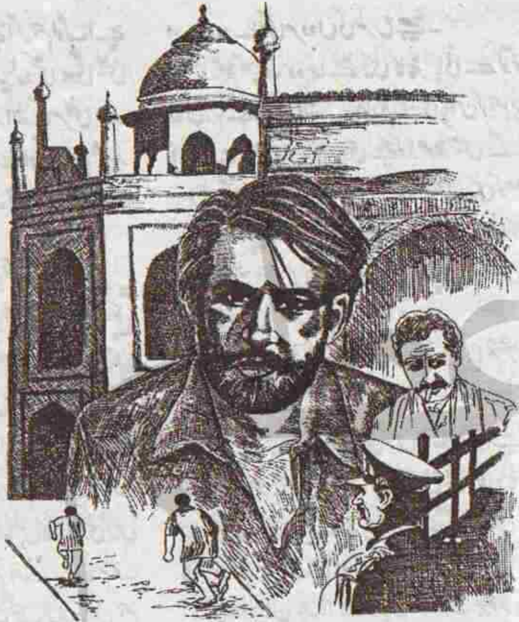
وہ دونوں ہوٹل کے اندر داخل ہوگئے۔ اور ایک نیم تاریک گوشے میں پڑی ہوئی الگ تھلگ سی میز کے گرد جاکر بیٹھ گئے۔ وہ ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں سے دروازے پر بھی نظر رکھ سکتے تھے۔

انہوں نے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔ ان میں انہیں نواب علی کا چہرہ نظر نہیں آیا۔

انہیں وہاں بیٹھے ہوئے ابھی بمشکل پانچ ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک ایک بالکل ہی غیر متوقع منظر ان کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا، اور وہ دونوں بیک وقت حیرت زدہ اور اس کے ساتھ ہی وہ فوراً چوکس بھی ہوگئے۔ ہوٹل کے دروازے میں سے نواب علی اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن نواب علی تنہا نہیں تھا۔

(جاری ہے)

☆☆☆



معبود صدیقی

انسان

معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کو ہم سے کیا کام لینا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے ہم سے کہ یہ درخت ہمارا سہارا بنا ہوا ہے اور ہم ابھی تک زندہ ہیں۔

اپنی زندگی پر دوسروں کی زندگی کو اہمیت دینے والے ایک نیک انسان کی کہانی

گنپت اور ذیشان درخت کی ایک ٹہنی پر بیٹھے دوسری ٹہنی کو ہاتھ سے پکڑے سوچ رہے تھے۔ پتا نہیں ہمارے گھروں کا کیا ہوا ہوگا۔ مکان بھی گر گیا ہوگا۔ ماں تو بڑھاپے کے سبب کمزور ہوگئی ہے۔ بیوی اور میرا بچہ۔ ''یا اللہ اپنا کرم فرما ان کی حفاظت کر سب تیرے امان میں رہیں۔'' طوفان کا ایک ریلا مکانوں کی دیواروں سے ٹکراتا ہے تو ان کو مسمار کرتا ہوا گھروں کا سارا سامان چارپائیوں بستروں کو ایسا اپنے سینے پر سجا کر لے جاتا ہے جیسے اپنی بیٹی یا بہن کا جہیز دکھاوے کے لیے لے جارہا ہے۔

''یار ذیشان میری تو ہمت جواب دے گئی۔ یار میں اب زیادہ دیر اس ٹہنی پر نہیں بیٹھ سکوں گا۔ کیا پتا پانی کا کوئی ایسا ریلا آئے جو اس درخت کو بہا کر لے جائے' اس طرح ہم اپنی جانیں بھی گنوا بیٹھیں گے اس سے پہلے ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔''

''کیا کریں گنپت؟ پانی کا بہاؤ بھی تیز ہے اور جوش بھی۔ سلامتی اسی میں ہے کہ اپنے اندر ہمت پیدا کرو اور اسی پر جمے رہو۔ باقی سب اللہ کی مرضی پر چھوڑ دو۔ وہی مارنے والا ہے وہی زندگی دینے والا بھی۔ چپ چاپ اللہ کو یاد کرتے رہو۔ شاید وہ کوئی کرشمہ دکھائے۔''

''یار ذیشان میری ماتا جی اور پتنی تو شاید اب اس دنیا میں نہیں ہوں گے؟ ہمارے مکان تو ویسے ہی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔'' اب میں اکیلا کیا کروں گا اس جیون کا؟ میں اس پانی میں کود رہا ہوں۔''

''نہیں گنپت تم ایسا کچھ نہ کرنا۔ دیکھو میں بھی تو ہوں تمہارے ساتھ۔'' میری امی میری بیوی اور بچے کے ساتھ گھر میں تھیں۔ اب پتا نہیں کیا ہوا ہوگا ان کے

ساتھ۔ ویسے بھی زندگی ایک بار ملتی ہے' اگر ہم لوگ اپنے آپ کو پانی کے حوالے کرتے ہیں تو یہ خودکشی ہوگی یعنی حرام موت' جو بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر اللہ کی مرضی سے پانی ہمیں بہا کر لے جائے تو یہ شہادت ہوگی۔ ہم شہید ہوں گے ہمارے سارے گناہ معاف ہم سیدھے جنت میں جائیں گے۔"

"ذیشان دیکھو کتنی اونچی اونچی چھلانگیں لگا رہا ہے یہ پانی اور کتنی طاقت ہے اس میں کہ اتنی بڑی بڑی پکی عمارتوں کو زمین پر پھیلا رہا ہے۔ یہ معمولی سا درخت کیا چیز ہے ذیشان؟ ڈرو مت ہمت سے کام لو۔ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کو ہم سے کیا کام لینا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے ہم سے کہ یہ درخت ہمارا سہارا بنا ہوا ہے اور ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ ورنہ ہمارا یہ سہارا ایک چھوٹا سا گھانس کا تنکا بھی نہیں اس طوفان کی مستی کے آگے۔ بس تم ہمت سے کام لو۔ سمجھو خدا کی مرضی یہی ہے جو اب تک زندہ ہیں ہم دونوں۔ ویسے بھی موت کا وقت اور جگہ مقرر ہوتی ہے جب تک وقت نہ آئے گا ہم مریں گے نہیں۔ مایوس نہ ہونا گنپت' مایوسی گناہ ہے بہت بڑا پاپ ہے۔"

میرے خیال میں لاکھوں لوگوں نے اپنی زندگیاں اس طوفان کی نذر کی ہوں گی۔ سامنے درخت پر دو ننھی ننھی جانیں لٹک رہی ہیں۔ ساڑیاں' دوپٹے' پگڑیاں درختوں پر یا پھر ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ ہم سے محبت کرنے والو دیکھو ہم تمہارے غم میں کیسے بھٹک رہے ہیں کیسے بلک رہے ہیں۔ کاش ہم تمہارے جسموں کو ڈھانپ سکتے۔ ہم تمہارے سروں سے نہ اترتے۔ کیسا ظالم ہے یہ دشمن کتنا بے رحم ہے یہ۔ اس نے ماؤں کی گود سے ان کے بچے چھینے' اس نے بڑے بڑے بزرگوں کی پگڑیاں ہوا میں اچھال دیں۔ اس نے سہاگنوں کی مانگ سے سیندور دھو ڈالا۔ سہاگنوں کو ابھاگن کر دیا۔ گھروں اور بستیوں کو اجاڑ دیا۔ اچھا ہوا تم سب کو طوفان اپنے ساتھ لے گیا' ورنہ تم کس کس کا غم سہتے' تم کیا کیا برداشت کرتے۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی مردوں کی طرح جیتے۔

"دیکھو گنپت وہ سامنے ہیلی کاپٹر پانی سے لوگوں کو نکال رہا ہے۔ شاید اللہ نے ہماری سن لی یا اس کو ہم پر ترس آ گیا ہے۔ اپنی ماں اور بیوی بچے کو ڈھونڈ سکیں گے۔ دیکھو گنپت ہیلی کاپٹر رسی پھینکے تو تم اس رسی کو مضبوطی سے پکڑنا' اپنی آنکھیں بند رکھنا اور جب تک رضاکار تم کو رسی سے نہ اتاریں رسی نہ چھوڑنا اپنے بھگوانوں کو یاد کرتے رہنا۔"

"ذیشان یہ سب تم مجھے سمجھا رہے ہو۔ کیا تم نہیں چلو گے میرے ساتھ؟"

"کیوں نہیں۔ گنپت کیوں نہیں۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دیکھو ہیلی کاپٹر ایک ایک آدمی ہی اٹھا رہا ہے' تم زیادہ تھک گئے ہو اس لیے پہلے تم جاؤ گے بعد میں میں۔ پھر ہم دونوں مل کر ماں' بیوی اور بچے کو تلاش کریں گے۔"

"بچنا ذیشان بچنا!! دیکھو پانی کا بہت بڑا ریلا آ رہا ہے۔ مضبوطی سے پکڑنا درخت کو۔" دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی چادر سی اچھلی اور ذیشان والی شاخ پر ایک لڑکی اٹک گئی۔ اس کا پیٹ ابھرا ہوا تھا۔ شاید پیٹ میں پانی بھر گیا ہے۔ جب ہی تو مر گئی ہے ذیشان۔ نہیں مری نہیں ابھی زندہ میرے ہاتھ پر اس کی سانس لگ رہی ہے اس کو کسی طرح بچائیں۔ ذیشان نے بڑی مشکل سے ٹہنی پر اپنے پاؤں جمائے اور کھسکتا ہوا لڑکی کے قریب پہنچ کر اس کی ناک کے قریب ہاتھ کیا۔ سانس چل رہی ہے پھر اس نے اپنا کان اس کے پیٹ سے لگا کر سنا۔

"نہیں گنپت نہیں اس کے پیٹ میں پانی نہیں بچہ ہے!!"

"ہے بھگوان اب کیا کیا جائے؟ دو زندگیاں جائیں گی کیا؟"

اس کو کس طرح بچایا جائے ذیشان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بے بس ذیشان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "اے اللہ تو ہی بچانے والا ہے' کوئی کرشمہ دکھا اپنی

قدرت کا میرے مولا۔"

پانی کا ایک زوردار ریلا آیا اور اس قدر شور سے اچھلا کہ گنپت کی آواز بھی اس شور میں دب گئی جو اپنے بھگوانوں کو زور زور سے پکار رہا تھا۔ اس اچھال سے یہ ہوا کہ ایک تختہ ان کے اوپر والی شاخ میں پھنس گیا۔

"اس تختہ کو کسی طرح پکڑا جائے کہ یہ نیچے نہ گرے بلکہ ہمارے ہاتھوں میں آئے۔ ذیشان! میں آہستہ آہستہ اس شاخ کو ہلاتا ہوں جب یہ کھسک کر تمہارے پاس آئے تو تم پکڑ لینا۔ بہت کام آئے گا یہ۔"

"ٹھیک ہے گنپت۔ بہت احتیاط سے کوشش کرنا ایسا نہ ہو کہ ہماری ساری امیدوں پر پانی پھر جائے۔ ایسا لگتا ہے یہ ہماری آخری امید ہے رائیگاں نہیں جانا چاہیے۔"

"بھگوان کی اچھا ہوگی تو ہم ضرور کامیاب ہو جائیں گے ذیشان۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ تختہ تمہارے قریب پہنچے۔ سنبھالنا تمہارا کام ہے اپنے آپ کو بھی اور تختے کو بھی۔"

تختہ ہلکے ہلکے کھسکنے لگا۔ کھسکتے کھسکتے جب قریب آیا تو ذیشان نے تختے کو پکڑ لیا۔ بڑی مشکل سے ذیشان اور گنپت تختے کو سیدھا رکھنے میں کامیاب ہوئے۔

"بھگوان کرے اس ناری کو ابھی کچھ دیر ہوش نہ آئے ورنہ اس کو قابو کرنا ناممکن ہو جائے گا اور پھر شاید ہم تینوں میں سے کوئی بھی نہ بچے۔ کیوں کہ ہوش میں آتے ہی یہ ناری گھبرا جائے گی اور اس کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔"

"اللہ تعالیٰ نے جب یہاں تک ہماری مدد کی ہے تو انشاءاللہ ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ ان دونوں نے بڑی احتیاط و جانفشانی سے عورت کو تختے پر منتقل کیا۔ پاس میں جھولتی ہوئی ساڑی سے اس کو باندھا۔

"اب کیا کریں۔ ہیلی کاپٹر کو مدد کے لیے کیسے بلایا جائے۔ رام کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔" کہتے ہوئے گنپت نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مارے خوشی کے چیخا۔

"دیکھو ذیشان اوپر دیکھو۔ ہنومان جی آئے ہیں ہماری مدد کو۔"

ذیشان نے دیکھا ایک بندر درخت کی آخری اونچائی پر سفید کپڑا لہرا رہا ہے۔ ذیشان نے درخت کے پیٹ سے اپنی پیٹھ لگائی اور درخت کی شاخوں میں اپنے پیر پھنسا کر دونوں ہاتھوں سے تختے کو پکڑا ہوا تھا اور اللہ سے دعا کر رہا تھا یا اللہ ہماری مشکلوں کو آسان فرما۔

"دیکھو ذیشان دیکھو۔ نیچے تمہاری ماتا جی جا رہی ہیں۔" ذیشان نے دیکھا اس کی امی مسکراتی اس کی طرف دیکھتی جا رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں شاباش بیٹا میں تو شہید ہو چکی ہوں میری فکر نہ کرو۔ ان زندگیوں کو سنبھالو۔ ذیشان ابھی سنبھلا نہیں تھا کہ گنپت نے پھر آواز لگائی۔ ذیشان تمہاری بیوی اور بچہ!" ذیشان نے آنکھیں بند کر لیں۔

"دیکھو گنپت اس وقت ہم اس عورت اور اس کے پیٹ میں موجود بچے کی زندگیاں بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم میری توجہ اس طرف سے نہ ہٹاؤ! میری ماں' بیوی' بچہ تو مر چکے اب ہمیں زندہ لوگوں کو بچانا ہے۔ پروا نہیں ہم بھی اس طوفان کی نذر ہو جائیں مگر یہ عورت اور اس کا بچہ زندہ رہے یہی میری دعا ہے۔"

ہیلی کاپٹر درخت پر منڈلانے لگا۔ گنپت کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ایک ہاتھ سے ٹہنی کو پکڑے دوسرے ہاتھ سے ہیلی کاپٹر کو نیچے آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

ہیلی کاپٹر نے ان کے پاس جھولی لٹکا دی۔ بڑا جاں فشانی کا کام تھا اس جھولی میں تختی کو رکھنا۔ جھولی میں عورت کو رکھ دیا تو گنپت کو سہارا دے کر جھولی میں چڑھایا۔ پھر خود جھولی میں چڑھنے کی کوشش میں اس کا پیر ٹہنی سے پھسل گیا اور وہ خون خوار پانی میں گر گیا۔ ایک شور کے ساتھ موجوں نے اس پر جھپٹا مارا اور ذیشان کو اپنے ساتھ لے گئیں۔

☆☆☆

قرض

زاہدہ شاہ

"کرایہ؟" کنڈیکٹر نے کرخت آواز میں پارٹیشن سے اس پار خواتین کے حصے میں کھڑی لڑکی کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا۔ لڑکی نے کتابوں سے بھرے بیگ کو ٹٹول کر کرایہ تلاش کرنے کی کوشش کی اچانک اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"اف! شاید میں پیسے رکھنا بھول گئی۔"

مردوں والے حصے میں کھڑے اسد نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکی کو پہچانتا تھا اس کا نام اسماء تھا وہ اسی کے کالج میں پڑھتی تھی اور اس کا گھر بھی اسی کے محلے میں تھا۔ اسد نے اس کی پریشانی بھانپ لی تھی چنانچہ اس نے آگے کھڑے کنڈیکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھا کنڈیکٹر اپنا ہاتھ پھیلے ہوئے اس کی طرف پلٹ آیا۔

"یہ رہا ان کا کرایہ۔" اسد نے کنڈیکٹر کی کھلی ہتھیلی پر آٹھ آنے کا سکہ رکھتے ہوئے آنکھ سے اسماء کی طرف اشارہ کیا۔ کنڈیکٹر معنی خیز انداز میں اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اگلے دن وہ جیسے ہی کلاس سے نکلا اس نے اسماء کو سامنے وارانڈے میں کھڑے پایا۔ "آپ؟" وہ مسکرا کر اس کی طرف بڑھا۔ "جی آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" اسماء نے نگاہ جھکا کر کہا۔ "اور یہ قرض بھی......" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کی گلابی ہتھیلی پر ایک اٹھنی کا سکہ دھرا تھا۔

"حالانکہ شکریہ کی بھی ضرورت نہ تھی۔" اسد گویا ہوا۔ "پھر بھی آپ کہتی ہیں تو آپ کا شکریہ قبول کرلیتا ہوں...... مگر یہ قرض۔" اس نے اس کی شفاف ہتھیلی سے آٹھ آنے کا سکہ اٹھایا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور دوبارہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"یہ قرض آپ پر رہا۔" وہ دونوں بے اختیار مسکرا دیے۔ اور یہیں سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اسماء اس کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ مگر جہاں تک اس کا تعلق تھا اس کی ہر سوچ کا محور صرف اسماء ہی تھی۔ ابھی وہ انٹر کے امتحان سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ اسماء کی ایک پھوپھی جو کہ انہی کے محلے میں رہتی تھیں اسماء کا رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔

"مگر آپا اسماء ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس کی تعلیم تو مکمل ہو لے۔" اسماء کے والد عزیز احمد نے جواز پیش کیا۔

"انٹر کرلیا بہت کافی ہے۔" پھپھو نے تنک کر جواب دیا۔ "تعلیم مکمل کروا کر ہمیں کون سی نوکری کروانی ہے۔ ویسے بھی عزیز میاں! اسماء لڑکوں کے کالج میں پڑھتی ہے سوچو! اگر کل کلاں کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو کیا کروگے؟"

اسماء نے اپنے کل کے بارے میں صحیح معنوں میں سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے کل کا فیصلہ ہوگیا۔ کالج بند تھے اس لیے کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ وہ ایک اداس اور ویران سی شام تھی، جب اسد سے ملنے اس کا کلاس فیلو رفیق آیا تھا۔ باتوں کے درمیان اچانک اسے یاد آیا۔ "تمہیں معلوم ہے آج اسماء کی شادی ہے؟"

"اسماء کی شادی۔" اس نے بے یقینی سے رفیق کی طرف دیکھا۔ "کون اسماء؟"

"ارے وہی جس سے تمہاری خاصی دوستی تھی...... اسماء عزیز۔"

اسد پر تو گویا آسمان ٹوٹ پڑا وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ تب ہی کچھ فاصلے سے کسی بارات کے بینڈ باجے کی آواز سنائی دینے لگی۔ غالباً کوئی بارات آرہی تھی۔ "یا اسماء کی ہی بارات ہے آؤ ہم بھی دیکھیں۔" رفیق نے اشتیاق سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"نہیں تم جاؤ..... میں یہیں سے دیکھ لوں گا۔" اسد نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

چند لمحوں بعد بارات ان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ کچھ آگے بڑھ کر بارات رک گئی۔ کسی بزرگ نے کھلے پیسوں کو دلہا دلہن کی سجی ہوئی کار سے وار کر پھینکا۔ بارات میں شامل اور ادھر ادھر کھڑے محلے کے بچے ریزگاری لوٹنے کے لیے دوڑ پڑے۔ وہ دور کھڑا یہ دلچسپ کھیل دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہلکی سی کھنک کے ساتھ ایک سکہ اس کے پیروں کے قریب آ گرا۔ بارات آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئی۔ اس نے سکے کی طرف دیکھا۔ "آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" اس کے کانوں میں اسماء کی آواز گونجی۔ "اور آپ کا یہ قرض بھی......"

اسد نے جھک کر زمین پر پڑا آٹھ آنے کا سکہ اٹھالیا۔ تو گویا آج یہ قرض بھی ادا ہوگیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو اور مٹھی میں دبے اٹھنی کے سکے کو زور سے بھینچ لیا۔ اس کی بھینچی ہوئی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ نکل کر رخسار پر بہتا چلا گیا۔

☆☆☆

آخری ہنسی

تھائی کہانی

ارچن پن جا پھن / عطا صدیقی



ایک سادہ لوح مگر ذہین پولیس افسر کی دلچسپ روداد

ابا ہم کو بتایا کرتے تھے کہ وہ پچیس برس کے تھے تو ان کی ذاتی ملکیت فقط تین قیمتی اشیاء تھیں۔ پھرا کام پانگ کی متبرک مورتی جو ان کی گردن میں حفظ جاں کے لیے جھولتی رہتی تھی۔ ان کی کلائی پر بندھا تکرود کا گنڈا جو اپنے پہننے والے کو ضرر سے مامون رکھنے کی ضمانت تھا اور بانگلین ضلع کے ڈپٹی شیرف کے عہدہ پر ہونے کی وجہ سے پہنی جانے والی پولیس وردی۔

ابا نے ہماری امی سے یہیں بانگلین میں شادی کی تھی۔ امی کے بھیا غنڈوں کے وہ گرو گھنٹال تھے کہ جن کے نام سے نگیورائی سے لے کر درم بنگنام تک کا علاقہ تھراتا تھا۔ بانگسائی کی بزریا ان کی ملکیت تھی اور یہ علاقہ بانگلین تھانے کی حدود میں لگتا تھا، مگر ابا نے ہم کو یہ کبھی نہ بتایا کہ آخر انہوں نے ایک دادے کی بہن سے شادی کیسے کرلی۔

ابا اور ماموں دونوں اتنے ہی مختلف تھے جتنے چونا اور پنیر۔ ہمارے ماموں تو جانی واکر کے علاوہ کسی دوسرے مشروب کو ہاتھ ہی نہیں لگاتے تھے۔ وہ زیادہ تر اپنی ڈیک چیئر پر ہی گزارا کرتے تھے۔ پاس ہی ان کی چکن کری اور بوتل بھی موجود رہتی۔ ان کی دس بیگمات میں سے دو صبح شام ہر وقت ان کی پیشی میں رہتی تھیں۔ ایک پنکھا جھلنے کے لیے تو دوسری ان کی مٹھی چپی کرنے کے لیے۔ تاہم اکثر یہ بھی ہوتا کہ ان کا دل گھر کی مرغیوں سے بھر جاتا۔ تب وہ اپنے پورے جتھے کو ساتھ لے کر چھرے اڑانے کے لیے بنکاک کی طرف نکل جاتے جہاں پہنچتے ہی وہ سب سے پہلے اپنے اور اپنے کارندوں کے لیے پوری ٹرالی بھر مرغ یا بطخ کے قورے کا آرڈر دیتے اور اس سے نپٹ کر پھر بڑھیا چینی ریشم کے چند پانگلین پجاموں کی خریداری کے

لیے دکانیں جھانکتے۔ پھر وہ اپنے گروہ کو مائے بوناتگ ٹروپ کا لوک تماشا دکھانے لے جاتے جو اپنی قسم کا پہلا ٹروپ تھا کہ اپنے تماشوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی پیش کرتا تھا۔ اچھا وقت گزار کر وہ اپنے پورے غول کو سمیٹتے اور واپس گھر لے آتے۔ سفر کے دوران کشتی میں کبھی کسی نے ان سے کرایہ طلب کرنے کی جرات نہیں کی۔ پورا دل کا دل آتے اور جاتے پھوکٹ میں سفر کرتا تھا۔

رہے ابا' تو وہ سوائے چاول کے کچھ نہیں کھاتے تھے۔ زیادہ تر وہ اپنی نوکری میں ہی الجھے رہتے تھے اور اس دوران گھر کا پانی بھی امی خود بھر کر لاتی تھیں۔

حالات یوں کیوں تھے؟

ابا ایک ایمان دار' فرض شناس اور محنتی سرکاری اہلکار تھے جب کہ ڈسٹرکٹ آفس (جہاں شیرف آفس بھی واقع تھا) کے عین سامنے دریا پار قمار خانہ قائم تھا۔ ماموں نے قمار خانوں کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ ماموں پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بالکل کار فضول' کیونکہ ماموں نے ایک گرگا چولی پر بٹھار کھا تھا جو سارا دن دریا پار انچہ ور پر نظر رکھنے کے علاوہ کچھ نہ کرتا تھا کہ ادھر وہ چھاپے کے لیے پولیس کی نقل و حرکت دیکھتا ادھر وہ ہشیار کر دیتا۔ جب تک پولیس کی نفری اکٹھی ہو کر کشتیوں پر لدتی اور بانگلین سے بانگ سائی تک دریا پار کرتی اس وقت تک جائے واردات پر تاش کے پتوں کی گرد بھی باقی نہ رہتی۔ بات بھی سمجھ میں آنے والی تھی کہ ان لوگوں کے صبا رفتار گھوڑوں کے آگے پولیس کی کشتیاں سست رفتار تھیں۔

مگر رفتہ رفتہ علاقے کے لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں کہ یہ کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں کہ آخر پولیس کیوں ماموں کو ماخوذ نہیں کر پاتی۔ وہ بے شک اس وقت تک پولیس کو جل دیتا رہے گا جب تک اس کا بہنوئی ڈپٹی شیرف ہے۔ بالفاظ دیگر ابا ماموں کو خبردار کر دیتے تھے۔ ان باتوں کا اثر یہ ہوا کہ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہوتا کیا ہے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ابا کو ماموں کی گرفتاری کے لیے بھیجا جائے۔

جس وقت ابا نے دریا پار کیا تو بجز اس مورتی کے جو ان کی گردن میں پڑی تھی وہ کشتی میں تن تنہا تھے۔ وہ تو اپنا ہتھیار بھی چھوڑ گئے تھے۔ جوں ہی قمار خانے کے مخبر کی نظر ان پر پڑی اس نے دوڑ کر ماموں کو ابا کی آمد کی اطلاع دے دی۔

''اکیلا آدمی کیا سمجھتا ہے کیا تیر مارلے گا۔ سب لوگ کھیل چالو رکھو۔'' ماموں نے نتھنے پھلائے۔

ابا نے مارکیٹ کے گھاٹ پر کشتی چھوڑ دی اور قمار خانے تک جانے والی تنگ گلی میں پیدل ہو لیے۔ ماموں نے اس راہ داری کو بنوایا ہی اس طرح تھا کہ جب لوگ اس میں داخل ہوں تو ایک کے پیچھے ایک قطار بنا کر چلیں اور گلی کے دونوں سرے بند کر دیے جائیں تو جو کوئی بھی گلی میں ہو چوہے کی طرح پھنس کر رہ جائے۔ مگر جب ابا آئے تو گلی کے دہانے پر موجود پہرے دار نے ان کو روکا نہیں بلکہ ادب سے سلام کیا۔ دوسرے سرے والے پہرے دار نے بھی اسی طرح سلام کیا اور ماموں کے ڈیرے کا دروازہ ان کے لیے کھول دیا۔

جب ابا اندر پہنچے تو سب سے پہلے ان کی نظر ماموں پر پڑی جو اپنی ازلی ڈیک چیئر میں لیٹے پڑے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر ماموں نے گردن گھمائی اور بہت تپاک سے کہا۔

''لو بھئی ہمارے ڈپٹی شیرف صاحب ملنے کو آئے ہیں۔''

ابا نے بہت ملائمت سے ماموں کو سلام کیا اور خیر صلا پوچھی۔ ڈرامے کے اصل کردار اگر سکون اور اطمینان کی تصویر پیش کر رہے تھے تو چھوٹے چھوٹے کردار بڑی شرم ناک حد تک سراسیمہ ہو گئے تھے اور انہوں نے بھاگ نکلنے کی جان توڑ کوشش میں دیواریں تقریباً ڈھا دی ہوتیں۔

لیکن ماموں کا قمار خانہ وہ جگہ تھی جہاں پہنچ جانا تو آسان تھا مگر نکل جانا مشکل۔ دیواریں لوہے کی نالی دار چادروں کی تھیں اور آدمی کے قد سے دوگنی اونچی تھیں۔ تب جواری داؤ پر لگے اپنے مال کو بے تحاشا سمیٹنے میں جٹ گئے۔ اس ہڑبونگ میں دو آوازیں صاف سنائی دیں۔ ایک ماموں کو جو چلا رہے تھے۔ ''سب ٹھیک ہے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو۔'' دوسری میرے ابا کی للکار کہ ''بھاگنے کی کوشش نہ کرنا اپنی جگہ سے کوئی نہ ہلے'' دوسری آواز نے جس میں وہ رعب و دبدبہ تھا جو قانون نافذ کرنے والے ایک معمولی اہلکار کی بات میں بھی وزن پیدا کر دے' سب ہی کو ان کا حکم ماننے پر مجبور کر دیا اور وہ وہیں جم کر رہ گئے جیسے سحر زدہ لوگ۔

ماموں نے بگڑے تیوروں سے دریافت کیا۔ ''تم یہاں کس لیے آئے ہو؟''

ابا نے کہا۔ ''تمہیں لے جانے کے لیے'' ماموں کے حقارت آمیز قہقہے سے کمرا گونج اٹھا۔ انہوں نے جانی واکر کی ایک لمبی چسکی لی۔ ''اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور تمہیں اپنی سی کرنے دیں گے۔ بالکل یوں...... ایں!''

''تم کیا کرو گے یہ تم جانو۔'' ابا نے کہا۔ ''مجھے تو یہی کچھ کرنا ہے۔''

''اور جناب اگر کوئی یہ پوچھنے کی ہمت کرے کہ حضور یہ کام کریں گے کیسے؟'' ماموں نے بہت شرافت سے پوچھا۔

''میں یہاں پر موجود ایک ایک فرد کو انچہ ور لے جاؤں گا۔'' ابا نے بتایا۔

''اس دھندے میں اتنی لمبی مدت ہو گئی۔'' ماموں بولے۔ ''مگر ہم نے تو تمہارے انچہ ور میں کبھی قدم نہیں دھرا اور نہ اب ایسا کرنے کا ارادہ ہے۔''

ابا بولے۔ ''بھئی اسی لیے تو انچہ ور خود چل کر تمہارے پاس آیا ہے خاص الخاص حضور سے درخواست کرنے''

''یعنی یہ خاص الخاص درخواست ہے اور وہ بھی اپنی بات جتانے کے لیے بغیر ہتھیار کے۔ ایں۔ ارے بھلے مانس میں ابھی تم کو کتے کی موت مار سکتا ہوں۔ چاہے ڈپٹی شیرف ہو یا نہ ہو' پروا نہیں۔''

ابا بولے۔ ''تو شوق پورا کیجیے۔''

''اور وقت سے پہلے اپنی بہن کو بیوہ کر دوں؟'' ماموں نے کہا۔

''رشتے داری کو اس معاملہ سے الگ رکھو' میں یہاں سرکاری کام سے آیا ہوں۔'' ابا نے کہا اور دوسروں کی طرف مڑ کر بولے۔

''اچھا تو بھئی سن لیا تم سب نے اب چل دو سب کشتی کی طرف۔''

ماموں نے فقرہ مارا۔ ''تم کو یقین ہے کہ ایک اکیلا آدمی اتنے سارے آدمیوں کو گرفتار کر سکتا ہے؟ بھلے آدمی یہ سب باہر نکلتے ہی چاروں سمت اڑن چھو ہو جائیں گے۔''

''وہ ایسا نہیں کریں گے اور تم ان کو ایسا کرنے سے منع کر دو گے۔'' ابا بولے۔

''اور اس دوران میں تم پر نظر رکھوں گا۔''

''کیسی دیوانے پن کی بات ہے؟'' ماموں نے غصے میں کہا۔ ''لاؤ نا تو میرا پستول اب میرا صبر جواب دے گیا ہے۔'' ان کے ایک نائب نے ان کے ہاتھ میں پستول پکڑا دیا۔ انہوں نے کچھ غور سا کرتے ہوئے اس کو ہاتھ میں تولا اور اب بھی اپنی کرسی پر اسی طرح پڑے رہے۔

''اس کے بعد بھی تم سمجھتے ہو کہ مجھے باندھ لے جاؤ گے؟'' مگر ابا کچھ نہیں بولے اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہلے۔ ماموں نے بے زار ہو کر سر کو جھٹکا۔

''اتنے ساروں کو چھوڑ کر آخر تم ہی کیوں آئے ہو؟

کوئی اور کیوں نہیں آیا؟ کیا واقعی وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی بہن کے شوہر کا خون کر دوں؟“

”یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔“ ابا نے کہا۔

”تم جانتے ہو کہ لوگ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم یوں ہی قانون شکنی کرتے رہو گے اور بچتے رہو گے کیونکہ تمہارا بہنوئی ڈپٹی شیرف ہے اور مجھے ثابت کرنا ہے کہ وہ غلط کہتے ہیں۔ اس لیے اگر تم مجھ کو گولی مارو گے تو شاید یہ ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔ تب باتیں اڑانے والے یہ تو جان لیں گے کہ ایک آدمی ایسا بھی تھا جو اپنے فرض کو خاندانی ناتوں سے بلند سمجھتا تھا۔ تم ہوا کرو میری بیوی کے بھائی لیکن اگر قانون شکنی کرو گے تو میں نہیں بخشوں گا۔“

”تھوڑے بہت پتے پھڑکا لینے میں آخر کیا برائی ہے؟“ ماموں کا مزاج جو عام حالت میں بھی زیادہ ٹھکانے پر نہیں رہتا تھا۔ اب حدوں سے باہر نکلنے لگا تھا۔

”جو اقانوناً منع ہے۔“ ابا نے درشتی سے جواب دیا۔

”ہر بات قانون کے خلاف ہو غلط ہے۔“

خبردار کیے بغیر ماموں نے پستول تانا اور ابا کا نشانہ لیا۔ ہر شخص آڑ ڈھونڈنے لگا مگر ابا اپنی جگہ ڈٹے رہے۔

ماموں سیدھے سبھاؤ بولے۔ ”میں نے تو قانون توڑنا اپنا روز کا معمول بنا لیا ہے۔ مثلاً لوگوں کو شوٹ کرنا خلاف قانون ہے پر میں تو آئے دن ایسا کرتا رہتا ہوں‘ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اب اس عمر میں آ کر میں اپنی عادت بدلوں۔ ایک اور بندے سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ ابا پورے قد سے تن کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی کلائی کا تکرود اور ان کی گردن میں لٹکی مورتی آہستہ سے لرزیں۔ انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

”میں یہاں ہز میجسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے کھڑا ہوں‘ جو بھی مجھ کو مارتا ہے شہنشاہ کو زک پہنچاتا ہے۔“

یہ الفاظ سنتے ہی ماموں نے پستول یوں جھکا لی جیسے وہ بہت بھاری ہو گئی ہو‘ وہ چکرا گئے۔ کسی زمانے میں وہ خود شاہی محل سرا میں ملازمت کر چکے تھے اور خود ان میں بھی اپنے خیال کے مطابق وفاداری کا ایک تصور موجود تھا۔

”اس بات کو چھوڑ‘ بھول جاؤ‘ مٹی ڈالو‘ آؤ کسی قسم کا سمجھوتہ کر لیں۔“

”کوئی سمجھوتہ نہیں۔“ ابا نے کہا۔ ”میں نہتا آیا ہوں اور خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا مجھے کار گزاری دکھانے کے لیے کچھ چاہیے۔“ ماموں نے غصے میں آ کر پستول ایک طرف دے ماری۔

”سوچتا ہوں اب مجھے تمہارے تبادلے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“ انہوں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ ابا بولے۔ ”جو جی میں آئے کرنا‘ مجھے خود یہاں رہنے اور تم کو بار بار اندر کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے کیونکہ میں باز آنے والا نہیں۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ ماموں چلائے۔ ”اب لمبے بنو اور ناز کرو اپنی قسمت پر کہ یہاں سے زندہ سلامت نکل گئے۔“

”میں بھی سچ کہہ رہا ہوں۔“ ابا نے جواب دیا۔ ”جو میں یہاں رہ گیا تو کبھی ہتھیار بند نہیں رہ سکوں گا اور ہتھیار تو مجھ کو بھی چاہیے۔“

ماموں کچھ دیر ابا کا ایمان دار چہرہ تکتے رہے۔ ابا کی آنکھوں سے ان کی خواہش صاف عیاں تھی۔ آخر کار عمل پر اکس کر ماموں کھڑے ہو گئے اور ادھر ادھر ٹہلنے لگے پھر وہ ابا کے بالمقابل آ کھڑے ہوئے۔

”اچھا بھلے آدمی جیسی تمہاری مرضی‘ لو ہم ایمپ سور جائیں گے۔ ذرا سی بات کا تم نے بتنگڑ بنا ڈالا۔“

ابا چلائے۔ ”سنا تم سب نے اس شخص نے کیا کہا۔ چلو سب کے سب کشتی کی طرف۔ چلو۔“

یہ سنتے ہی ماموں پھر اڑ گئے۔ ”تمہاری جان کی قسم یوں نہیں ہونے کا‘ تم سمجھتے ہو میں تم کو ایسا کر لینے دوں گا‘ کیا سمجھتے ہو مجھے کس کر لے جاؤ گے۔ کتنی ان ہونی بات ہو گی! بالکل ان ہونی! تم بھول جاتے ہو کہ بات کس سے کر رہے ہو۔“

”مگر ابھی ابھی تم نے خود کہا تھا۔“ ابا بولے۔ ”تم نے وعدہ کیا تھا‘ تم نے ہی کہا تھا کہ تم قانون کے سامنے پیش ہو جاؤ گے۔“

”بالکل کہا تھا۔“ ماموں بولے۔ ”اور ایسا ہی ہوگا لیکن میں یوں کسی پھٹیچر کی طرح گرفتاری نہیں دینے کا‘ میں اپنی مرضی سے جاؤں گا اور اپنے وقت پر جاؤں گا۔ میں تم کو زبان دیتا ہوں۔ اب تو تم جاؤ گھر۔ میں کل صبح تمہارے جاگنے سے پہلے ہی ان سب چپڑ قناتیوں کو گھیر گھار کر تمہاری حوالات میں پہنچا دوں گا۔“

ابا نے کچھ دیر اس بات پر غور کیا اور پھر کاغذ پنسل مانگی کہ سب کے نام لکھ لیں۔ ”میں یہ فہرست اپنے پاس رکھوں گا۔“ ابا بولے۔ ”کل جب تم ان کو لاؤ گے تو میں اس فہرست سے ملا لوں گا۔“

”ٹھیک ہے یوں ہی سہی۔“ ماموں نے ہامی بھر لی۔

ابا اپنی کشتی کی طرف خالی ہاتھ لوٹے تو بس وہی فہرست سنبھالے ہوئے تھے۔ جب وہ ایمپ سور پہنچے تو جن نگاہوں سے ان کا سامنا ہوا وہ حقارت سے پر اور پتھرائی ہوئی تھیں۔ کچھ تو اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے پوچھ بھی لیا کہ ماموں کو چھوڑ آنے کے لیے ابا کتنا ہپالے مرے‘ مگر ابا چپ ہی رہے۔

اس رات جب وہ امی کو دن بھر کی روداد سنا رہے تھے تو اس وقت ان کی آواز کانپ رہی تھی‘ جب انہوں نے بتایا۔

”آج میں تمہارے بھائی کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔“

”تعجب ہے کہ اس نے تم کو مار نہیں ڈالا۔“ امی چلائیں۔

”وہ تو قریب قریب کر ہی گزرا تھا۔“ ابا نے کہا۔ پھر انہوں نے پورا واقعہ سنا دیا جس کے بعد کافی رات گئے تک ہم امی کے رونے کی آوازیں سنتے رہے تھے یوں لگتا تھا کہ ابا بھی اطمینان سے سو نہیں سکے تھے۔

اگلی صبح ماموں اپنے تمام چھڑ بازوں کو ہنکاتے ہوئے ایمپ سور میں پیشی کے لیے لے آئے۔ وہ سب ماموں کی اپنی موٹر لانچ میں آئے تھے جو کہ یوں کھچا کھچ لدی ہوئی تھی گویا کاتھن کے جشن کے جلوس میں آئی ہو۔ خود ماموں اپنے بڑھیا سیاہ ریشمی لباس میں نہایت شان دار لگ رہے تھے۔ ساری کارروائی کے دوران وہ اطمینان سے پان چباتے رہے۔ وہ خود کشتی کے ماتھے پر گدیلوں پر مسند نشین تھے اور جب کشتی ایمپ سور کے گھاٹ پر لگی تو وہ جلوس کے آگے آگے سربراہی کرتے ہوئے عمارت میں داخل ہوئے۔

گفت و شنید کے بعد ایک قابل قبول رقم جرمانے کے طور پر طے کی گئی جس کی ادائیگی کی صورت میں قانون شکنوں کی فوری رہائی عمل میں آ سکتی تھی‘ ماموں نے پورے غول کی طرف سے اپنی گرہ سے رقم ادا کر دی جو کہ خاصی بھر مٹھی رقم بنتی تھی۔ اس کا کچھ حصہ ابا کو ان کی گرفتاریوں کے لیے بطور انعام دیا گیا۔ تب ماموں الٹے پیروں گھومے اور پلٹ کر ایک نظر دیکھے بغیر اپنی منڈلی کو واپس دریا پار لے گئے۔ وہ ہماری امی کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے بھی نہیں رکے۔

اس رات ابا انعام میں ملی ہوئی رقم اپنے ساتھ گھر لائے اور امی کو پوری داستان سنائی۔

”مجھ کو اس رقم میں سے کچھ نہیں لینا۔“ ابا نے کہا۔ ”اور اب میں سب سے پہلے یہ رقم تمہارے بھائی کو لوٹانے جاؤں گا۔“

ہیبت سے امی کا چہرہ فق ہو گیا۔

انہوں نے سرگوشی کی ”اب کے وہ تم کو ضرور مار ڈالے گا۔“ اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔

☆☆☆



شہید

عمر سیف الدین/عابدہ خان

اللہ کے ایک سپاہی کا ایمان افروز قصہ

قاضی نے رات بڑی بے صبری سے گزاری' صبح صادق کے وقت دیوانہ ممت کی قبر کی طرف چلا گیا اور اس کے بعد بھی قاضی اپنا پورا دن اس قبر کے سرہانے پڑھتے ہوئے گزارتا رہا۔ قاضی اس شہید کی قبر کا مستقل مہمان تھا۔ اس نے ایک خوب صورت سا کتبہ قبر پر لگوایا۔ اس کی جو بھی حاجت ہوتی اس وسیلے سے مانگتا اور وہ پوری ہوتی۔

کل حج تھا۔ عیدالاضحیٰ کے دن قربان کیے جانے والے سفید بکرے اور دنبے چراگاہ میں اپنے باڑے کے اردگرد چر رہے تھے۔ چراگاہ کے بالکل سامنے یعنی آدھ میل کے فاصلے پر' زیگتوار Zigetvar کا قلعہ توگن پاشا کے قبضے سے بچ گیا تھا۔ حتیٰ کہ پاشا نے اس کا محاصرہ کرلیا تھا۔ لیکن شدت کی سردی کی وجہ سے وہ کافی عرصے تک قلعے کو حصار میں لینے کے باوجود اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اب یہ قلعہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح اپنے سیاہ درودیوار کو لیے کھڑا تھا۔ آج پھر موسم بڑا خراب تھا۔ افق پر کالے سیاہ بادلوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ کوؤں کے گروہ' شام کو اپنے گھروں کی طرف لوٹتے ہوئے' اس قلعے کے اوپر سے گزرتے ہوئے بڑے درد بھرے انداز میں کائیں کائیں کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ وہ ایک بری خبر کی پیشین گوئی کررہے ہوں۔ چراگاہ کے دائیں صدر دروازے پر زرہ بکتر پہنے شہر کا قاضی بے جان بت کی طرح بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ وہ سامنے دھند میں چھپے ہوئے علاقے اور سلیٹی رنگ کے گھنے گھر کو دیکھتے ہوئے جی میں کہنے لگا۔ ''یہ سب علاقہ ترکوں کے ہاتھ میں ہے لیکن صرف یہ زیگتوار کا قلعہ...... آہ...... کاش کہ۔ اس کو بھی ہم فتح کرلیتے۔ قاضی نے اپنی سبز پگڑی کو ماتھے سے ذرا سا اوپر کیا اور اپنی بھیگی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے رگڑنے لگا۔ قاضی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے ہونے کے باوجود ہر جنگ میں حصہ لیا کرتا تھا۔ ''اگر میرے پاس ایک دو ہزار سپاہی اور چار پانچ توپیں ہوں۔ تو ایک رات میں اس پر قبضہ کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔''

لیکن اب معاملہ ذرا مختلف تھا۔ وہ جو کچھ چاہتا تھا کر نہ سکتا تھا۔ کیونکہ گرجگال کا بادشاہ احمد اپنی فوج سمیت توگن پاشا کی فوج میں شامل ہو کر قاپشوار کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ اور قاپشوار کو فتح کرنے کے بعد اس نے Zigetvar کے قلعے کو فتح کرنے کی غرض سے اس کا محاصرہ کیا لیکن شدت کی سردی کی وجہ سے وہ اپنے قبضے کو آدھے میں ہی چھوڑ کر ''بدین'' چلا گیا اور وہ پھر اپنے سپاہیوں کے ساتھ اپنے اس علاقہ میں واپس نہ آیا تھا بلکہ وہ توگن پاشا کے پاس چلا گیا تھا۔ گرجگال کے علاقے پر اب قاضی کا حکم چل رہا تھا۔

''احمد پاشا سب' بہادر اور جنگ جو سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اب اس علاقے میں صرف بیمار اور بوڑھے سپاہی اور محافظ رہ گئے تھے۔ سب ملا جلا کر ایک سو سترہ آدمی تھے۔ دشمن ان کی طاقت سے مرعوب تھا۔ ورنہ اس کے لیے ان حالات میں ان پر قبضہ کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ قاضی نے ذرا سا جھک کر نیچے نگاہ ڈالی۔ تین سپاہی سفید قربانی کے بکروں کی نگرانی کررہے تھے۔ ایک سپاہی ایک بکرے کو غصہ دلانے کی کوشش کررہا تھا۔ بکرا اس کو سینگوں سے مارنے کی کوشش کرتا۔ وہاں کھڑے سپاہی ہاتھوں میں اسلحہ تھامے یہ منظر بڑی دل فریبی وانہماک سے دیکھ رہے تھے۔ قاضی وہیں سے چلایا۔ ''اس حیوان کے ساتھ مت کھیلو اسے تنگ نہ کرو۔''

سپاہیوں نے اپنی گردنیں آواز آنے والی سمت اٹھائیں۔ قاضی کی سخت گیر طبیعت کی وجہ سے ہر کوئی اس سے بہت ڈرتا تھا۔ کیونکہ وہ کافی غصیلا اور اصولوں کا پابند شخص تھا۔ دن رات عبادت اور ذکر الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ قلعے میں آ



تک کسی نے بھی اسے سوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ گورنر احمد اسے ''چمگادڑ'' کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ بعض لوگ اسے ''رت جگے'' کی بیماری کا نام دیتے تھے۔ قاضی نے وہیں بیٹھے بیٹھے دوبارہ آواز لگائی۔ ''چلو۔ اب ان کو بند کرو' شام ہو رہی ہے۔''

سپاہیوں نے قاضی کا حکم سنتے ہی سب بکروں اور دنبوں کو اکٹھا کر کے بند کرنا شروع کر دیا۔ قاضی کی نگاہیں سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے دوبارہ زیگتوار قلعے سے ٹکرا گئیں۔ کوے اپنی ٹولیوں کو توڑ کر باہر نکل چکے تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہوئے بڑی دردناک آوازیں نکال رہے تھے۔ قاضی کا دل ان آوازوں کو سن کر اداس ہو گیا تھا۔ وہ دعا کرتے ہوئے بڑبڑایا ''انشاء اللہ خیر ہو گی'' اس کا دل ان جانے خوف سے گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا' ہاتھ کمر پر باندھے' سر آگے کو جھکائے ہوئے وہ بغیر دیکھے چلتا گیا اور اندھیری گھپ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔

حج کے دن' وہ صبح سویرے اٹھا۔ سب لوگ ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اپنے وضو کو تازہ کرنے غرض سے اس نے کوزہ ہاتھ میں تھاما۔ باغ کی سمت والے دروازے کے اوپر قندیل کی دھندلی روشنی دیواروں پر لرز رہی تھی۔ اتنے میں اسے پہرے دار کی آواز سنائی دی۔ جو کہ سپہ سالار کو آواز دے رہا تھا۔ اس آواز کی دہشت سے قاضی کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کوزہ گر پڑا۔ قمیص کا بازو اوپر چڑھاتے ہوئے' ننگے پاؤں' ٹوپی سر پر پہنے وہ واپس اوپر کی طرف بھاگا۔ سیڑھیوں پر اسے نائب سپہ سالار نظر آیا۔ قاضی اسے دھکا دے کر پہرے دار کے قریب پہنچا اور اس سے پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

''قلعے سے دشمن باہر نکل رہا ہے۔'' پہرے دار نے گھبراہٹ سے جواب دیا۔

رات کی سیاہی میں زگیتوار کا قلعہ کالی چٹان کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کالی چٹان سے سائے باہر نکل کر ان کے علاقے کی طرف آ رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہی وہ چلایا۔ ''وہ ہماری طرف آ رہے ہیں۔''

وہ فوراً پہرے دار کی طرف گھوما۔ اسے حکم دیا۔ ''جاؤ' جلدی غازیوں کو جگاؤ' قربانی کی عید ہم آج ہی منا لیتے ہیں۔ جلدی جاؤ' اور توپچی کو میری طرف بھیجو۔''

پہرے دار' اپنی آہنی ٹوپی کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیڑھیوں میں غائب ہو گیا۔ قاضی' اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے کالی سیاہ قطار کی شکل میں آگے بڑھنے والے دشمنوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو سکیڑ اور پھیلا کر غور سے دیکھا۔ ان کے آگے کچھ توپیں بھی اسے نظر آئیں۔ اندھیرا ہونے کے باوجود بھی دشمن کی تعداد اسے سپاہیوں سے زیادہ محسوس ہوئی۔ دشمنوں کی تعداد ہزار کے قریب تھی۔ حالانکہ اس قلعہ میں اس سمیت ایک سو چودہ شخص تھے۔ لیکن اسے خدا پر کامل یقین تھا کہ وہ ان کی ضرور مدد کرے گا اور وہ اپنے سپاہیوں سمیت خون کے آخری قطرے تک لڑے گا۔ جاگنے والے سپاہی سب اوپر کی طرف بھاگتے ہوئے چڑھ آئے۔

قاضی نے قلعے کے دروازے کو بند کرنے کا حکم دیا۔ اپنی پگڑی' بندوق' تلوار اور چغہ منگوا کر پہنا۔ بوڑھے توپچی کی آمد' قاضی نے اسے فوراً ''خبر کا گولہ'' پھینکنے کا حکم دیا۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے خبر پہنچانے والے گولے کو پھینکنا اس بات کی علامت تھی کہ اڑوس پڑوس کی ترک ریاستوں کو اس لڑائی کی خبر ہو جائے اور وہ مدد کو پہنچ جائیں۔

تھوڑی دیر بعد دشمن کی فوج قلعہ کے سامنے صفوں میں کھڑی ہو گئی۔ توپیں اژدھے کی طرح اپنے منہ کھولے کھڑی تھیں۔ دشمن کی طرف سے ترکی زبان میں ایک آواز آئی۔

''ہماری ایک پیش کش ہے۔ ہم اپنے پیغام بر کو آپ کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔''

قاضی نے آواز لگائی ''ٹھیک ہے بھیج دو۔''

قاضی کے تمام ساتھیوں اور سپاہیوں نے زرہ بکتر اور ڈھالیں پہن کر ہاتھوں میں تلواریں پکڑ لی تھیں۔ تیر اور کمندیں تیار کر لی تھیں۔ اس ریاست کی خوش حالی کو برقرار رکھنے والے دو دوست ابھی اس مشکل وقت میں

اپنی ہنسی مذاق اور عجیب و غریب باتوں سے سب کو ہنسا کر ان کا حوصلہ بلند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر کوئی ان دونوں کو دیوانے کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ ایک کا نام ''دیوانہ خسرو'' رکھا ہوا تھا۔ یہ دونوں سرحدی لڑائیوں میں' ناقابل یقین بہادروں کی کہانیاں سنانے کے لیے مشہور تھے۔ یہ دونوں اناطولیہ کے رہنے والے تھے۔ اپنی کہانیوں کے بہادر سپاہیوں کے کارناموں کی طرح لڑائی میں بہادری کے جوہر دکھاتے تھے۔ ہر فتح کے بعد بادشاہ ان دونوں کو خلعت اور مرصع تلوار سے نوازتے اور انہیں اونچا عہدہ دینا چاہتے لیکن ان دونوں کو ان دنیاوی چیزوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے۔

''انسان کے فانی وجود کو صرف ایک کفن کی ضرورت ہے' نادان و جاہل کو یہ خلعت و انعام و کرام خوشیاں دے سکتا ہے۔'' جنگ ان کے لیے خوشی کا پیغام ہوتا ہے۔ ان کے لیے جنگ عید کا پیغام لاتی تھی۔ گولیوں کی آواز' تیروں کی سنسناہٹ' توپوں کی گرج' تلواروں کی چمک شروع ہوتے ہی ان دونوں کو جوش آ جاتا۔ انہیں اپنے آپ پر قابو نہ رہتا' نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے جان کی پروا کیے بغیر دشمنوں کی صفوں میں داخل ہو جاتے۔ اپنی الاؤ جیسی آنکھوں کے ساتھ بجلی کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

قاضی ان دونوں کے لطیفوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اتنے میں دشمن کے پیغامبر کو اس کے حضور پیش کیا گیا۔ پیغامبر کو دیکھتے ہی دونوں خاموش ہو گئے۔ وہاں موجود سب لوگ دم سادھے بیٹھے تھے۔ یہ پیغامبر ترکی زبان جانتا تھا۔ اس نے بڑے گستاخانہ انداز میں اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے علاقے کو حصار میں لینے والا زگیتوار قلعہ کا کپتان ہے۔ اس کے ساتھ دو ہزار سے زیادہ سپاہی ہیں۔ کپتان یہ چاہتا ہے کہ آپ اس علاقے کو بغیر کسی مداخلت و جنگ کیے ہمارے حوالے کر دیں۔ وہ آگ' نور' صلیب' انجیل اور زبور کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ آپ لوگوں کو بالکل کوئی گزند نہ پہنچائے گا۔ آپ جہاں جانا چاہیں' چلے جائیں۔ ہم آپ کی جان کی حفاظت کریں گے۔

قاضی نے بڑے ٹھنڈے دل سے یہ ساری بات سنی اور اطمینان سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد دوپہر تک تمہارے کپتان کو پیغام بھجوا دوں گا۔'' اور پیغامبر کو جانے کا حکم دیا اور پیغام بر کو قلعہ سے نیچے پھینکوا دیا' پیغامبر کے جانے کے بعد قاضی نے اردگرد کھڑے اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیا اور کہا۔

''تم نے سن لیا غازیو! مجھے یقین ہے کہ قراچن کو ہمارے فوجیوں کی اصل تعداد ایک سو چودہ کے بارے میں علم ہے۔ اس لیے وہ بغیر جنگ کیے ہم سے یہ معاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم لوگوں کو سپہ سالار کی رائے سے اتفاق ہے تو اپنے ہاتھ کھڑے کر دو۔ لیکن کسی کا بھی ہاتھ کھڑا نہ ہوا۔ قاضی نے سپاہیوں کے اقرار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ سب جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔''

ایک شور ابھرا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''ہم حاضر ہیں' تیار ہیں' ہماری تلواریں اور ڈھالیں تیار ہیں۔ آج نصرت ہماری ہے' ہماری۔''

قاضی نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے بلند کیے۔ قاضی نے ابھی یارب العالمین...... ہی کہا تھا کہ دیوانہ مہمت ننگی تلوار لیے قاضی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی گھنی و لمبی مونچھیں' چاند کی طرح خوب صورت منہ' چوڑا اور سفید چہرہ بالکل نئے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے قاضی سے کہا۔

آفندی' دعا کو چھوڑو' جہاد دعا سے افضل ہے اور اس دروازے کو کھولو' دل سے ڈر کو نکال پھینکو' دیکھو' ہم سب لڑائی کے لیے تیار ہیں۔ شہادت ہماری شہ رگ سے بھی قریب آئی ہوئی ہے۔ اس موقع کو ہم اپنے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے۔ سب نے یک زبان ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور کہا۔ ''اس دروازے کو جلدی کھولو' کھولو' کھولو۔''

قاضی کی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں' چہرہ پیلا پڑ گیا۔ لمبی کالی داڑھی میں حرکت پیدا ہوئی۔ دونوں پاگلوں کو

کلیجے پر مجبور کرنے والی، تمام غازیوں کے رونگٹے کھڑے کر دینے والی بلند اور بھرپور آواز سے قاضی نے کہنا شروع کیا۔

"اے میرے عزیز از جان سپاہیو! ہمارے بادشاہ سلیمان غازی کے واسطے میری یہ بات غور سے سنو، میری مراد تم سب لوگوں کو مڑنے سے منع کرنا بالکل نہیں ہے۔ آج مجھ سمیت ہم سب کے جان و مال فدا ہو جائیں...... کل عید الاضحیٰ ہے...... لیکن سنو، میرے کہنے کا مقصد کیا ہے؟ آج جمعۃ المبارک ہے اور حج کا دن ہے۔ آج ہمارے حاجی عرفات کے میدان میں حج ادا کر رہے ہیں۔ دوسرے مومن مسجدوں میں ہماری طرح کے غازیوں کے لیے دعا گو ہیں۔ کیا میری اس بات سے کسی کو اختلاف ہے۔"

"نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

سب لوگ بڑے انہماک سے قاضی کی تقریر سن رہے تھے۔

قاضی نے دوبارہ اپنی بات شروع کی "اس لیے مناسب یہ ہے کہ ہم بھی اپنی نمازوں کو ادا کر کے اپنی اشک آلود آنکھوں سے خدا کے حضور گڑگڑا کر اپنی فتح و نصرت کے لیے دعا مانگیں۔ ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کر کے انہیں بخش دیں۔ دنیا میں بھی نیک نامی حاصل کریں اور آخرت میں امت محمدیہ کے ساتھ اکٹھے ہوں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

تمام غازیوں کے دل پر اس بات نے کافی اثر کیا۔ دوپہر تک انہوں نے لڑائی کی پہل نہ کی، عبادت کی، نماز پڑھی، نعرۂ تکبیر بلند کیے۔ ایک دوسرے سے معافی مانگی۔ فرانجن کے سپاہی ان آوازوں اور شور کو سن کر یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ لوگ آپس میں اس معاہدہ کے بارے میں تکرار کر رہے ہیں۔

اچانک دور دراز کے ترک قلعوں میں سے توپ کے گولوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ترک غازیوں کے حوصلے بہت بلند ہوئے۔ چونکہ ان گولوں کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ ہم آپ کی مدد کو آ رہے ہیں۔ ہم نے خبر پہنچانے والے گولے کی آواز سن لی ہے۔ قاضی نے فوراً اپنے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ گرجگال کے غازی اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن دو طرف سے حملے کر رہا تھا۔ ایک طرف کے حملے کو "دیوانہ خسرو" روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف سے "دیوانہ ممت" مقابلے پر ڈٹا تھا۔

وادی میں دور سے گرد کے دھوئیں بلند ہوئے۔ ترک سپاہی اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے آ پہنچے تھے۔ دشمن کو جب پتا چلا تو اس کے حواس جاتے رہے کیونکہ وہ درمیان میں گھرا ہوا تھا۔ جب یہ گرد کے بادل چھٹے تو آنے والوں کی صحیح تعداد معلوم ہوئی۔ جو کہ صرف دس کے قریب تھی۔ دیوانہ ممت اور دیوانہ خسرو دشمن کو بھاگنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ ان کی ہر راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ قاضی نے اپنا چغہ اتار پھینکا تھا اور وہ تلوار لیے دشمنوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ دونوں دیوانے دوست دیوانوں کی طرح دشمنوں کی صفوں میں گھس کر ان کا قلع قمع کر رہے تھے۔ غیر یقینی طاقت کی برق رفتاری سے بھاگنے والے دشمنوں کو پکڑ کر قتل کر رہے تھے۔

قاضی نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیوانہ ممت کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ اچانک اس نے وہ منظر دیکھا۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ دیوانے ممت کا کڑیل وجود ساٹھ قدم کے فاصلے پر زمین پر گرا پڑا تھا۔ لیکن ایک پتھر کی ٹھوکر سے زمین پر گر پڑا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ قاضی فوراً اٹھا۔ گری ہوئی تلوار کو اٹھایا بھاگتے ہوئے اس نے دوبارہ دیوانہ ممت کی طرف دیکھا۔ گھڑ سوار گھوڑے سے اتر کر اس شہید کے سر کو اپنی تلوار سے اس کے جسم سے علیحدہ کر چکا تھا۔ اس ظالم نے اس کٹے ہوئے سر کو اپنے ہاتھ میں پکڑا اور گھوڑے پر سوار ہونے لگا۔ اسی اثنا میں بائیں طرف سے خسرو نمودار ہوا۔ اس نے یہ منظر دیکھا۔ تو اپنی پوری قوت سے چلایا۔

"ممت، ممت تم نے اپنی جان تو دے دی۔ لیکن اپنے سر کو اس کے حوالے مت کرنا۔"

یہ نعرہ اس قدر متاثر کن اور زوردار تھا کہ قاضی اپنی جگہ سکتے کی حالت میں کھڑا ہو گیا اس نے دل خراش لہجے میں کہا۔ "ہائے ممت"

اس نعرہ کو سن کر اس شہید کے سر کٹے وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ایک برقی رو کی تیزی سے اٹھ کر اس گھڑ سوار کا پیچھا کرنے لگا۔ جو کہ اس کا سر لے کر جا رہا تھا۔ اس سر کٹے وجود نے چالیس قدم کے فاصلے پر اس کو جا پکڑا۔ اپنے ہاتھ سے گھڑ سوار کو ایسی ضرب لگائی کہ وہ گھوڑے سے لڑکھڑا کر گر پڑا اور سر بھی زمین پر آ پڑا۔ سر کٹے وجود نے ہاتھ سے اس سر کو اٹھایا۔ اپنی صفوں میں واپس آ کر زمین پر دوبارہ ڈھیر ہو گیا۔ قاضی نے آنکھ جھپکنے میں یہ سب کچھ دیکھا۔ باقی سب لوگ دشمن کے ساتھ لڑائی میں مصروف تھے۔ صرف دیوانہ خسرو قاضی کی طرح اس واقعے کا زندہ شاہد تھا۔ اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اے دوست، تمہارا چہرہ نور کے ہالے میں سجا رہے۔" اس کے بعد وہ قاضی کی طرف گھوما اور اس سے کہا۔ "کیا تم نے یہ کرامت دیکھی؟"

لیکن قاضی کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولا۔ وہ ایک بے جان وجود کی طرح وہاں سکتے میں کھڑا تھا۔ پاگل خسرو نے اس کو پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ چلو اپنی صفوں میں۔ دیکھو دشمن شکست کھا کر بھاگ رہا ہے۔"

خسرو کے جھنجھوڑنے سے قاضی کے وجود میں جان پڑی۔ درود شریف پڑھتے ہوئے وہ مجاہدین کی سمت بڑھا۔

جنگ شام تک جاری رہی۔ جنگ کے خون آلود میدان کو جب رات نے اپنی زلفوں میں سمیٹا۔ قاضی نے منادی کروا کے سب مجاہدین کو قلعہ میں آنے کا حکم دیا۔ زخمیوں کو قلعے میں لایا گیا۔ شہیدوں کی تعداد معلوم ہوئی۔ کل انیس سپاہیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ دشمن ۶۴ لاشیں چھوڑ کر بھاگا اور کافی لاشوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

قاضی صبح سے کچھ کھائے پیے بغیر، آرام کے بغیر ابھی تک کام میں مصروف تھا۔ تمام شہیدوں کو قلعے کے سامنے دفنایا گیا۔ شہید دیوانہ ممت کی لاش کو اس نے خود ڈھونڈا۔ اس کا کٹا ہوا سر اس کے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ ابھی ابھی اس کی آنکھ لگی ہو۔ شہید پاگل ممت کو اسی جگہ دفن کر دیا گیا۔ قاضی نے اس کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر زبانی "سورۃ یاسین" پڑھی قلعے سے باہر کوئی بھی نہ تھا۔ سامنے پہرہ دار پہرہ دے رہا تھا۔ "سورۃ یاسین" پڑھتے پڑھتے قاضی نے دیکھا کہ اس کی قبر سبز روشنی سے منور ہے۔ قاضی کی آواز بند ہو گئی۔ ہونٹوں کی تھرتھراہٹ رک گئی۔ اس سبز نور کے اندر، دیوانہ ممت کے خون آلود گردن سے ایک سفید پیروں والا فرشتہ لپٹا ہوا اس شہید کے چوڑے ماتھے پر بوسے دے رہا تھا۔ یہ سبز نور پھیلتا گیا، پھیلتا گیا اور اس نے اپنے اندر سارے عالم کو سمیٹ لیا۔ قاضی کی آنکھیں اس نور کی روشنی سے چندھیا گئیں، جسم بے جان ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ زندگی میں پہلی دفعہ قاضی کو نیند کی حالت میں دیکھنے والے اس کے ساتھیوں نے اسے بڑی مشکل سے اٹھایا۔ اسے بازوؤں سے پکڑ کر اندر لائے۔ اسے ہوش میں لائے۔

قاضی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا وہ ساتھیوں کی باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کا سارا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ دیوانہ خسرو کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے قاضی نے اس کے کمرے میں جھانکا کیونکہ اس کے خیال میں، دیوانہ خسرو دوست کی جدائی میں آہیں بھر رہا ہو گا۔ لیکن دیوانہ خسرو بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس نے قاضی کے پوچھنے سے پہلے ہی کہا۔ "تم نے ممت کی عظمت اور بڑائی کو دیکھا ہے" قاضی نے کچھ سمجھتے ہوئے فوراً کہا۔ "کیا تم نے وہ سارا واقعہ یہاں سے بیٹھے بیٹھے دیکھ لیا ہے۔" خسرو نے جواب دیا۔ "روحانی آنکھ کو پردے کی حاجت نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے دیوانے خسرو نے دروازہ بند کر کے گنگنانا شروع کر دیا۔

قاضی نے رات بڑی بے صبری سے گزاری، صبح صادق کے وقت دیوانہ ممت کی قبر کی طرف چلا گیا اور اس کے بعد بھی قاضی اپنا پورا دن اس قبر کے سرہانے پڑھتے ہوئے گزارتا رہا۔ قاضی اس شہید کی قبر کا مستقل مہمان تھا۔ اس نے ایک خوب صورت سا کتبہ قبر پر لگوایا۔ اس کی جو بھی حاجت ہوتی اس وسیلے سے مانگتا اور وہ پوری ہوتی۔

☆☆☆

بہار کا ایک دن

رشید عملیوف/ستار طاہر

بوڑھی مریم نے اپنا ہاتھ اپنے بیٹے کے ہاتھ سے چھڑا لیا آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ سیاہ پوش حسینہ کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ”ہاں میں سمجھ گئی میں تجھے بہار کا دن واپس دیتی ہوں۔“

محبت کی ایک بہت دل آویز کہانی

نوریف کی شادی کے دن ایک ایسا واقعہ ہوا جو اب کہانی بن چکا ہے اور میں یہی کہانی دہرا رہا ہوں۔

گاؤں میں شادی کے دن کافی چہل پہل تھی۔ نوریف ویسے بھی گاؤں بھر کا چہیتا تھا اس لیے گاؤں میں کچھ زیادہ ہی جوش و خروش پایا جا رہا تھا۔ نوریف کے گھر کے اندر اور باہر گاؤں کے ہر عمر کے مرد جمع تھے۔ وہ بھی جو دلہن کے گھر دولہا کے ساتھ جانے والے تھے اور وہ بھی جنہیں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ گھر کے کمروں اور صحن میں عورتیں بھی گھوم رہی تھیں۔ شادی کے لباس میں کچھ بہت بج رہی تھیں اور کچھ ایسی بھی تھیں جو شوخ رنگ کے کپڑوں میں کچھ زیادہ ہی بد صورت دکھائی دے رہی تھیں۔

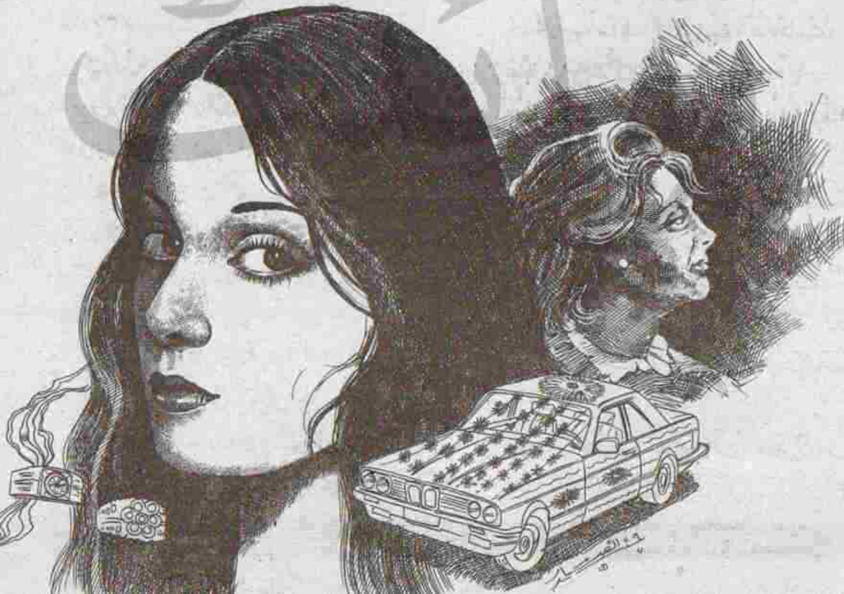
سب دولہا کے انتظار میں تھے۔ جو غسل کے بعد ایک کمرے میں لباس پہن رہا تھا۔ جب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور نوریف کمرے سے باہر نکل آیا تو سب آنکھیں اس کا جائزہ لینے لگیں۔ شادی کے روایتی لباس میں وہ خوب پھب رہا تھا۔ وہ طرح دار جوان تو تھا ہی دولہا کے لباس نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

نوریف کی بوڑھی بیوہ ماں مریم نے اس کے گلے میں سرخ گلاب کے پھولوں کا بھاری ہار ڈالا تو مریم کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ کسی نے کہا کہ اب دلہن کے گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ نوریف مسکرایا ماں کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو ”ماں اجازت دو تو میں جاؤں......“ مریم کی بوڑھی آنکھیں اپنے بیٹے پر جھکی ہوئی تھیں۔ اسے شاید وہ دن یاد آ رہا تھا جب نوریف کا باپ ایسے ہی سج دھج کر دولہا بن کر اسے بیاہنے آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی مردوں اور بچوں کی بھیڑ میں راستہ بناتی ایک جوان عورت بوڑھی عورت کے عین سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ لباس میں اس کا گورا چہرہ بہت خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا جسم بڑا نازک تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں دہشت بھری ہوئی تھی، بے قرار آنکھیں، سر کے بال بہت کالے کوئلے سے بھی زیادہ سیاہ اور ہاتھ بہت گورے چٹے اور لمبی خوب صورت انگلیوں والے......

وہ ادب سے بوڑھی مریم کے سامنے جھکی اور جب بولنے لگی تو سننے والوں نے سنا کہ ایسی شیریں آواز اس سے پہلے انہوں نے نہیں سنی تھی۔ ”بزرگ ماں آج



تیرے بیٹے کی شادی کا دن ہے۔ بڑی حسرت کا دن...... آج کے دن کیا تو میرے دامن میں کچھ نہیں ڈالے گی۔"

دیکھنے اور سننے والوں نے وہی کچھ دیکھا اور سنا جو دکھائی اور سنائی دے رہا تھا لیکن وہ یہ تسلیم کرنے پر خود کو راضی نہیں کر پا رہے تھے کہ ایسی جوان اور حسین دوشیزہ بھکارن بھی ہو سکتی ہے......

بوڑھی مریم نے اپنی بوڑھی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔ "تو کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟"

"بزرگ خاتون وعدہ کرو کہ آج کے دن میں تجھ سے جو مانگوں گی تو مجھے دے دے گی انکار نہیں کرے گی۔"

سال خوردہ تجربے کار مریم نے کہا۔

"جب میں یہ نہیں جانتی کہ تو کیا مانگے گی تو میں وعدہ کیسے کرلوں۔" سب گویا دم سادھے اس انوکھے مکالمے کو سن رہے تھے۔

"میں وہی کچھ مانگوں گی جو تو مجھے دے سکتی ہے لیکن اتنا ہی مانگوں گی جتنا میں حق رکھتی ہوں۔"

اچانک مجمع میں کھڑے کسی شخص نے کچھ کہا...... کچھ اور سرگوشیاں بھی سننے میں آئیں "نوریف کیوں خاموش کھڑا ہے اس کا چہرہ پیلا کیوں ہو رہا ہے۔ واقعی نوریف کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔"

جیسے کوئی اندھا انجان کٹھن راستے پر ہمت کر کے خوف زدہ دلیری سے قدم اٹھاتا ہے اسی طرح مریم نے ہچکچاتی ہوئی ہمت سے پوچھا۔

"بتا تو کیا مانگتی ہے؟ میرے بس میں ہوا تو میں تجھے مایوس نہیں کروں گی۔" خاموشی کا بھاری لمحہ...... سب سانس روکے کھڑے تھے سب سوچ رہے تھے۔ وہ کیا مانگے گی......؟

بڑی بڑی سیاہ اور بے قرار آنکھوں خوب صورت چہرے اور نازک جسم والی سیاہ پوش حسینہ نے کہا۔

"تجھ سے بہار کا وہ دن مانگنے آئی ہوں جس میں سوکھے درختوں پر پتے جنم لیتے ہیں۔ ہاں میں بہار کا ایک دن مانگنے آئی ہوں۔"

خزاں کے اس موسم میں جب چاروں طرف درخت ٹنڈ منڈ ہو چکے تھے اور رات کو برف باری ہوئی تھی۔ خزاں کا موسم اپنے جوبن پر تھا اور وہ سیاہ پوش حسین عورت بہار کا ایک دن مانگ رہی تھی۔

مریم نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"میرے بس میں ہوتا تو میں تمہارے دامن میں بہار کا ایک دن ڈال دیتی...... تو ہی بتا میں کس طرح ایسا کر سکتی ہوں جو میری رسائی میں نہیں......"

"پوچھ اس سے جو آنکھیں جھکائے کھڑا ہے...... پوچھ نا اس سے...... جس نے بہار کے پھولوں کی مہک سے لدے ہوئے دن میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیشہ میری زندگی کو بہاروں سے سجائے گا...... پوچھ اس سے......"

اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ نوریف کانپ رہا ہے......

بوڑھی مریم نے جیسے سب کچھ سمجھ لیا تھا...... جیسے سب کچھ پا گئی تھی...... اس نے اپنا جھریوں سے اٹا ہوا استخوانی ہاتھ آگے بڑھا کر اپنے بیٹے کے ہاتھ کو پکڑا اور پوچھا۔

"بول...... بول...... کیا یہ سچ کہتی ہے......"

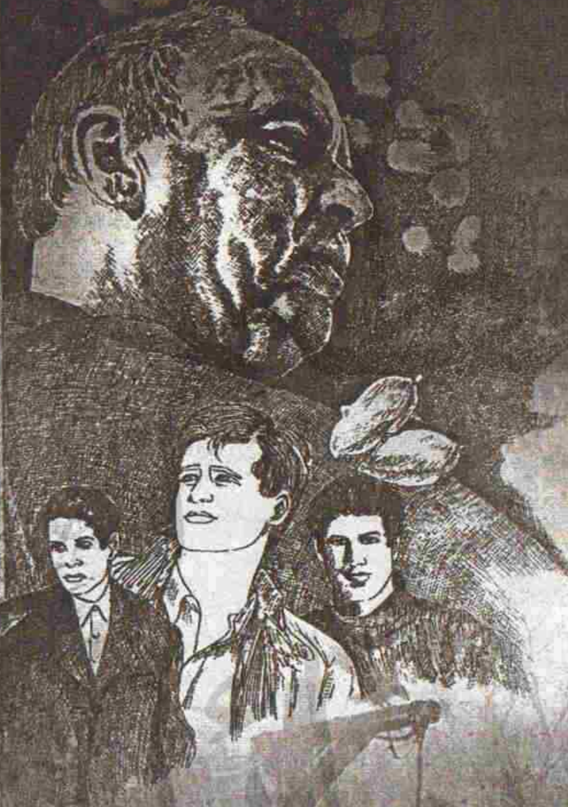
اور پھر عجب لمحہ آیا۔ اپنی ماں کے ہاتھ کو تھامے نوریف ہنسنے لگا بے ساختہ ہنسی اور پھر یک دم سنجیدہ ہو گیا......

"ماں تو اسے بہار کا دن دے دے...... ماں مجھے اس کے دامن میں ڈال دے...... ماں تو ہی کہتی تھی کہ میں تیری مرضی کی شادی کروں۔ میں تیرے سامنے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا' مگر دیکھ جس کا میں ہوں وہ مجھے مانگنے آگئی ہے۔ ماں ہم دونوں کو بہار کا دن دے دے۔"

بوڑھی مریم نے اپنا ہاتھ اپنے بیٹے کے ہاتھ سے چھڑا لیا آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ سیاہ پوش حسینہ کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔

"ہاں میں سمجھ گئی میں تجھے بہار کا دن واپس دیتی ہوں۔"

☆☆☆

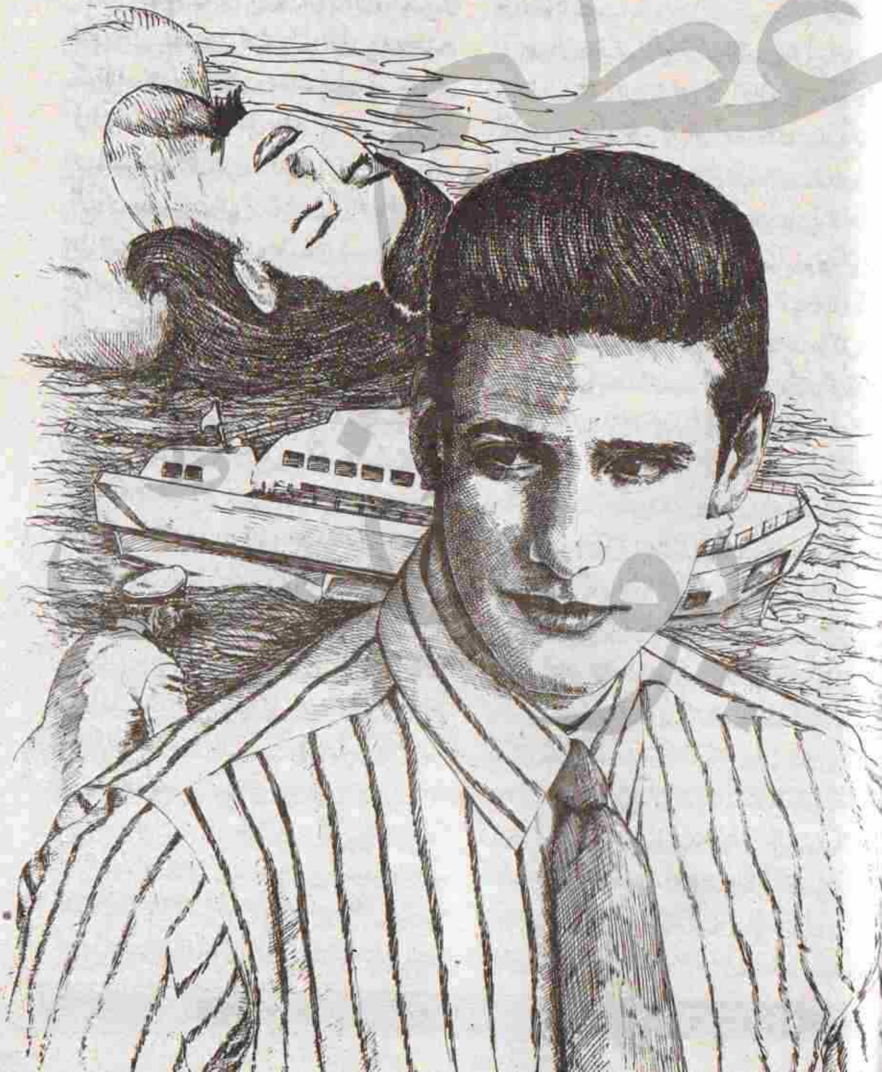


آتش فشاں

ایم اے راحت

ایک دور دراز جزیرے میں کھیلے جانے والے انوکھے ڈرامے کی رُوداد۔ ان لوگوں کا احوال جو چہرے بدل کر ملک و قوم کو دیمک کی طرح کھوکھلا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

سائنس فکشن کے دلدادہ قارئین کے لیے ایک خوب صورت انتخاب



آتش فشاں

ایم اے راحت

- ایک ایسے شخص کی کہانی' جس نے قید و بند کی صعوبتوں میں دہشت گردی کی تربیت حاصل کی
- نگری نگری گھومنے والے اس شخص کی کہانی' جس کو انتقام کی آگ نے جلا کر دہشت گرد بنا دیا
- وہ اپنا انتقام مکمل کرنے کے لیے در در بھٹکا اور آخر کار اس کو اپنی منزل مل گئی
- تجسس' ایکشن' ڈرامائی واقعات اور حالات پر مبنی مسٹری میگزین کا نیا قسط وار سلسلہ **آتش فشاں**

میرے پاس وسائل کی کمی نہیں ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک ذریعہ ہے میرے پاس میں ان جنگلوں میں دشمنوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں۔ اسمگلروں اور منشیات فروشوں کے خلاف کام کرتا ہوں اور کسی بھی جگہ کسی بھی علاقے میں جا کر اپنا عمل کر سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے اس ایریا میں جو ہمارے قبضے میں ہے۔ میں تمہارے لیے میک اپ کا سامان بھی لے آؤں گا اور تم ایک مقامی انتظامی محکمے کے آدمی کی حیثیت سے جیپ میں میرے ساتھ سفر کرو گے۔ کیا سمجھے؟" "یہ سب کچھ ہم کریں گے اور اس کی آڑ میں ایچ' بی' او تلاش کریں گے۔"

"فرض کر لو...... اگر ہمیں ایچ' بی' او مل جاتی ہے تو کیا اُسے استعمال کرنے کے ذرائع ہمارے پاس ہوں گے۔"

"اس کی تو تم فکر ہی مت کرو۔ جب ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائیں گے تو میں تمہیں ایک ایسے آدمی سے ملاؤں گا۔ جو منشیات کشید کرتا ہے۔ وہ میرے بھروسے کا آدمی ہے۔ ایک قبائلی ہے وہ۔ میں اس کا نام وغیرہ تو تمہیں ابھی نہیں بتاؤں گا لیکن ہم دونوں ایچ' بی' او تلاش کر کے وہاں پہنچیں گے اور پھر اس سے وہ محلول تیار کریں گے اور اس کے بعد۔ میرے دوست...... اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کا تم تصور نہیں کر سکتے۔ وہ حرام زادی' بالکل بے دست و پا' ہو جائے گی ہمارے سامنے۔ کیوں کہ دنیا کو جو کچھ دیں گے۔ اس کا مقام ہی الگ ہوگا۔"

"مثلاً؟"

"شیرم...... میں شیرم کی بات کر رہا ہوں۔ اسے مختلف لوگوں نے مختلف نام دیئے ہیں۔ ہم اسے شیرم کہتے ہیں۔ اگر ہم نے شیرم تلاش کر لی تو سمجھ لو کہ ہیروئن اس کے آگے بالکل بے مقصد چیز ہوگی' اور پھر ہم اسے اربوں روپے میں فروخت کریں گے سمجھے؟ اربوں روپے میں......"

"اس کے لیے کوئی ذرائع ہیں ہمارے پاس۔"

"ہاں ہیں۔ تب ہی تو میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ ورنہ کبھی نہ کہتا۔"

"ٹھیک' اگر ایسی بات ہے۔ تو میں تیار ہوں لیکن کس حرامزادی کا تذکرہ کیا تم نے؟"

"آہ...... تم اسے نہیں جانتے۔ ڈان فارگوس بھی اس کی اصل حیثیت نہیں جانتا۔ وہ اتنی ہی پراسرار اور خطرناک عورت ہے۔"

"کون؟" شاہ ور نے اس بار واقعی حقیقی حیرت سے پوچھا۔

"نام نہیں معلوم اُس کا۔ ہم نہیں جانتے۔ اسے اچھی طرح سے لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ یہاں میرا مطلب ہے دوسرے علاقے میں ایک عورت ہے اور شمالی علاقے میں وہ جس نام سے جانی جاتی ہے۔ وہ صندل وادی کا علاقہ ہے۔

ہاں صندل وادی' شاہ ور کسی خیال میں ڈوب گیا۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"بہت زیادہ گہرائیوں میں نہ جاؤ۔ صندل وادی ایک علاقہ ہے اور وہیں کوئی ایسی پُراسرار جگہ موجود ہے۔ جہاں اس عورت کی حکمرانی ہے اور صحیح معنوں میں وہ عورت ہی دنیا بھر میں اب انجلز کارپوریشن کو کنٹرول کرتی ہے۔"

"انجلز کارپوریشن' ڈان فارگوس"

"ایک نام اور اس میں شامل کرلو اور وہ ہے۔ کلرفورس۔ کلرفورس کے بارے میں تمہیں تفصیل بتاؤں وہ ایک ایسی طاقتور فورس ہے۔ جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور منشیات کے خلاف کام کرنے والوں کا خاتمہ کرتی ہے۔ یہی اس کی ڈیوٹی ہے۔ جسے وہ بخوبی سرانجام دے رہے ہیں اور اس بارے میں تمہیں مزید بتاؤں کہ دنیا بھر میں بے شمار قتل جن کے بارے میں طرح طرح کی افواہ طرازیاں ہوتی ہیں کہ وہ فلاں سلسلے میں ہوئے ہیں...... فلاں سلسلے میں ہوئے ہیں لیکن درحقیقت ان میں سے بے شمار قتل ڈرگ کے سلسلے میں ہوتے ہیں۔"

"عجیب بات کہہ رہے ہو۔"

"ہاں...... سننے میں واقعی عجیب ہے لیکن ہے ایک سچائی...... ایک حقیقت' ان میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو ڈرگ کے خلاف کام کررہے ہیں اور دوسرے وہ جو ڈرگز کے لیے کام کررہے ہیں۔ اس وقت تم یہ سمجھ لو کہ یہ مسئلہ ایٹم بم سے زیادہ سنسنی خیز ہو چکا ہے۔ شاہ ور خاموشی سے زیڈ کی باتیں سن رہا تھا۔ [illegible] کے لیے اس کے دل میں کوئی دلچسپی یا ہمدردی پیدا نہیں ہوئی تھی کیوں کہ یہ بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ جو دنیا کو ڈرگز کی لت کا عادی بنانے میں دلچسپی [illegible] صرف اپنی جیبیں بھرنے کے لیے۔"

اس نے جو انکشافات [illegible] کیے تھے [illegible] بھی حیران کن تھے۔ نجانے کیوں صندل [illegible] پر شاہ ور کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ بعد [illegible] کی وجہ تلاش کرتا رہا لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ البتہ زیڈ سے ہونے والی باتوں نے اسے خاصا اُلجھا دیا تھا۔

زیڈ نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہے۔ دونوں مل کر ایچ بی او تلاش کریں گے اور اگر وہ مل گئی تو اس کے بعد آگے کام شروع کر دیں گے وہی دولت کا حصول انسان اپنی زندگی کا کوئی تعین کر نہیں پاتا۔ نجانے کیوں ان دنیاوی چیزوں کے لیے وہ اتنا بڑا رسک لے لیتا ہے۔ زندگی ختم ہو جائے تو سب کچھ بیکار ہی ہو جاتا ہے۔

بہرحال وہ یہ کہہ کر گیا تھا کہ شاہ ور یہاں پر آرام کر لے۔ بے شک ان غاروں میں تنہائی کی زندگی بڑی تکلیف دہ ہوگی لیکن پھر بھی تھوڑا وقت یہاں گزار لیا جائے۔ تو اس کے حق میں بہتر ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے بہت جلد کاغذ اور تصویر بنانے کا دوسرا سامان فراہم کردے گا۔ یہ تمام باتیں کہہ کر وہ چلا گیا تھا اور شاہ ور یہ سوچ رہا تھا کہ سیکا کا پتہ نہیں اپنے بھائی کے ساتھ کیا رویہ ہے۔ اسے ساری تفصیل معلوم ہے یا نہیں۔

بہرحال ہو یا نہ ہو۔ اس سے شاہ ور کو کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اب اس دنیا کو وہ پوری طرح سمجھ چکا تھا۔ زیڈ سے تعاون کرنے کی وجہ بھی یہ ہی تھی کہ وہ محفوظ رہنا چاہتا تھا اور اس وقت اس کا طریقہ یہ ہی تھا۔ کہ زیڈ سے تعاون کی بات کرے ہاں...... بعد میں جب زیڈ اسے لے کر جنگلوں میں ایچ بی او کی تلاش میں نکلے تو اس وقت تک جب تک اُسے زیڈ کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ وہ زیڈ کے ساتھ رہے اور اس کے بعد مجبوری ہو تو زیڈ کو ختم بھی کیا جا سکتا ہے' یہ ساری باتیں سوچی تھیں اس نے اور اپنے آپ کو مطمئن کرلیا تھا۔

دوسرے ہی دن رات کو بارہ بجے کے قریب زیڈ واپس آیا اور اس نے اسے یہ تمام چیزیں فراہم کردیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کھانے پینے کی بہت سی اشیاء بھی لے کر آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ ہر چند کہ یہاں ایک طویل وقت گزارنے کے تمام انتظامات موجود ہیں اور اس نے دیکھ

ہی لیے ہوں گے لیکن پھر بھی وہ کچھ تازہ چیزیں لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ کچھ مصروف ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزار سکے گا اس کے ساتھ البتہ ایچ' بی' او کی تصویر بنانے کی کوشش کرے۔ یہاں تنہائی اس کی یادداشت کو سہارا دے گی اور اپنی مکمل مہارت کے ساتھ وہ ایچ بی او کی تصویریں بنانے کی کوشش کرے گا۔

وہ چلا گیا۔ تو شاہ ور نے سوچا کہ بیٹے ایسی تصویریں بناؤں گا تیرے لیے کہ تو زندگی بھر اسے تلاش ہی کرتا پھرے۔ یا پھر اگر تجھے وہ مل بھی جائے۔ تو وہ تیری زندگی ختم کرنے کا باعث تو ہو سکتی ہو۔ تیرے لیے کوئی بہتری پیدا نہ کرے۔ شاہ ور سوچتا رہا کہ ہر قدم اسے ایک ہی جانب دھکیل رہا تھا' یعنی یہ کہ وہ ایچ بی او تلاش کر کے شیرم بنانے میں ان منشیات فروشوں کی مدد کرے۔

لیکن اس کے دل میں ان کے خلاف جو نفرت تھی۔ وہ ان کے تصور میں بھی نہیں ہوگی۔ غالباً یہاں اس غار میں' بلکہ اسے غار کہنا تو حماقت ہی کی بات تھی۔ اتنی عمدہ آسانیاں اور آسائشیں تو کسی شاندار حویلی میں بھی مہیا نہیں ہو سکتی تھیں۔ جتنی زیڈ نے یہاں اپنے لیے فراہم کر رکھی تھیں۔

چنانچہ وہ آرام سے وقت گزار رہا تھا اور زیڈ کی خواہش پوری کرنے کے لیے اس نے الٹی سیدھی تصویریں بنا ڈالی تھی۔ جن کا ایچ بی او سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہرحال وہ وقت گزارتا رہا اور اس وقت رات کے تقریباً ڈھائی بجے تھے۔ وہ آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا اور سو بھی گیا تھا کہ باہر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں اور بھاگ دوڑ کا احساس ہوا۔ شاہ ور چونک کر اُٹھ گیا۔ اگر کوئی خطرہ سر پر آچکا ہے تو کیا اسے اسی غار میں قید رہنا چاہیے۔ اس دوران وہ باہر نکل کر بھی صورت حال کا جائزہ لے چکا تھا۔ چناں چہ وہ پھرتی سے باہر نکلا۔

گولیوں کا تبادلہ تھوڑے ہی فاصلے پر ہو رہا تھا۔ چنگاریاں اِدھر سے اُدھر رقص کر رہی تھیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر گیور کا ایک درخت تھا۔ جو بہت اونچا اور گھنا تھا۔ شاہ ور پھرتی سے اس کی جانب دوڑ گیا۔

باہر کا موسم اچھا خاصا خنک تھا لیکن وہ گیور کے درخت پر چڑھتا چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد اس کی ایک اونچی شاخ پر پہنچ کر رُک گیا۔ گولیوں کے تبادلے کو دیکھتا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون لوگ ہیں۔ پھر اسے کچھ گاڑیوں کی روشنیاں بھی دکھائی دیں۔ یقیناً یہ فوجی ٹرک تھے اور شاید جیپیں بھی یہ بات تو اس کے علم میں تھی۔ کہ صرف اس کے لیے وہ لوگ یہاں تک نہیں پہنچیں گے اور اس کے علاوہ جو مقابلے بازی ہو رہی تھی۔ وہ بھی ذرا اور قسم کی تھی۔

چناں چہ اپنے طور پر وہ مطمئن تھا لیکن پھر بھی ہوشیاری اچھی چیز ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے ان کا رُخ اس غار کی جانب ہی ہو جائے اور کون جانے کہ کسی کو اس غار کے بارے میں مکمل معلومات ہے بھی یا نہیں۔ بہرحال وہ یہ ساری ہنگامہ آرائی دیکھتا رہا۔ گاڑیوں کا رُخ ایک طرف ہوا اور اس کے بعد وہ سیدھی چلی گئیں۔ ابھی ان کی سُرخ روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ کچھ دیر بعد روشنیاں بھی نگاہوں سے معدوم ہو گئیں لیکن پھر بھی شاہ ور انتظار کرتا رہا۔ ہو سکتا ہے' اُن میں سے کچھ لوگ اُتر کر اس علاقے میں چھپ گئے ہوں۔

لیکن یہ بات شاہ ور کو اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی کہ وہ اس کے لیے یہاں نہیں آئے تھے' کوئی اور ہی تھا۔ جس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچے تھے اور وہ جو کوئی بھی تھا۔ مسلح تھا۔ ورنہ اتنے شان دار طریقے سے مقابلہ نہ کرتا۔ پتہ نہیں کون تھا...... اور اگر...... شاہ ور ابھی اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ بلندی سے اس نے نیچے زمین پر کوئی تحریک دیکھی۔ کوئی چوپایہ تھا جو ہاتھوں اور پیروں کے بل چلتا ہوا۔ تیزی سے اسی سمت آرہا تھا لیکن شاہ ور کی نگاہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے کم از کم چوپایہ نہیں ہے بلکہ کوئی انسان ہی ہے جو ہاتھ پیروں کے

بل چل رہا ہے۔

غار کے قریب پہنچ کر وہ رُکا اور غالباً سُن گن لیتا رہا پھر اس کے بعد وہ غار میں داخل ہو گیا۔ اب شاہ ور کے لیے درخت پر رُکے رہنا ممکن نہیں تھا۔ کون ہو سکتا ہے یہ شخص کیا وہ جس پر وہ لوگ گولیاں چلا رہے تھے۔ شاہ ور کافی دیر تک درخت پر بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ جو اندر گھسا ہے۔ وہ کتنی دیر میں باہر نکلتا ہے اور جب وہ دیر تک باہر نہ نکلا۔ وہ درخت سے نیچے اُتر آیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ غار کے دہانے کی طرف بڑھنے لگا۔

کچھ لمحوں کے بعد وہ غار کے پاس پہنچ گیا اور اندر کی آہٹیں لینے لگا۔ لیکن ابھی وہ اندر کی کوئی آہٹ نہیں سُن سکا تھا کہ دفعتہً عقب سے کسی نے اس پر چھلانگ لگائی اور شاہ ور ایک لمحے کے لیے دھوکہ کھا گیا۔ وہ غار کی دیوار سے ٹکرایا اور اچھی خاصی چوٹ لگی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے حملہ آور کے پیٹ میں ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ کراہ کی ہلکی سی آواز سنائی دی لیکن اس کے ساتھ ہی حملہ آور نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے نیک لاک لگانے کی کوشش کی۔ شاہ ور نے پوری قوت سے اپنے بازوؤں کو جھٹکا دیا اور نیک لاک نکل گیا۔ اب شاہ ور نے اس کو گردن سے پکڑا اور غار کی طرف دھکیلنے لگا۔ جبڑے پر ایک زوردار گھونسا رسید کرنے سے وہ شخص گر پڑا اور شاہ ور اس پر سوار ہو گیا۔ شاہ ور کی طاقت اور گھونسوں نے اس کے ہوش خراب کر دیے تھے اور وہ نیم غشی کی سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔

شاہ ور کو یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی [illegible] اکیلا ہی ہے، یہ بات بھی شاہ ور کی سمجھ میں آ چکی تھی کہ عقب سے اس پر حملہ کیسے ہوا۔ غالباً ور[illegible] ہوئے۔ جونہی اس کا رُخ تبدیل ہوا۔ غار میں داخل ہونے والا غار سے باہر نکل آیا اور اُس نے شاہ ور کا انتظار کیا جیسے ہی شاہ ور غار کے قریب پہنچا۔ اُس نے اُس پر عقب سے حملہ کر دیا لیکن اب شاہ ور کے گھونسوں کی تاب نہ لا کر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ شاہ ور نے اسے بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا اسے غار کے اندر لے گیا۔

اندر پہنچ کر اس نے روشنی کی یہ روشنی ایسی ہوتی تھی کہ غار سے باہر کسی طور نہیں جا سکتی تھی اور روشنی میں اس نے کڑی نگاہوں سے حملہ آور کا چہرہ دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ یہ شکل جانی پہچانی تھی۔ مائیکل کے علاوہ یہ کوئی نہیں تھا۔ مائیکل جسے اس کے ساتھ بھیجا گیا تھا اور جسے وہ کھو چکا تھا۔ گنگولی کی تلاش میں نکلتے ہوئے۔ مائیکل اور اس کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ مائیکل نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ شاہ ور دیر تک حیران نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لے ڈالی۔ ایک ہلکا پستول اس کی جیب میں موجود تھا لیکن اس کے ساتھ ہی کوئی بڑا اسلحہ بھی اس کے پاس تھا۔ کیوں کہ اس نے باقاعدہ سرحدی محافظوں سے مقابلہ کیا تھا۔

شاہ ور نے غار پر ایک نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ کھانے پینے کی کچھ چیزیں غار میں باقاعدہ بکھری ہوئی ہیں۔

صورت حال کافی حد تک شاہ ور کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ مائیکل ان علاقوں میں کیسے پہنچا اس کا تو کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے۔ وہ بھی ضرغام خان کے ہاتھ لگ گیا ہو اور ضرغام خان نے اسے بھی اسی دھندے پر لگا دیا ہو۔ جس دھندے پر زبردستی شاہ ور کو لگا دیا گیا تھا۔ بہر حال یہ ساری بعد کی باتیں تھیں۔ شاہ ور کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اب اسے کرنا کیا چاہیے۔ زیڈ کا منصوبہ بالکل الگ تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ یہاں ایک اہم حیثیت رکھتا تھا۔ ایسی شکل میں وہ کسی بھی وقت شاہ ور کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا تھا۔ جب کہ مائیکل بہر حال ایک تعاون کرنے والا آدمی تھا۔ چناں چہ اس نے مائیکل کی خبر گیری کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے ہوش میں لانے کے لیے جتن کرنے لگا۔ مائیکل ویسے بھی نیم بے ہوشی کی سی

کیفیت میں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے حواس بحال ہو گئے۔ شاہ ور اس بات کے لیے تیار تھا کہ مائیکل کوئی قدم نہ اٹھا لے۔ مائیکل وحشت زدہ انداز میں غار کا جائزہ لیتا رہا اور اس کے بعد اچانک اپنی جگہ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے متوحش نگاہوں سے شاہ ور کو دیکھا اور شاہ ور بولا۔

”روشنی زیادہ نہیں ہے مائیکل۔ تم شاید مجھے پہچان نہ سکو۔ میں شاہ ور ہوں تمہارا ساتھی۔“ مائیکل کے چہرے پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شاہ ور کو دیکھنے لگا اور پھر اس کی آواز اُبھری۔

”تم......؟“

”ہاں......شاہ ور تمہارا دوست! تمہارا ساتھی۔“

”تم یہاں کہاں سے آ گئے۔“

”جیسے تم آئے ہو۔“ شاہ ور نے مسکراتے ہوئے کہا اور مائیکل تعجب بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”کیا میں نے تم پر......تم پر ہی حملہ کیا تھا۔“

”ہاں...... مجھے بھی اس بات کا افسوس ہے کہ......“

”نہیں یار...... عجیب غلط فہمی ہو گئی۔ مجھے افسوس ہے اور یقین ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔“ پھر اس نے سوالیہ نگاہوں سے شاہ ور کو دیکھا اور بولا۔ ”تم یہاں تک کیسے آ گئے؟“

”بس گنگولی سے ملاقات ہوئی تھی۔“ اور اس کے بعد شاہ ور نے اب تک کی پوری تفصیل بتا دی۔ اصل میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جسے چھپانے کی کوشش کی جاتی۔ مائیکل کہنے لگا۔

”میں تنظیم کی ایماء پر اس طرف آ نکلا تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ تم غائب ہو چکے ہو اور مجھے تمہارے بارے میں کوئی تفصیل نہیں معلوم۔ تب مجھے کچھ ہدایات دی گئیں اور اس کے بعد میں یہاں تک آ گیا۔ لیکن تم نے بڑی عجیب کہانی سنائی ہے کیا ارادہ ہے تمہارا۔“

میں تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”دراصل مائیکل میں نہیں جانتا کہ آنے والا وقت کیا ہو لیکن...... کم از کم اتنا میں جانتا ہوں کہ یہ شخص جس کا نام زیڈ ہے۔ ہمارے لیے اچھا نہیں ثابت ہو گا۔ یہ ان علاقوں میں صاحب حیثیت ہے اور اس نے مجھے صرف اس لیے اہمیت دی ہے کہ یہ ایچ بی او تلاش کر سکے۔ اگر میں اس کے کام کا نہ ثابت ہوا۔ تو بڑی آسانی سے یہ مجھے راستے سے ہٹا دے گا۔ اس کے اندر کی بات میرے علم میں آ چکی ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی ایک خطرناک صورت حال ہے۔ مگر یہ جگہ......“

”میں نے بتایا ناں...... اسی کی ملکیت ہے۔ اس نے یہاں اپنا خفیہ ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔“

”اکیلا وہی اس خفیہ ٹھکانے سے واقف نہیں ہو گا۔ بلکہ دوسرے لوگ بھی سو فیصدی اس ٹھکانے سے واقف ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ لوگ جو زیڈ کے اپنے آدمی ہوں گے...... نہیں مائی ڈیئر شاہ ور بلاشبہ فیصلہ تم نے ہی کرنا ہے میرے بارے میں تم یہ سمجھ لو کہ اب تم مل گئے ہو۔ میں صرف وہی کروں گا...... جو تم کہو گے لیکن بس میرے ذہن میں یہ بات ہے کہ ہم اس کے آگے بھی بے دست و پا ہو جائیں گے اور دوسری بات یہ ہے کہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ میرے وجود کو برداشت کرے یا نہ کرے۔ اس طرح کم از کم میرے دوست میری زندگی کو تو خطرہ لاحق ہے۔“ شاہ ور تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے گردن ہلائی اور بولا۔

”میرا خیال ہے۔ ہمیں زیڈ کو ختم کر دینا چاہیے۔“ مائیکل چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”ایسا کرو گے۔؟“

”تم خود سوچ لو...... ویسے اگر ہم نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو یہ سیدھی سی بات ہے کہ وہ ایک بھرپور قوت سے ہمیں تلاش کرے اور کون جانے کہ کب وہ ہمیں نقصان پہنچا دے۔“

''ٹھیک ہے۔ جیسا تم پسند کرو۔ ہم زیڈ کا انتظار کیے لیتے ہیں۔ ویسے یہ جگہ واقعی بہت پُرکشش ہے۔ انسان خاصا وقت یہاں گزار سکتا ہے۔'' شاہ ور نے اس سے اتفاق کرلیا تھا۔

مائیکل نے ایک جگہ منتخب کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ شاہ ور بھی اس تھوڑے سے فاصلے پر ہی لیٹ گیا تھا۔ نجانے کب تک ان لوگوں کو نیند نہیں آئی پھر اس کے بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئے اور دوسرے دن اس وقت جاگے جب سورج خوب چڑھ چکا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ یہاں کھانے پینے کی تقریباً تمام ہی اشیاء موجود تھیں۔ مائیکل نے ایک ملازم کی طرح سارا کام کیا اور ناشتہ تیار کرلیا۔ ناشتہ اس نے بڑے ادب سے پیش کیا اور شاہ ور ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

''میری عادت مت خراب کرو۔ بلاوجہ تمہیں مستقل یہ کام کرنا پڑے گا۔''

''ایک بات کہوں ڈیئر شاہ ور میرے دل میں تمہاری بڑی عزت ہے اور میں یہ جو کچھ کررہا ہوں۔ یقین کرو۔ اسی احترام کی بنیاد پر کررہا ہوں۔''

دن کٹ گیا رات ہوئی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی؛ دن کی روشنی میں ان لوگوں نے قرب و جوار کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ وہ لوگ یہاں سے نکل جاتے بس زیڈ کا انتظار تھا۔ وہ آجائے اور اس کا کام کرلیا جائے۔ پھر اس کے بعد فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دینی ہوگی۔ آگے کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔

شاہ ور نے ابھی تک کھلی زبان سے مائیکل کو اپنے مقاصد کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ بہرحال وہ جانتا تھا کہ مائیکل اینجلز کارپوریشن کا آدمی ہے اور سو فیصدی وہ انہی کے مفادات کے لیے سوچتا ہوگا۔ ایسی شکل میں مائیکل کو اپنے بارے میں تفصیل بتانا یا اپنی اندرونی کہانی سنانا بالکل بے مقصد بات تھی۔ شاہ ور کے اپنے ذہن میں ابھی تک کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا۔ کہ اب تک وہ جو کچھ کرتا رہا تھا۔ وہ ایک بے مقصدی بات ہے' دوسروں کے چنگل میں پھنس کر ہی سارے کام کرنا پڑے تھے۔

رات کو نجانے کون سا پہر تھا کہ شاہ ور کی آنکھ کھل گئی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ چونک کر رُک گیا اور اس نے غور سے مائیکل کی طرف دیکھا۔ مائیکل اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ شاہ ور کا دل دھک سے ہوگیا۔

''مائیکل کہاں گیا۔'' وہ سُن گن لینے کی کوشش کرتا رہا لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اسلحہ لے کر باہر نکل آیا۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا کافی فاصلے پر ایک پہاڑی ٹیلے کی بلندوبالا چوٹی پر مائیکل نظر آرہا تھا لیکن اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

لیکن یہ پُراسرار وجود کون ہے' دور سے اس کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ شاہ ور نے فیصلہ کرلیا وہ اسے قریب سے جا کر دیکھے گا اور پھر وہ انتہائی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنے لگا اور یہ فاصلہ عبور کرکے مائیکل تک پہنچ گیا لیکن اس نے یہاں بھی اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا تھا اور پوشیدہ رکھنے لے لیے ایسی جھاڑیاں موجود تھیں۔ جن میں کوئی شخص پوشیدہ ہوسکتا تھا' جب شاہ ور کو حیرت ہوئی۔ مائیکل کے سامنے جو شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک پُراسرار وجود ہی نہیں۔ بلکہ ایک دلکش شخصیت بھی تھی۔ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی جس کے نقوش کچھ عجیب وغریب سے تھے۔

چہرے سے یوں لگتا تھا۔ جیسی سیاہ رنگ کے کپڑے کے پیچھے شمع رکھ دی گئی ہو۔ ایک عجیب سُلگتا ہوا سا گداز اس چہرے میں تھا۔ گہری کالی سیاہ آنکھیں مائیکل کو دیکھ رہی تھیں اور مائیکل بہت ہی عجیب انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک مجرمانہ سی کیفیت تھی۔ پھر اس پُراسرار وجود نے کچھ کہا اور اس کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سفید لبادہ ٹخنوں تک تھا۔ اس کا قد بھی بے حد خوبصورت تھا' شاہ ور حیرت سے اُسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اسے ایک دم

یوں محسوس ہوا کہ جیسے لڑکی نے مائیکل کو شاہ ور کے بارے میں کچھ بتایا ہو۔ پھر وہ ٹیلے سے نیچے اُترنے لگی اور شاہ ور نے اپنی جگہ تبدیل کرلی۔

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لڑکی کہاں جاتی ہے' لڑکی ٹیلے سے نیچے اُتری تھی اور شاہ ور گھوم کر اُس جگہ پہنچا تھا۔ جہاں سے وہ لڑکی کو جاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا لیکن اس وقت اس کی حیرت نہ رہی۔ جب اس نے لڑکی کے پُراسرار وجود کو غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک دم جیسے ہوا میں تحلیل ہوگئی تھی۔ حالاں کہ ٹیلے سے اُترتے ہوئے اسے اسی طرف آنا چاہیے تھا۔ پھر بھی شاہ ور انتظار کرتا رہا اور وہ نظر نہیں آئی۔ اب اس کے لیے اوپر جانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ شاہ ور ٹیلے پر چڑھ جائے اور خود مائیکل سے اس بارے میں کچھ پوچھے۔ پھر اُس نے ایسا ہی کیا۔

مائیکل سر جھکائے گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ ور کے قدموں کی آواز سن کر چونکا تھا اور اس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر شاہ ور کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا اور بولا۔

''تم......؟''

''ہاں...... مائیکل۔''

''تم یہاں کب آئے؟''

''تھوڑی دیر پہلے۔''

''کیا تم نے اسے دیکھا؟''

''ہاں...... کون تھی وہ؟...... اور کہاں گئی؟''

''کہاں گئی؟'' مائیکل جیسے خواب کے عالم میں بڑبڑایا۔

''ہاں...... وہ تمہارے سامنے سے اُٹھ کر ٹیلے کے پیچھے گئی تھی اور اس کے بعد اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔''

''روحوں کا کبھی پتہ نہیں چلتا۔''

''روحیں......؟''

''ہاں۔''

''مائیکل تم میرے اعتماد کو دھوکہ دے رہے ہو۔''

''نہیں میرے دوست تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''کیا وہ کوئی روح تھی؟''

''سو فیصد روح۔''

''میں نہیں مانتا۔''

''مان لو پلیز...... اگر تم نہیں مانو گے تو تمہیں نقصان بھی ہوسکتا ہے۔''

''تم مجھے دھمکانے کی کوشش کررہے ہو۔''

''ارے میں کیا اور میری اوقات کیا۔ میں تو خود ایک ٹوٹا ہوا انسان ہوں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''بس میں کیا بتلاؤں تمہیں۔''

''مائیکل میرا ذہن تمہاری طرف سے تجسس کا شکار ہوگیا ہے۔ مجھے معاف کرنا میں اُلجھن میں پڑ گیا ہوں۔''

''کیسی اُلجھن...... آخر کیسی اُلجھن؟''

''تم یہاں تنہا آئے تھے۔''

''ہاں۔''

''پھر یہ کون تھی؟''

''کہا...... ناں اس کا میری تنہائی سے کوئی تعلق نہیں ہے' وہ جب چاہتی ہے۔ جہاں چاہتی ہے۔ نمودار ہوجاتی ہے اور مجھے شرمندہ کرتی ہے۔''

''شرمندہ؟''

''ہاں......''

''مائیکل بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''سمجھ......؟'' مائیکل نے عجیب سے انداز میں شاہ ور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل سمجھنا چاہتا ہوں۔ چوں کہ اسی پر میرے اور تمہارے آئندہ کے تعلقات کا انحصار ہے۔'' مائیکل گہری سوچ میں ڈوب گیا اور تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

''میری زندگی کے پانچ سال کھو گئے تھے۔ پورے پانچ سال معمولی بات نہیں تھی۔ زندگی تو ہوتی ہی مختصر ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہر صبح مسرتوں اور اُمنگوں کی سادہ

کتاب ہوتی ہے۔ جومیسر ہولکھ لو...... ہر ورق گوں نا گوں دلچسپی کا حامل ہوتا ہے لیکن اس کتاب کے اٹھارہ سوپچیس صفحات سادہ رہ گئے تھے اور مجھے اس کا بہت افسوس تھا۔ جیل کے دن اور جیل کی راتیں بھی بھلا کہیں زندگی میں شامل ہوتی ہیں۔ میں نے یہ دن اور راتیں جس طرح گزاری تھیں۔ میرا دل ہی جانتا تھا۔

لیکن غلطی میری ہی تھی۔ میں نے خود اصول توڑا تھا۔ انسان اپنے کیے کی سزا بھگتے تو اسے اتنا افسوس نہیں ہوتا لیکن میں نے خاقان کے کیے کی سزا بھگتی تھی۔ منحوس ایرانی نے مجھے اپنی حماقت کے جال میں گرفتار کرلیا تھا۔ ورنہ میں نے زندگی میں کہاں جیل کا منہ دیکھا تھا۔ سات سال سے اسمگلنگ کررہا تھا۔ ملک ملک کی سیر میری زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ تھا۔ میں تعلیم یافتہ تھا۔ صورت حال کو جاننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مشکلات سے نمٹنے کے گر جانتا تھا۔ میں نے کبھی غلط منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ تنہا کام کرتا' اتنی دولت حاصل کرتا جو میرے عیش و آرام کی زندگی کے لیے پوری ہو اور اس کے بعد کسی دوسرے منصوبے پر عمل کرتا' کسی اور ملک نکل جاتا میں ہر ملک کا شہری تھا۔ دنیا کی تیس زبانیں جانتا ہوں میں۔ انہیں لکھ پڑھ سکتا ہوں۔ بول سکتا ہوں مجھ جیسا آدمی حماقت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ صرف اس گندے شخص کے فریب میں آکر۔

...ل یوں ہے کہ میں ان دنوں ایران میں مقیم تھا۔ وہاں میں نے دوسو گرام ہیروئن فروخت کی تھی اور اتنی دولت حاصل کرلی تھی کہ ایران میں ایک دو ماہ سکون سے گزار سکوں خاقان کمبخت وہ ایجنٹ تھا۔ جس کی معرفت میں نے یہ ہیروئن فروخت کی تھی۔ بس وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ اس نے میرے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا۔ قبراس نامی گھاس کے پتے اسے مصر پہنچانے تھے۔ ...سے ایک خاص نشہ آور شے حاصل ہوتی ہے۔ جو مصر میں مقبول ہے اور وہاں بہت قیمتی فروخت ہوتی ہے۔ میں تیار نہ ہوا تو وہ طرح طرح سے میرے پیچھے پڑنے لگا۔

یہاں تک کہ اس نے ایک ایرانی لڑکی اناش کو میرے پیچھے لگا دیا اور میری سب سے بڑی کمزوری سے فائدہ اٹھایا گیا۔

میں نے قاہرہ کا سفر کیا۔

جہاں مجھے ریسیو کرنے کے لیے بقول خاقان کے دس بارہ افراد موجود تھے لیکن میرا استقبال قاہرہ پولیس نے کیا اور میرے سامان سے وہ نشہ آور گھاس برآمد کرلی۔

اس کے بعد بہت کچھ ہوا۔ اتنا کچھ کہ بیان سے باہر ہے۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مصری پولیس دنیا کی ظالم ترین پولیس شمار کی جاسکتی ہے اور اس کے چنگل میں پھنس جانے والا بہت مشکل سے جی سکتا ہے' لیکن مجھے موت قبول نہیں تھی' میں نے خود کو تمام باتوں کا ذمے دار قرار دیا اور مجھے پانچ سال سزا سنادی۔

جیل سے نکلنے کے بعد دل تو یہی چاہتا تھا کہ سیدھا ایران جانے کا بندوبست کروں اور وہاں پہنچ کر خاقان کو قتل کردوں لیکن ایران کے حالات اخبارات کے ذریعے مجھ تک پہنچتے رہے تھے۔ زندگی کے بقیہ سال موت کے حوالے کرنا مجھے منظور نہ ہوا اور میں نے خاقان پر لعنت بھیج دی۔ ایک آسانی مجھے ضرور حاصل تھی۔ وہ یہ کہ میں کسی غیر ملکی کی حیثیت سے گرفتار نہیں ہوا تھا۔ بلکہ میرے پاس مصری پاسپورٹ بھی تھا۔ جس کے تحت میں مصر کا باشندہ قرار دیا گیا تھا اور اس بارے میں زیادہ چھان بین نہیں کی گئی تھی۔

چناں چہ رہا کرتے وقت مجھے صرف معمولی سی ہدایات دی گئیں اور کوئی مشکل نہیں پیش آئی۔

لیکن میرے سارے منصوبے میرے ساتھ جیل ... گئے تھے اور آزادی کے بعد بھی یقین نہیں آتا تھا کہ ... سے باہر ہوں۔

قاہرہ کی گلیاں سڑکیں بازار زندگی سے فروزاں ... میں ان دنوں سڑکوں پر اجنبی لیکن یہ صرف پانچ سال کا عرصہ تھا۔ جو مجھے گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ ورنہ وقت کا کوئی حصہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔

اس جمود کو توڑنے کے لیے میں نے جو سب سے پہلے قہوہ خانہ نظر آیا اس کا رُخ کیا۔ عجیب سی جگہ تھی۔ لمبی اور پتلی کسی سرنگ کی مانند۔ ماحول میں گھٹن تھی۔ میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ درمیان میں رقص کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ رنگین بلب روشن تھے۔ جن سے مختلف رنگوں کی روشنیاں یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو عجیب عجیب شکلوں میں پیش کررہی تھیں۔ چرس اور سگریٹ کے دھوئیں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے کہانیوں کے قاہرہ کی شکل پسند نہیں آئی اور میں یہاں سے اٹھنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

جیل میں خاصا وقت گزارنے کے بعد مجھے تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ آزاد اور کھلے ماحول کی۔ میں اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا کہ نیم عریاں لباس میں ایک لڑکی میرے قریب آگئی۔ یہ ویٹرس تھی۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میں رُک گیا اور بادل نخواستہ اسے کچھ آرڈر بھی دیا۔ لڑکی مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ یہ لڑکی پُرکشش نہیں تھی۔ بالکل عام سی۔ معمولی سے بدن کی مالک لیکن پانچ سال کے بعد ایک لڑکی کو اس حال میں دیکھا تھا۔ اس لیے ارادے کے باوجود قدم خود بخود رُک گئے تھے۔

ویٹرس نے میرا آرڈر سرو کردیا اور میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے لائے ہوئے مشروب کے سپ لینے لگا۔

پھر اتفاقیہ طور پر ہی میری نگاہ بائیں طرف ایک نیم تاریک ...ر کی طرف اُٹھ گئیں۔ جس میں چھوٹی سی جگہ ہونے کی ...ہ سے ایک میز پڑی ہوئی تھی۔ اس میز کے عقب سے ایک شعلہ چمک رہا تھا۔

سیاہ لباس' کندن کی طرح دہکتا ہوا رنگ۔ سلگا دینے والے نقوش جو اپنی آگ میں جل رہے تھے۔ اتنے حسین اور نازک نقوش میں نے شاید اس سے پہلے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے' ابھرتے ہوئے ہونٹ جو آواز دے رہے تھے۔ ستواں ناک بڑی بڑی گہری نیلی آنکھیں۔ جن کے اُوپر سیاہ بھنوؤں کی کمان تنی ہوئی تھی بھرے بھرے بازو۔ اس سے نچلا بدن میز کی آڑ میں پوشیدہ تھا۔ سنہرے بال جن کی لٹیں ہلکی ہوا سے اُڑ رہی تھیں۔ یہ حسین آنکھیں میری جانب نگراں تھیں۔ بالکل میری جانب مجھے دھوکا نہیں ہوا تھا۔

میں ٹھٹک کررہ گیا۔ اگر میں اس حشر بداماں کو دیکھے بغیر یہاں سے اُٹھ جاتا تو درحقیقت یہ میری بدنصیبی ہوتی۔ میں مبہوت ہوگیا اور مجھے طلب کرنے والے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک پُرکشش لکیر کھنچ گئی۔ سفید دانتوں کی ہلکی سی چمک بجلی کی طرح کوندی اور معدوم ہوگئی۔ میں ساکت و جامد رہ گیا تھا۔

سامنے گلاس میں ارغوانی رنگ کا ایک مشروب رکھا ہوا تھا۔ گلاس تقریباً آدھا خالی ہوگیا تھا۔ جب میری نگاہیں اس سے ملیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تو میرے دل میں عجیب سی خواہش جنم لینے لگی۔ دل چاہا کہ فوراً اُٹھ کر وہاں پہنچ جاؤں لیکن مصر میرے لیے اجنبی تھا۔ ہرچند کہ یہاں کی داستانیں' یہاں کی کہانیاں' بہت کچھ سُن چکا تھا۔ لیکن فوراً یہ ہمت نہ پڑی کہ اس کے پاس پہنچ جاتا یا کسی سے معلوم کرتا کہ وہ کون ہے اور اگر یہ حسینہ اپنے قرب و جوار کے چند لمحات مجھے بخش دے تو میری ساری زندگی کی گھٹن دور ہوجائے۔

میں سوچتا رہا۔ اس نے میری طرف سے نگاہیں ہٹالی تھیں۔ پھر اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا۔ سیاہ لباس میں سفید ہاتھ سنگ مرمر کا تراشا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سبک ترانگلیوں نے گلاس کو تھاما اور گلاس کچھ کہتے ہوئے ہونٹوں سے جالگا۔ مجھے اس شیشے کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ کتنا خوش قسمت تھا وہ شیشہ لیکن یہ شاعرانہ جذبات ہوس کی سوچ رکھتے تھے اور میں عمل کا آدمی تھا۔ اس لیے میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور براہِ

راست اس تک پہنچ جانے کے بجائے اس ویٹرس کو اشارے سے بلایا۔ جس نے مجھے سرو کیا تھا۔

نوجوان ویٹرس میرے قریب آ گئی۔ وہ نوجوان ضرور تھی لیکن اس کا بدن لاتعداد تجربوں کی کہانیاں سنا رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر جھکی اور اتنے قریب ہوگئی کہ اس کی سانسیں میری پیشانی سے ٹکرانے لگیں۔ وہ اپنے بدن کی خوشبو سے مجھے متاثر کرنا چاہتی تھی لیکن میں اس سے متاثر نہ ہو سکا۔ میں نے اپنی مختصر سی رقم میں سے ایک چھوٹا سا نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھا اور ویٹرس نے جلدی سے اسے یوں دبوچ لیا۔ جیسے وہ کوئی پرندہ ہو اور اُڑنے کے لیے پر تول رہا ہو۔

"میں کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی؟" اس نے پوچھا۔

"وہ سامنے۔ اپنے دائیں سمت دیکھو۔ وہ جو در بنا ہوا ہے اور اس کے پیچھے میز پر لڑکی کون ہے؟" میں نے ویٹرس سے کہا اور ویٹرس میرے اشارے کی سمت دیکھنے لگی اور پھر متحیرانہ انداز میں بولی۔

"وہاں۔ تو کوئی نہیں ہے جناب!"

"ایں......" میں چونک کر ایک لمحے کے لیے اس طرف دیکھنے لگا اور میرے ذہن میں سنسناہٹ پیدا ہوگئی۔ درحقیقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ میز خالی تھی۔ حتیٰ کہ اس پر مشروب کا گلاس بھی موجود نہیں تھا لیکن میں قیامت تک یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ میری آنکھوں کو دھوکہ ہوا ہے۔ یا میرے ذہن نے کوئی وہم میرے سامنے پیش کیا ہے۔ ویٹرس سے کیا کہتا۔ چناں چہ میں خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہوگیا۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ جناب۔" ویٹرس نے کہا اور نوٹ جلدی سے مٹھی میں دبا کر آگے بڑھ گئی جیسے اس غلط فہمی کے بعد میں اس سے اپنی دی ہوئی رقم واپس مانگ لوں گا۔

لیکن میرے ذہن پر حیرت کا ایک شدید غلبہ ہو چکا تھا۔ دیر تک گم صم بیٹھا اس در کو تکتا رہا۔ جس نے ابھی میرے سامنے ایک عجیب و غریب منظر پیش کیا تھا۔ ایک دم سے میرے اُوپر اداسی مسلط ہوگئی۔ نجانے کیوں لیکن میں پانچ سال کے بعد جیل سے چھوٹا تھا۔ میں اس آزاد دنیا میں خوشی کی سانسیں لینا چاہتا تھا۔ یہ اُداسیاں' یہ بے نام سی اداسیاں تو مجھے مفلوج کر کے رکھ دیں گی۔ چناں چہ میں جلدی سے بل ادا کر کے وہاں سے اُٹھ گیا تھا اور باہر نکل آیا۔

سرنگ نما راہداری سے گزرنے کے بعد میں نے جونہی بیرونی دروازے پر قدم رکھا تو دُبلا پتلا لمبا سا آدمی جس کا سر گنجا تھا۔ میرے سامنے پہنچ گیا۔

"ہیلو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے بھاری لہجہ میں پوچھا۔

"آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"کس سے؟""

"جس کے بارے میں آپ ویٹرس سے دریافت کر رہے تھے۔" لمبے آدمی نے پوچھا۔

"کیا؟" میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ یہ شخص اس بات کو کیسے جانتا ہے۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

"ہاں مس اناطورہ خود بھی آپ سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔ انہوں نے اسی لیے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ کہ اگر آپ ان سے ملاقات پسند کریں تو اپنے ساتھ لے آؤں۔" دُبلے پتلے آدمی نے کہا۔

"کون مس اناطورہ؟"

"میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ تم کون ہو۔" میں دُبلے پتلے آدمی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ آدمی کون ہے اور کیا چاہتا تھا۔ اسے میرے دل کی بات کیسے معلوم ہوگئی۔

اس نے دونوں شانے ہلائے اور پھر گردن جھکاتا

ہوا بولا۔

"آپ کی مرضی ہے جناب! مس اناطورہ...... نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ کہ اگر آپ اس سے ملنا چاہیں۔ تو میں آپ کو ان کے پاس لے آؤں اور اگر نہ ملنا چاہیں۔ تو کوئی بات نہیں ہے میں آپ سے معذرت کر لوں اس لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ وہ دو قدم آگے بڑھا تو میں نے جلدی سے اس کے قریب پہنچ کر اُسے روک لیا۔

"اگر آپ ان کے پاس چلنا چاہتے ہیں تو فرمائیے۔ باقی معاملات میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"ہوں میں کیوں چلنا چاہوں گا۔ ان کے پاس اور وہ کیوں ملنا چاہتی ہیں۔ مجھ سے؟"

"میں نے عرض کیا ناں کہ یہ جواب وہ ہی دے سکتی ہیں۔ مجھے صرف اتنا ہی حکم ملا تھا کہ اگر آپ آنا چاہیں تو میں آپ کو وہاں پہنچا دوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے چلو۔" میں نے کہا اور اس نے ادب سے گردن خم کر دی۔

وہ مجھے گہرے نیلے رنگ کی ایک لمبی کار کے نزدیک لے گیا۔ جس کی چھت کھلی ہوئی تھی۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

"راستے بھر میں عجیب سے چکر میں تھا۔ یہ باتیں کچھ بعید از عقل تھیں۔ اتنی سی دیر میں صرف اتنے مختصر سے میں یہ سب کچھ ہوگیا تھا۔ وہ لڑکی کب وہاں سے اُٹھی۔ میں نے بس ویٹرس کو بلانے کے لیے رُخ ہی تو بدلا تھا۔ وہ خود بھی وہاں سے اُٹھ گئی۔ اس کے سامنے کے برتن بھی اُٹھ گئے اور پھر اس نے مجھے طلب بھی کر لیا۔ بات کچھ عقل میں نہیں آ رہی تھی لیکن اس کے نقوش ابھی تک حواس پر مسلط تھے۔ اس لیے عقل کا گزر ذرا کم ہی تھا۔

میں نے اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے ڈرائیور سے بھی کوئی سوال نہیں کیا اور چند لمحات کے بعد وہ مجھے قاہرہ کے کسی سنسان سے گوشے میں لے گیا۔ جہاں رہائشی' عمارتیں نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان کے اطراف میں پھیلے ہوئے درخت سرد ہوا سے جھول رہے تھے۔ اس نے ایک چھوٹے سے خوش نما سے مکان کے سامنے کار روک دی اور نیچے اُتر کر میری سمت کا دروازہ کھول دیا۔

"براہِ کرم تشریف لائیے۔" اس نے کہا اور میں حیران سا اس کے ساتھ عمارت کے اندر داخل ہوگیا۔ جدید طرزِ تعمیر کے اس خوبصورت مکان کا یہ ڈرائنگ روم بہت خوب صورت سجا ہوا تھا۔ قدیم طرز کی چیزوں سے اسے آراستہ کیا گیا تھا۔ چھت میں فانوس لٹکا ہوا تھا۔ جس میں الیکٹرک بلب کے بجائے موی شمعیں روشن تھیں۔ دیواروں پر بھی روغنی تصاویر آویزاں تھیں۔ ان میں عجیب و غریب مناظر دکھائے گئے تھے۔ جو نہایت ہی قدیم تھے۔ ہال کے ماحول کو نہایت پُراسرار بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں ایسے سر پھرے دولت مندوں کو جانتا تھا۔ جو آج بھی قدامت کو اپنائے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے ڈرائنگ روم کی سجاوٹ میں ان چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھا تھا۔

یہ ڈرائنگ روم ایسے ہی سر پھرے دولت مند کی کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ جو آج بھی قدیم مصر کو اس میں زندہ کیے ہوئے تھا۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصاویر حیرت ناک تھیں ایک حصّے میں ایک گول دروازہ تھا۔ جس میں کواڑ نہیں لگے ہوئے تھے۔ وہاں سے ہلکی ہلکی نیلی روشنی اُبھر رہی تھی اور اس روشنی کے دوسری جانب ہلکی ہلکی مدّھم موسیقی سنائی دے رہی تھی۔

عجیب و غریب موسیقی تھی۔ جو سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن یہ موسیقی میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے کئی بار فلموں میں قدیم مصر کی موسیقی کو اس طرز میں سنا تھا۔ نجانے اس میں کون کون سے ساز استعمال کیے جاتے تھی۔ میں اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن مجھے اس بات پر حیرت تھی۔ کہ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے وہ عورت یا لڑکی کون تھی کہ میں اس کی طرف راغب ہوں۔ پھر اس

تنہا ہال میں مجھے چھوڑنے کی کیا وجوہ تھیں۔

کئی منٹ تک تو میں انتظار کرتا رہا کہ ممکن ہے کہ کوئی آئے۔ آنے والے کا رُخ یقیناً اسی اندرونی دروازے کی سمت سے ہو سکتا تھا۔ جہاں سے وہ نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لیکن جب کافی دیر ہو گئی اور کوئی نہ آیا تو میں بے چین ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے سوچا اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہ دبلا پتلا شخص بھی دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے دروازے کی جانب دیکھا اور یہی فیصلہ کیا کہ اس اندرونی دروازے میں داخل ہونے کے بجائے۔ بیرونی دروازے سے باہر نکل جاؤں اور دریافت حال کروں لیکن ابھی مجھے یہ سوچے ہوئے دیر نہ گزری تھی کہ دفعتہً اسی اندرونی دروازے سے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔

یہ لڑکی قدیم مصری لباس میں ملبوس تھی۔ یہ لباس فراعنہ کے دور کا تھا۔ میں مختلف تصاویر میں ایسے لباس دیکھ چکا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ وہ میرے سامنے آ کر اپنا داہنا ہاتھ سیدھا کر کے رکوع کے سے انداز میں جھکی اور پھر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے کچھ نہ سمجھا۔ بہرطور اب اتنا بزدل یا بے وقوف نہیں تھا کہ ان تمام باتوں سے خوفزدہ ہو جاتا۔ میں نے سوچا کہ اگر میرے ساتھ کوئی ڈرامہ کیا جا رہا ہے۔ تو پھر میں خود بھی اس میں دلچسپی سے حصّہ لوں۔ میں تو ایسی ہی کسی نئی چیز کا خواہش مند تھا۔ جو میرے ان پانچ سالہ جمود کو توڑ دے۔

لڑکی آہستہ خرامی سے آگے بڑھتی رہی۔ میں اس کی دلکش چال کے سحر میں ڈوبا چلتا رہا۔

پھر جب میں اس گول نیلے دروازے سے دوسری طرف نکلا۔ تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں سخت حیرت زدہ تھا۔ اس رہائشی علاقے میں جو مکانات بنے ہوئے تھے، وہ طویل و عریض نہیں تھے۔ دور سے تو مختصر ہی نظر آتے تھے لیکن یہاں میں جو کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ میری عقل سے باہر تھا۔

اتنا عالی شان مکان جو کسی محل ہی سے مشابہہ معلوم ہوتا تھا۔ تیز روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بالکل قدیم ماحول تھا۔ سامنے ایک بڑے تخت پر سجا سنورا اور نک سک سے درست ایک شخص ایک خوبصورت زرنگار تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور کسی مافوق الفطرت ہستی کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اس کے سامنے لوگ اس انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ جس طرح قدیم مصر کے درباروں میں کھڑے ہوا کرتے تھے۔ سر جھکائے ہاتھ جوڑے بے جان بتوں کی مانند چند افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ہی پروہت کے لباس میں ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔ جو آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی آواز سننے کی کوشش کی اور میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یہ شخص فرعون کی صفات اور اختیارات بیان کر رہا تھا۔ یہ قصیدہ ختم ہوا تو تخت پر بیٹھے ہوئے شخص نے پہلو بدل کر درباریوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور پھر پروہت کی جانب رُخ کر کے بولا۔

”مغرور اور گستاخ، جانسیوسا کے رہنے والوں کو جس خوش اسلوبی سے سزا دی گئی۔ ہم اس سے بہت مطمئن ہیں اور اظہار خوشی فرماتے ہیں، رزم کی محفل سے نکل کر بزم کی محفل میں آ جانا چاہیے۔ ہم اپنے حالات سے نمٹ چکے ہیں۔“

درباریوں میں سے چند نے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں اور اس کے بعد موسیقی کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ یہ وہی موسیقی تھی، جو مجھے اس ہال میں سنائی دے رہی تھی۔ سازندے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن موسیقی کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی اور اس کے بعد ایک ہلکی سی جھنکار گونجی اور دوسرے لمحے ایک حسینہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی نظر آئی۔ وہ اسی طرح چلتی ہوئی اس شخص کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ جو تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ حسینہ مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی، پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے تک اُٹھا کر اس

کے سامنے جوڑ دیے۔ سر جھکایا اور پھر کمر کو خم دے کر نیچے جھکتی گئی۔ جیسے اسے سجدہ کر رہی ہو۔

میں حیران نظروں سے ان تمام مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے ہوش و حواس گم ہونے لگے تھے لیکن میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔

لڑکی تقریباً آدھے منٹ تک اسی انداز میں جھکی رہی۔ پھر تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اپنے پیروں اور کمر کو دوبارہ جنبش دی اور ہولے ہولے رقص کرنے لگی۔ موسیقی کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور میں نے اس کی عجیب و غریب کیفیت کو اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

جوں، جوں موسیقی کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس رفتار سے موسیقی کی آواز بدل رہی تھی اور اب دھن میرے لیے قطعی اجنبی اور غیر مانوس تھی۔ اس میں کچھ ایسے ساز استعمال کیے جا رہے تھے، جن کی آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی اور نہ ہی میں ان سازوں کے نام جانتا تھا۔ اس میں کہیں کہیں ناقوسوں کی ہلکی سی صدائیں بھی شامل تھی اور گھنٹیوں کی آوازیں بھی تھیں۔

بہرطور اس کا اثر بہت گہرا تھا اور دل و دماغ پر ایک ناقابل فہم اور انجانا سا احساس طاری کر رہا تھا، اس کی گونج اعضاء کو مفلوج کر رہی تھی لیکن میں نے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھا۔ البتہ مجھ پر محویت اور وارفتگی سی طاری ہو گئی تھی۔

میں اس لڑکی کے رقص کو دیکھ رہا تھا، جس کا انداز میرے لیے نیا تھا۔ جتنے بھی مشرقی اور مغربی رقص تھے۔ یہ ان میں سے نہیں تھا۔ اس رقص میں ایک عجیب سی شوریدہ سری تھی۔ تیزی اور روانی تھی۔ لڑکی کی کمر، کولہے، ٹانگیں۔ شانے اور سینے کی حرکات انتہائی پُراسرار تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے قدیم مصر میرے سامنے زندہ ہو گیا ہو۔ فراعنہ کا دور جس کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا، میری آنکھوں کے سامنے تھا اور یہ شخص جو فرعون کے لباس میں ملبوس اور زرنگار تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ درحقیقت کوئی فرعون ہی معلوم ہوتا تھا۔

رقص میں تیزی اور تندی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ رقاصہ کے ایک ایک زاویے اور بدن کی ایک ایک جنبش سے ہزاروں سال پرانی قدیم مصری روایات کا اظہار ہوتا تھا۔ جسم کی حرکات پیروں کی جنبش اور سر کو بار بار جھکانے کا انداز بالکل ویسا تھا۔

موسیقی اور تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی رقص میں مزید جولانی پیدا ہو گئی۔ لڑکی ایک مستی اور بے خودی کے عالم میں ناچتی رہی۔ میری پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔ مجھے گرد و پیش کا کوئی ہوش نہیں رہ گیا تھا، بلکہ مجھے تو یہ احساس بھی نہیں رہ گیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ یا کسی عجیب و غریب طریقے سے میں اس پُراسرار مکان میں آیا ہوں، بس میں رقص کرنے والی لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا۔

لڑکی حالات اور ماحول سے بے خبر ناچ رہی تھی۔ کبھی وہ اپنی ٹانگوں کو دائروں کی شکل میں گھماتی، کبھی فضا میں اچھالتی اور پھر گھوم کر پشت کو لچکانے لگتی ایک سنسنی سی ماحول پر طاری ہو گئی تھی۔ موسیقی کی آواز کے باوجود مجھے قرب و جوار میں ایک ہولناک سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔

یہ حیرتناک رقص اپنے عروج پر پہنچتا جا رہا تھا اور اب لڑکی کا بدن سیماب کی مانند تھرک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے اس کے اندر کوئی مشین برق رفتاری سے چل رہی ہو۔ انسانی بدن میں اتنی تیزی کسی طور پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ موسیقی تھی کہ کان پھاڑے دے رہی تھی اور اس کی پُراسرار کیفیت بدستور قائم تھی لیکن سازوں کی آوازیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی تھیں۔ رقص عروج پر پہنچا اور پھر ایک دم چاروں طرف خاموشی مسلط ہو گئی۔ اچانک ایک نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور بے خودی سے کہنے لگا۔

”ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ سب کچھ تیرے قابو میں

ہے لیکن محبت اور دلوں کے جذبے تیری دسترس سے باہر ہیں۔ تو انہیں اپنی قوت کے بل پر حاصل کرے۔ ہاں...... اناطورہ! میری محبوبہ ہے اور میری محبوبہ رہے گی۔ وہ میرے لیے زندہ ہے اور میرے ہی لیے جان دے دے گی۔"

تخت پر بیٹھے ہوئے شخص کے انداز میں تھرتھری پیدا ہوگئی۔ اس نے خونخوار آواز میں کہا۔

"لے جاؤ اس مردود کو! اور جالودہ کے تاریک غاروں میں پھینک دو۔ تاکہ یہ محبت کا نام بھول جائے اس کو احساس ہوجائے کہ اس نے رااعلوس کی محبوبہ پر نگاہِ غلط ڈال کر اپنے لیے کس طرح موت کو آواز دی تھی۔ لے جاؤ اسے میرے سامنے سے لے جاؤ۔"

تخت پر بیٹھا ہوا شخص غصے سے کھڑا ہوگیا اور بہت سے سپاہی اِس نوجوان کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ پھر میں اس نے دیکھا کہ وہ اس نوجوان کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے جارہے ہیں ماحول میرے سامنے بدلنے لگا۔ میری نگاہیں اس کا تعاقب کررہی تھیں۔ میں سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو اسے لیے جارہے تھے۔

مصر کی تنگ و تاریک گلیوں اور بازاروں میں قدیم مصر کا عظیم شہر جو ایک تہذیب کا گہوارہ تھا۔ رات کی زلفیں بکھرنے کے ساتھ جوان ہوچکا تھا۔ حسین و جمیل عورتیں اور مرد بناؤ سنگھار کرکے، سڑکوں پر نکل آئے تھے...... مشعلوں کی زرد روشنی میں ان کے گلابی چہرے اور زرق برق لباس ستاروں کی طرح دمک رہے تھے۔ سپاہی اس بدنصیب شخص کو ان لوگوں کے درمیان سے گزارتے ہوئے شہر کے پُررونق علاقوں سے نکال کر ویرانوں میں لے آئے اور پھر شاید وہ جالودہ کے عمیق غار ہی تھے جن کے اطراف پتھروں کی بڑی بڑی چٹانیں کھڑی ہوئی تھیں۔ جب میں نے ان ہولناک چٹانوں کی طرف دیکھا اور پھر مجھے اس غار کی گہرائی نظر آئی۔ جو اس بدنصیب کا مدفن بننے والی تھی، انتہائی بلندی تھی۔ جہاں انہوں نے اسے ایک چٹان پر کھڑا کیا اور پھر سپاہیوں نے اسے نیزے چبھو چبھو کر نیچے دھکیل دیا۔ گرنے والے نوجوان کی دردناک چیخ بڑی طویل تھی اور اس کے ساتھ ہی میں بُری طرح چونک پڑا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں گر پڑوں گا۔ میری ٹانگیں بے جان سی ہونے لگی تھیں۔ بمشکل تمام میں نے خود کو سنبھالا اور پھر میں نے اپنے اطراف میں دیکھا تخت پر بیٹھے ہوئے شخص نے گردن خم کی اور رقاصہ پھر اس کے سامنے سربسجود ہوگئی۔

یہ سب کیا ہے۔ میرے خدا یہ سب کیا ہے؟ میں سوچ رہا تھا، میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آگے بڑھوں۔ اس جگہ پہنچ جاؤں جہاں تخت بچھا ہوا تھا اور اس شخص سے پوچھوں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ وہ کون ہے؟

لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا بدن بے جان ہو۔ مجھے یوں لگنے لگا۔ جیسے لوگوں کے درمیان میرا وجود کوئی مادی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ بس ایک ہوا تھی۔ جو وہاں موجود تھی۔ درحقیقت میں اپنے بدن کو منتشر محسوس کررہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرے جسم و جان میرے اعضاء میرے اپنے نہ ہوں۔ میں اِن پر ذرا بھی دسترس نہ رکھتا ہوں اور واقعی میں اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرسکا۔

تب ہی کچھ ہنگامہ اور شور سا سنائی دیا اور اس کے بعد چند عجیب و غریب لباسوں میں ملبوس افراد جن کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھے۔ وہ شخص ایک خوبصورت جوان تھا۔ جو قدیم مصری لباس میں ہی ملبوس تھا۔ اس کے بدن پر زخموں کے نشانات تھے۔ لانے والوں نے اسے لاکر زور سے دھکا دیا اور وہ تخت پر بیٹھے ہوئے شخص کے سامنے اوندھا گر پڑا۔

تخت پر بیٹھے ہوئے شخص کی نفرت انگیز، نگاہیں اسے گھور رہی تھیں۔ پھر اس نے بگڑی ہدایت پر عمل کیا۔

"ہوں تو یہ اوسیانوس ہے، بہت شور سنتے تھے۔ اس کا کہاں ہے۔ میری محبوبہ اوسیانوس، جواب دے، بلاا سے کہ تیرا حال دیکھے بلاا سے کہ اسے فرعون سے غداری کرنے کی سزا معلوم ہو لیکن قصوروار وہ نہیں ہے۔ اناطورہ بے قصور ہے، ہم جانتے ہیں۔ کہ ہم نے اسے اسی وقت اپنے حرم کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ جب اس کی عمر سمجھنے کی نہ تھی لیکن تو نے یہ نہ سوچا کہ فرعون کی محبوبہ تیری محبوبہ کیسے بن سکتی ہے؟"

نوجوان اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے غیظ و غضب کا اظہار ہورہا تھا، پھر اس نے گرجتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ناپاک، پرہوس، بدقماش بادشاہ تیری فطرت میں برائیاں ہی برائیاں ہیں۔ تو نے اپنے آباؤ اجداد کے نام کو جس طرح زمین بوس کیا ہے۔ مصر کے در و دیوار نے دیکھا، لیکن اس وقت میں شدّتِ حیرت سے اُچھل پڑا۔ جب میں نے خود کو وہاں اکیلا محسوس کیا۔ وہی جگہ تھی۔ میرے عقب میں وہی دروازہ تھا۔ جس سے ہلکی نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ نیلی روشنی کہاں سے آئی؟

مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، لیکن جس جگہ میں کھڑا تھا۔ وہ ویران تھی اب نہ وہاں کوئی تخت تھا نہ درباری کوئی بھی نہیں تھا۔ بس سنسان ویران سا میدان میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ درحقیقت میں آپ سے پہلے بھی عرض کرچکا ہوں میں بزدل نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی ایک خاص انداز میں گزاری ہے۔ بہت سے کٹھن اور خوفناک مراحل مجھ پر گزر چکے ہیں اور میں کبھی خوفزدہ نہیں ہوا۔ اس وقت زندگی میں پہلی بار مجھے خوف کا احساس ہوا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ میں دہشت زدہ سا اس دروازے کی جانب پلٹا۔ اس ویرانے میں آگے قدم نہیں بڑھا سکتا تھا۔

گول دروازے سے میں دوسری طرف نکل آیا۔ دوسری طرف ہال اسی طرح خاموش پڑا ہوا تھا لیکن اس ہال کے ایک گوشے میں، ایک کرسی کا اضافہ کیا گیا تھا اور اس کرسی پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سو فیصدی وہی۔ ہاں...... یہ وہی تھی، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں، میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھاسکتیں۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے ہوٹل میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ جدید لباس میں ملبوس تھی اور اس کے سلگتے ہوئے نقوش میری جانب نگراں تھے۔

میں جو کچھ دیکھ کر آرہا تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنے حواس پر قابو رکھنا بے حد مشکل معلوم ہورہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں لڑکی کے سامنے اپنی شخصیت برقرار نہیں رکھ سکوں گا۔ اس تمام ہنگامے کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ شاید میں کسی طلسم کدے میں آ پھنسا تھا۔ شاید مصر کی پُراسرار روایت مجھ سے لپٹ گئی تھی اور میں ان سے نہیں نکل سکتا تھا۔ میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ ہاں ان حسین و رنگین پُراسرار روایتوں میں سے ایک روایت میری اپنی ذات سے بھی منسلک ہوچکی تھی۔

میرے قدم ٹھٹک گئے میں نے پلٹ کر سامنے کے دروازے کی جانب دیکھا وہ بند تھا۔ عقبی دروازے سے وہی نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ گویا میرے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دروازے کے بالکل قریب ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی وہ میری جانب نگراں تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ شوخی، وہ چمک نہیں تھی۔ جو میں نے قہوہ خانے کے اس در میں محسوس کی تھی۔ بلکہ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک اُداسی سی تھی۔ تھکی تھکی، اداس سی۔ میرے لیے اب اس کے سواہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اس کے نزدیک سے گزروں، اس سے بات کروں۔ اس احمقانہ خوف کو دل سے نکال دوں۔ ہر چند کہ میں طلسم کدے میں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ میں کس کے درمیان ہوں لیکن بہرطور مجھے خود کو سنبھالنا تھا اور میں اپنی کوشش میں کافی دیر کے بعد کامیاب ہوسکا۔ جس وقت میں نے اس لڑکی کو قہوہ خانے میں دیکھا تھا تو میں دل میں ایک حسرت سی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے دل میں آرزو ابھری تھی کہ کاش میں اس کا قرب حاصل کرسکوں کسی طرح اس کی رفاقت کے کچھ لمحات مجھے میسر

آجائیں، لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔
اب وقت بدل چکا تھا اور اب میں تو صرف خوف و دہشت کے عالم میں تھا اور یہاں سے نکل جانے کا خواہش مند تھا، بہرطور میں چند قدم آگے بڑھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک استقبالیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
''بیٹھو۔'' اس نے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا لیکن میں اسی طرح کھڑا رہا۔
''براہ کرم بیٹھ جاؤ۔ جو کچھ ہوا یہ بہت ضروری تھا۔ تمہیں کچھ بتانے کے لیے بہت ضروری تھا۔''
''کیا مطلب میں نہیں سمجھا۔ تم کون ہو اور تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے دیکھا اس دروازے کی طرف جو کچھ تھا۔ وہ سب کیا تھا۔ تم مجھے کس طلسم میں گرفتار کرنا چاہتی ہو۔ کیا چاہتی ہو تم مجھ سے؟''
مجھے اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہو رہی تھی جیسے میں بھاری بنانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سو فیصدی اس میں ناکام تھا۔ وہ نرم اور غمناک نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے حسین لب اب بھی اس طرح تھے۔ وہ لب وا ہوتے تو ایک عجیب سا پُرکشش احساس ہوتا یہ احساس دل میں چنگاریاں بکھیر دیتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کے بالکل نزدیک پہنچ جایا جائے اسے بہت قریب سے دیکھا جائے لیکن وہ حیرت کدہ جسے میں ابھی چھوڑ کر آ رہا تھا۔ مجھے دوسرے احساسات کے جال میں نہیں پھنسنے دے رہا تھا، میں اسے دیکھتا رہا، تب وہ آہستہ سے بولی۔
''میں تمہارے ہی لیے اس قہوہ خانے میں پہنچی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ تم دیکھو۔ مجھ سے ملنے کی آرزو کرو۔ اس طرح میری مشکل آسان ہو سکتی تھی۔ اپنے طور پر مجھے تم سے مخاطب ہونے کی اجازت نہ تھی۔''
''میں اب بھی نہیں سمجھا؟'' میں نے کسی حد تک خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
''بیٹھ جاؤ۔ تم ایک بالکل دوستانہ ماحول میں ہو۔ یہاں تمہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں میں تم سے مدد چاہتی ہوں تم میری اُمیدوں کا واحد مرکز ہو۔''
''اوہ...... کمال کی بات ہے، لیکن میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔ اس سے قبل میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا اور میں تمہاری اُمیدوں کا مرکز بھی بن گیا۔''
''ہاں...... بعض اوقات حالات کچھ اس طرح ہوتے ہیں۔ میں اگر تمہیں اتنا بتا دوں کہ میں اس وقت بھی تم سے ملنے کی مشتاق تھی اور تمہاری متمنی تھی۔ جب تم جیل میں تھے۔ میں تمہاری رہائی کا انتظار کر رہی تھی اور تمہیں اپنی مدد کے لیے آمادہ کرنے کی خواہش مند تھی۔''
''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔'' میں نے سوال کیا۔
''اگر دوستوں کی طرح بیٹھ جاؤ تو کیا حرج ہے۔'' اس نے کس قدر شکایتی انداز میں کہا، ایسی اپنائیت تھی اس کے انداز میں جیسے وہ برسوں سے میری شناسا ہو لیکن میں نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اگر وہ اس سے قبل بھی میری نگاہوں میں آجاتی تو میں کبھی اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ پھر یہ کون ہے؟ جو اس طرح میری شناسا بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے کیسی امداد چاہتی ہے میں سوچتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کرسی میرے نزدیک کھسکائی اور اب وہ مجھ سے صرف چند منٹ کے فاصلے پر تھی۔
''میرا نام اناطورہ ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے یہ نام پہلے بھی سنا ہو۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس دُبلے پتلے شخص نے جو قہوہ خانے میں مجھے ملا تھا۔ میرے سامنے یہ نام لیا تھا اور اس کے علاوہ تھوڑی دیر قبل اس زرنگار تخت پر بیٹھے ہوئے شخص نے بھی یہ نام اپنی زبان سے لیا تھا۔ میں سحرزدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔
''اناطورہ۔''
''ہاں...... اناطورہ، میرا محبوب گم ہو گیا ہے۔ مجھے

اوسیانوس کی تلاش ہے۔'' ایک بار پھر میں چونک پڑا یہ نام بھی میں نے اسی پُراسرار دربار میں سنا تھا۔ میں بدستور اسے دیکھتا رہا۔
''اوسیانوس مجھ سے بچھڑ گیا۔ میں اس کے بغیر اس کائنات میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہوں، سمندر ہمارے راستے میں مزاحم ہے، مجھے گہرے پانیوں میں جانے کی اجازت نہیں۔ میں تو بے دست و پا ہوں کوئی ایسا دل والا درکار ہے۔ مجھے، جو میری مدد کرے، سنا تم نے قدیم مصر کی اس عجیب دور کی داستان ہوں میں۔ جب رابعلوس مصر پر حکمران تھا، فرعون نہم میں اس دور کی ایک غمزدہ عورت ہوں۔''
''کیا مطلب...... کیا مطلب۔'' تم اس دور میرا مطلب ہے اب......اب۔''
''آہ...... میرے دوست میرے ہمدم، تم توجہ سے میری داستان سنو۔ تو میں تمہاری ممنون ہوں گی اس کے بعد اگر تمہارا دل چاہے تو میری مدد کرنا اس کے بعد میں تمہیں مجبور نہ کر سکوں گی اور ہاں...... اگر تم نے میرے ساتھ یہ مہربانی کی تو میں تمہیں اس کا صلہ دوں گی...... تم یقین کرو مجھے تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے۔''
''مم مگر...... میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں اور یہ ڈرامہ...... یہ کہانی...... میرا مطلب ہے۔ ت نے...... تم نے جو یہ سب کچھ کہا ہے وہ میرے لیے بڑا عجیب اور انوکھا ہے۔''
''مجھے احساس ہے، لیکن میں کیا کروں، یہ سب کچھ حقیقت ہے ایک ٹھوس حقیقت جو صدیوں پہلے گزر چکی ہے۔''
''مگر تم نے کہا تم، صدیوں سے زندہ ہو......؟ میرا مطلب ہے کہ تم اس شکل میں......''
''ہاں میں صدیوں سے تڑپ رہی ہوں۔ صدیوں سے سسک رہی ہوں۔ صدیوں سے بے قرار ہوں۔ مجھے کوئی راستہ نظر آتا تھا۔ کوئی نہیں ملتا تھا۔ مجھے، جو مجھے میرا محبوب لوٹا دے۔ بہت عرصے کے بعد تم سے میں نے یہ آس لگائی ہے۔ مجھے مایوس نہ کرو۔ میرا محبوب مجھے لوٹا دو۔'' میں حیرتناک نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا پھر میں نے اس سے پوچھا۔
''تمہارا محبوب کہاں ہے؟''
''سمندر کی گہرائیوں میں ظالموں نے اسے اتنی دور پھینک دیا ہے کہ میں اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ آہ...... میری بدنصیبی نے اسے مجھ سے اتنی دور کر دیا ہے کہ اب میں اس کا خیال بھی ذہن میں نہیں لا سکتی۔'' اس کے منہ سے سسکیاں نکلنے لگیں اور میں پریشانی سے سر کھجانے لگا۔
کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی، میرے ذہن میں اُلجھنوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے اس لڑکی سے یا اس روح سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ نہ ہی میں لڑکیوں سے خاص طور سے خوبصورت لڑکیوں کی مدد کرنے کا خواہش مند جذباتی نوجوان تھا۔ میں تو کسی اور ہی مقصد کے تحت یہاں آیا تھا، پانچ سال کی بھوک پیاس جاگ اُٹھی تھی اور واسطہ ایک روح سے پڑ گیا۔
''لیکن روحوں کے جال سے نکلنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ میرے دل میں اس وقت صرف ایک خواہش تھی۔ کسی طرح اس جنجال سے نکل جاؤں اور کوئی جگہ تلاش کر کے سکون کی پہلی رات گزاروں۔ جو مجھے پانچ سال کے بعد نصیب ہوئی۔ روتی ہوئی لڑکی نے نگاہیں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔
''تمہیں مجھ پر رحم نہیں آیا۔ کیا تم واقعی میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔''
''مگر...... محترمہ...... میرا مطلب ہے روح صاحبہ! میں آپ کی کیا مدد کروں۔ کون ہے آپ کا محبوب اور کہاں ہے...... میرا مطلب ہے۔ اوسیانوس کو میں کون سے سمندر کی گہرائیوں میں تلاش کروں۔''
''میں تمہیں وہاں لے جاؤں گی۔ تمہیں وہ جگہ بتاؤں گی جہاں اوسیانوس سمندر کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ تم

ایک ماہر غوطہ خور ہو۔ اگر تم چاہو تو یہ سب کچھ کر سکتے ہو۔“
”خوب‘ آپ نے میرے بارے میں کافی معلومات حاصل کی ہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔
”ہاں یہ حقیقت ہے۔“
”مگر اوسیانوس سمندر کی گہرائیوں میں کیسے پہنچ گیا۔“
”جو کچھ تم دیکھ چکے ہو۔ وہ کہانی کا ایک حصہ تھا۔ اگر تم اجازت دو تو میں تمہیں اس داستان کی دوسری کڑی سناؤں۔“
”سنا دو۔“ میں نے ڈھیلے لہجے میں کہا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے یہ رات میرے لیے۔ نحوست کی رات ہو۔ تمام خواہشیں خاک میں مل گئی تھیں۔ وہ چند لمحات مجھے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔
”میرا نام اناطورہ ہے۔ قدیم مصر کے ایک تاجر کی بیٹی ہوں‘ رابعلوس نے مجھے جشن کے موقع پر دیکھا اور دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ مجھے اپنے حرم میں داخل کرے گا۔ جب کہ میں اپنے غمزدہ اوسیانوس سے محبت کرتی تھی اور میں نے اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ہماری محبت کی راہ میں کوئی مشکل نہیں تھی اور کچھ عرصے کہ بعد ہم یکجا ہونے والے تھے لیکن ہماری بد بختی کہ میرے تاجر باپ کو رابعلوس کا پیغام ملا اور وہ مسرت سے دیوانے ہوگئے۔ وہ تاجر تھے اور شہنشاہ وقت کی قربت انہیں۔ دولت مند سے دولت مند ترین بنا سکتی تھی۔
اس لیے وہ پرانے وعدے بھول گئے اور انہوں نے اس پیغام کا جواب دے دیا۔ انہوں نے کہا یہ ان کی خوش بختی ہے کہ انہیں اور ان کی بیٹی کو یہ مرتبہ مل رہا ہے۔
ایک وقت مقرر ہوگیا اور انہوں نے مجھے سجا بنا کر رابعلوس کی خلوت میں پہنچادیا۔ میں تڑپتی سسکتی گئی تھی۔ اوسیانوس دیوانہ ہوگیا تھا۔ وہ رابعلوس کے محل میں گھس گیا۔ وہ اس وقت اس کی خلوت میں پہنچ گیا۔ جب وہ میری جانب بڑھ رہا تھا۔

اس نے چیخ چیخ کر رابعلوس سے کہا کہ اناطورہ اس کی محبوبہ ہے ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ غضبناک شہنشاہ نے اسے گرفتار کرا دیا۔ میں اوسیانوس کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اوسیانوس کو گرفتار کرا کے وہ میری جانب راغب ہوا۔ تو میں نے نفرت سے اس پر تھوک دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے محبوب کی امانت ہوں۔ اس کے بعد اس نے مجھے نہیں چھوا لیکن پھر اس نے اوسیانوس کو رہا کرا دیا اور سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔
سیانوس پاگل ہوگیا تھا۔ دوسری طرف میں قید تھی۔ پھر ایک دن اوسیانوس فرعون کے دربار میں گھس آیا اور رابعلوس نے برگشتہ ہو کر اسے جالودہ کے گہرے غاروں میں پھنکوا دیا۔ میرا اوسیانوس میرے لیے جان دے چکا تھا۔
رابعلوس نے مجھے تڑپانے کے لیے اوسیانوس کی موت کی کہانی سنائی اور میرا دل ڈوب گیا۔ میں نے ایک ترکیب سوچی اور میں نے رابعلوس سے کہا کہ مجھے ان لغو باتوں پر یقین نہیں۔ اس پر رابعلوس نے تیاریاں کیں اور مجھے لے کر جالودہ کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر اس نے مجھے وہ غار دکھائے۔ جس میں اوسیانوس کو پھینکا گیا تھا۔ میں تو خود یہ ہی چاہتی تھی۔
میں نے اوسیانوس کا نام لے کر گہرائی میں چھلانگ لگادی اور اپنے اوسیانوس سے جاملی۔ اس نے میرا وہاں استقبال کیا تھا۔ رابعلوس کو گمان بھی نہ تھا کہ میں اس طرح جان دے دوں گی۔ وہ بھونچکا رہ گیا لیکن اس نے اس ناکامی کو قبول نہ کیا۔ اس نے ہماری لاشوں کو غاروں سے نکلوا کر حنوط کرلیا اور ہمیں اپنے محل کے صنم خانے میں رکھوا دیا لیکن یہ ہمارے لیے اور بہتر تھا۔ اب ہماری روحیں یکجا تھیں۔ جو کام زندگی میں نہیں ہوسکا تھا۔ وہ موت کے بعد ہوگیا تھا۔ ہم مل گئے تھے۔
لیکن پھر حالات بدلے‘ رابعلوس کی حکومت زوال

پذیر ہوگئی۔ اس کی جگہ کسی اور نے لے لی۔ تطہیر نو ہوئی۔ ہماری حنوط شدہ لاشوں کو ایک کشتی میں لدوا کر کہیں اور بھجوا دیا گیا۔ راستے میں اس جہاز پر بحری قزاقوں نے حملہ کیا خوفناک خونریزی ہوئی توڑ پھوڑ ہوئی اور اوسیانوس کی ممی سمندر میں گر گئی۔ وہ مجھے چھوڑ کر سمندر کی گہرائیوں میں چلا گیا۔ کشتی ایک جزیرے سے جالگی اور سمندر کی لہروں نے اسے خشکی پر پھینک دیا۔ اس طرح ہم دونوں جدا ہوگئے ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے‘ اس کی سسکیاں پھر اُبھرنے لگیں۔
میں حیرت سے اس انوکھی داستان کو سُن رہا تھا۔ پھر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”تو اب کیا چاہتی ہے؟“
”میری خواہش ہے کہ تم...... تم اوسیانوس کو سمندر سے نکال لو......“
”مگر کس طرح؟“
”میں تمہارے بارے میں جانتی ہوں۔ مجھے علم ہے کہ تم یہ سب کچھ کر سکتے ہو۔ تمہیں سمندر کا تجربہ ہے۔ مجھے معاف کرنا تم اسمگلر ہو۔ تمہارے تعلقات بھی ایسے لوگوں سے ہیں۔ جو تمہارے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں اور تم ایک ماہر غوطہ خور ہو۔ تم یہ سب کچھ کر سکتے ہو۔ اگر تم کرنا چاہو؟“
”تمہیں میرے بارے میں اس قدر معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔“ میں نے تعجب سے پوچھا۔
”ایک فرماں نصیب کے دل کا حال تم کیا جانو‘ میں کیا کیا کرتی رہی ہوں۔ کیا بتاؤں؟“
میں تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”تم مجھے سوچ کر فیصلہ کرنے کا موقع دو۔“
”تم...... تم مجھ سے مخلص نہیں ہو۔ تم میری مدد کرنا نہیں چاہتے۔“
”نہیں...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو۔“
”سنو میرے ساتھ آؤ...... اٹھو میرے ساتھ آؤ۔“ اس

نے کہا اور میں اُٹھ کر اس ہال کے بیرونی دروازے سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ مجھے لیے ہوئے ایک اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ کمرہ خالی تھا۔ اس کا فرش ننگا تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ قدیم طرز کا ایک چوبی صندوق رکھا ہوا تھا۔
اناطورہ نے آگے بڑھ کر صندوق کا ڈھکن اُٹھادیا اور میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ صندوق میں ایک عظیم خزانہ موجود تھا‘ قدیم طرز کے زیورات سونے کے سکے‘ جواہرات نجانے کیا کیا میری آنکھیں پھیل گئیں۔
”یہ خزانہ اس دخانی کشتی میں موجود تھا اور اس کے ساتھ ہی ساحل سے جالگا۔ بحری قزاق اسی کے حصول کے لیے کشتی پر حملہ آور ہوئے تھے لیکن اسے حاصل نہ کر سکے اور مارے گئے‘ چناں چہ یہ بھی ساحل سے جالگا اور آج بھی یہیں موجود ہے۔
”کہاں؟“ میں تعجب سے بولا۔
”لیکن یہ...... لیکن یہ۔“ میں نے حیرت سے کہا اور دوسرے لمحے صندوق میری نظروں سے اُوجھل ہوگیا وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا‘ میں ہکا بکا سا آنکھیں پھاڑے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
”یہ صرف اس کی تصویر تھی اور میں نے تم سے غلط نہیں کہا یہ سب کچھ تمہارا ہوسکتا ہے۔ میری مدد کرو تمہیں اس سے زبردست مالی فائدہ بھی حاصل ہوگا۔
”میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا۔ کہ جو کچھ میرے سامنے آیا ہے۔ ایک ٹھوس حقیقت رکھتا ہے۔
وہ اُمید وبیم کی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور کسی روح کے لیے کوئی کام میری عقل وفہم سے باہر تھا۔ تاہم میں جس طلسم کدے میں آ پھنسا تھا۔ اس سے نکلنے کا اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کہ میں اسے دلاسہ دوں اور یہاں سے فرار ہوجاؤں۔ بھلا میں کس طرح روح پر اعتبار کرسکتا تھا۔ قدیم مصر کا یہ جنجال میرے گلے پڑ گیا تھا۔ بہر طور اس سے نکلنا تو تھا۔ میں نے آنکھیں بند

کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن تم مجھے سوچنے کا موقع تو دو گی“

”یقیناً یقیناً، اگر تم سوچنا ہی چاہتے ہو۔ تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ایک بار پھر میری درخواست ہے کہ میری اس طلب کو پورا کر دو۔ میں تمہاری احسان مند رہوں گی۔“

”میں جانا چاہتا ہوں۔“

”ضرور مجھے کب جواب دو گے۔“

”کل تک۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں انتظار کروں گی تمہارا میں خود تم سے ملاقات کرلوں گی۔ میں پوچھ لوں گی تم سے کہ تم نے کیا فیصلہ کیا۔“ میں نے بادل خواستہ گردن ہلادی۔

تب وہ مجھے اس مکان کے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ جب میں دروازے سے باہر نکل آیا۔ تو مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس طلسمی جال سے باہر نکل آیا ہوں میں نے اس دروازے کو متحیرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ جس میں وہ کھڑی مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔ حسن و جمال کا پیکر، ایسی حسین کہ دل سینے سے نکل کر باہر آ جائے لیکن وہ زندہ نہ تھی اس نے میری رنگین رات برباد کر دی تھی۔

پانچ سال بعد میں نے زندگی کو دلچسپیوں کا حامل کرنا چاہا تھا لیکن تقدیر نے یہ تماشہ دکھایا تھا۔ چند قدم تو میں اس طرح چلتا رہا۔ جیسے ایک پُرسکون آدمی جو پورے طور پر مطمئن ہو اور چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھتا ہے لیکن جوں ہی وہ دروازہ نگاہوں سے اوجھل ہوا۔ میں نے اپنی پوری قوت سے دوڑ لگائی۔ اتنی تیز دوڑ کے اس سے پہلے میں کبھی اتنا تیز نہیں دوڑا تھا۔ آن کی آن میں قاہرہ کی گلیوں اور سڑکوں سے گزرتا ہوا۔ چوڑی سڑک پر آ گیا جو پُررونق تھی۔

میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا اور مجھے یقین اب بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں بچ گیا ہوں۔ بہر طور میں اپنی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ بقیہ رات میں نے ایک شبینہ کلب میں گزاری تھی۔ میری ذہنی حالت درست نہیں تھی۔ کھانے پینے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ چناں چہ برانڈی کے چند پیگ لیے اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح کی آمد آمد ہوئی تو کلب کے پروگرام ختم ہو گئے اور میں سست روی سے اُٹھ آیا۔ میرے پاس اب بھی اچھی خاصی کرنسی موجود تھی، یہ وہ کرنسی تھی۔ جو جیل جانے سے پہلے میرے پاس تھی اور اسے جیل کے مال خانے میں جمع کر دیا گیا تھا۔ جب مجھے رہائی ملی تو یہ کرنسی مجھے واپس کر دی گئی۔ بہر طور یہ اتنی تھی کہ اب بھی میرے بہت کام آ سکتی تھی اور پھر مجھ جیسے آدمی کے لیے دولت کا حصول زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میرا بڑا کام تو اسمگلنگ ہی تھا لیکن چھوٹے موٹے بھی مجھے کئی دھندے آتے تھے، مثلاً شارپنگ بھی کر لیتا تھا۔ اگر زیادہ ضرورت پیش آ جاتی تو کسی کی جیب بھی صاف کر سکتا تھا۔ یا کسی دوکان میں نقب لگا کر ضروریات زندگی کی چیزیں بھی حاصل کر سکتا تھا لیکن فی الوقت اس کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پناہ لی، کمرہ حاصل کر کے میں بستر پر جا لیٹا اور اس طرح سویا کہ رات ہی کو آنکھ کھلی پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ پورا دن کس طرح گزرا۔

رات کو بھی طبیعت کسل مندی ہی تھی۔ حالاں کہ اچھی طرح غسل کیا تھا لیکن ذہن و دل پر بوجھ طاری تھا۔ اداسی روح پر مسلط تھی بار بار اس کا تصور میری آنکھوں میں آ جاتا اور میں اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا تھا۔

بہر طور میں نے یہ ہی فیصلہ کیا کہ اس اُلجھن کو دور کرنے کے لیے کسی کی معیت حاصل کی جائے اور اسی ہوٹل کے ایک ویٹر نے میری یہ اُلجھن دور کر دی۔

لڑکی زیادہ حسین تو نہ تھی لیکن مجھے مصر کی لاتعداد حسیناؤں میں سے ایک نظر آ رہی تھی کیوں کہ وہ پانچ سال کے بعد مجھے ملی تھی۔

لڑکی کے ساتھ تقریباً تین بجے تک جاگتا رہا۔ دن میں سوتا رہا۔ اس لیے آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ بہر طور وہسکی کے نشے نے مجھے سلا دیا اور جب میں صبح جاگا تو لڑکی جا چکی تھی۔

میں نے اپنا مختصر سامان دیکھا۔ جوں کا توں موجود تھا۔ میں نے ناشتہ طلب کیا اور ناشتے سے فارغ ہوا تو وہ پھر ذہن پر مسلط تھی۔ وہ قاہرہ ہی میں ہے اور مجھ سے جواب کی منتظر ایک روح کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ جائے۔ چناں چہ قاہرہ میں رہنا مناسب نہیں۔ یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ میں اس سلسلے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ پاسپورٹ ختم ہو چکا تھا لیکن اس کی تجدید کرائی تھی چناں چہ آج میں نے اس کام کو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہوٹل سے نکل آیا۔

پاسپورٹ کی فیس وغیرہ بھری۔ دو دن کے بعد مجھے بلایا گیا تھا اور یہ دو دن میں نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب وہ میرے سر پر آ مسلط ہو گی اور مجھ سے جواب طلب کرے گی۔ میں اسے کیا جواب دوں گا۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ مجھ سے دور رہی کوئی جواب نہیں مانگا تھا۔ اس نے مجھ سے پھر میرا پاسپورٹ بھی مل گیا۔ تو میں نے یہاں سے نکلنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی اور پانچویں دن میں یہاں سے ایران جا رہا تھا۔

طیارے نے جب ائرپورٹ چھوڑ دیا اور ہم مصر کی سرزمین سے نکل آئے تو میں نے سکون کی گہری سانس لی اور آنکھیں بند کر کے ان واقعات پر غور کرنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ یہ سب کیا ہے۔ بہر طور مصر کی پُراسرار کہانیاں آج بھی ہمارے عالم میں گشت کرتی ہیں اور وہ لوگ جو پُراسراریت کے رسیا ہیں۔ ان حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے مصر ہی کا رُخ کرتے ہیں لیکن مجھے بڑا انوکھا تجربہ ہوا تھا۔ میں اسے خوفناک تو نہیں کہہ سکتا کیوں کہ مجھے کوئی جسمانی تکلیف تو نہیں ہوئی تھی لیکن میں ذہنی طور پر بڑا خوفزدہ ہو گیا تھا۔

ایران حسب معمول تھا۔ میں پہلے یہاں آ چکا تھا، میں نے اپنے پسندیدہ ہوٹل میں قیام کیا۔ اس ہوٹل کی حسین شامیں بہترین ہوا کرتی تھیں بہت عرصے پہلے تقریباً اس میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ دیواروں پر بنی ہوئی تصاویر بھی جوں کی توں تھیں۔ مجھے یہاں کمرا حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی اور میں اس کمرے میں مقیم ہو گیا۔

ایران میں میرے چند شناسا تھے۔ جنہیں میں دوسرے دن تلاش کرنے کے لیے نکل گیا لیکن ان میں سے کوئی نہ ملا۔ سب ہی کہیں نہ کہیں گئے تھے۔ آٹھ سال بہت ہوتے ہیں اور اس وقت میں ایک اور خوبصورت ایرانی ہوٹل طباق میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ایک ویٹر نے مجھے ایک پرچہ لا کر دیا۔ میں نے متحیرانہ نگاہوں سے ویٹر کو دیکھا اور سوال کیا۔

”کس کا ہے یہ پرچہ؟“

”ایک خاتون ہیں جو سامنے والے کیبن میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے یہ پرچہ آپ کے لیے بھیجا ہے۔“ ویٹر نے جواب دیا اور میں نے سامنے والے کیبن کی طرف نظریں دوڑائیں۔

”کیبن کا پردہ کھنچا ہوا تھا اور اس میں کوئی موجود نہیں تھا۔ تاہم میں نے پرچہ کھول کر دیکھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا۔

”ایک حرماں نصیب کا سلام۔“

قاہرہ چھوڑ دیا۔ مگر مجھے جواب نہیں دیا۔ میں جواب کی منتظر ہوں۔“

میرا ذہن بھک سے اُڑ گیا تھا۔ میری سہمی ہوئی نگاہیں۔ بار بار اس کیبن کی جانب اُٹھ رہی تھیں۔ پھر ایک بار پردہ ہلا اور میں نے جو کچھ دیکھا۔ اس نے مجھے مبہوت کر دیا۔

سیاہ لباس میں ملبوس وہی حسینہ بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

ہاں...... وہ انا طورہ ہی تھی۔ پردہ ہوا کے جھونکے سے ہٹا تھا۔ برابر ہو گیا لیکن میرے ہاتھ پیروں سے جان نکل گئی تھی۔ اب کیا کروں کیا جواب دوں اُسے؟

میں احمقوں کی طرح سوچتا رہ گیا۔ ویٹر نے چند لمحات انتظار کیا اور پھر چلا گیا۔ کافی دیر پریشان رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھا اور لرزتے قدموں سے اس کیبن کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اس سے ملاقات کروں اور کوئی عذر پیش کروں۔ حالاں کہ میری مجرمانہ کارروائی صاف ظاہر تھی کہ میں قاہرہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے کیبن کا پردہ سرکایا لیکن ایک بار پھر حیرت کا جھماکا ہوا۔ کیبن میں کوئی نہیں تھا۔ کیبن خالی تھا البتہ وہاں ایک عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

ایک مانوس سی خوشبو جس کے بارے میں پہلے میں نے نہیں سوچا تھا لیکن اب صاف ظاہر تھا کہ یہ خوشبو اس کے بدن کی خوشبو تھی۔ آہ...... وہ میرے پیچھے یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ اب کیا کروں؟"

ریستوران کا بل ادا کر کے میں باہر نکل آیا۔ ایران اچانک میرے لیے غیر دلچسپ ہو گیا تھا۔ اوّل تو یہاں کوئی دوست نہیں ملا تھا۔ دوسرے وہ یہاں بھی پہنچ گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کہیں بھی پہنچ سکتی ہے۔ وہ میرا تعاقب کر رہی ہے۔ وہ میرا پیچھا کر رہی ہے۔ یہ تو مناسب نہیں ہے۔ یہ تو مناسب نہیں ہے۔ میں اس روح کے جال سے کس طرح نکلوں۔

میں خوفزدہ انداز میں سوچ رہا تھا۔ ہوٹل میں اپنے کمرے میں پڑا ہوا میں انہی حالات پر غور کر رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ایران سے بھی بھاگ جاؤں۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ میں اس روح کے جال میں پھنس کر اس کی ہدایتوں پر عمل کروں۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ میں کیسے ایسے جھنجٹ میں پھنس سکتا ہوں اور پھر کیا کہا جا سکتا تھا کہ اس طلسم کدے کی حقیقت کیا ہے ایران میں، میں نے ہندوستان کا ویزہ حاصل کر لیا۔ بین الاقوامی پاسپورٹ کی وجہ سے مجھے ان تمام کاموں میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی ضرورت کے لیے میں نے ایرانی کرنسی حاصل کر لی تھی۔ جو ایک کرم فرما کی جیب میں اچھی خاصی تعداد میں موجود تھی۔

بہر طور میں وہاں سے چل پڑا۔ میں نے بھارت کا رُخ کیا اور اس بڑے ملک کے ایک خوبصورت ہوٹل میں قیام کیا لیکن دل مضطرب تھا۔ حالاں کہ پُرکشش ہندوستان کے اس حسین بڑے شہر کے بارے میں کئی بار میں نے سوچا تھا لیکن یہاں پہنچ نہیں سکا تھا ایران سے یہاں آنے کے بارے میں نے اس لیے سوچا کہ تھوڑی تفریح بھی ہو جائے گی اور میری خواہش بھی پوری ہو جائے گی، ممکن ہے۔ وہاں پر مجھے اس جنجال سے نجات مل جائے۔

یہاں کے شب و روز بہت عمدہ تھے۔ پندرہ دن ہو گئے تھے مجھے یہاں اور میرا خوف آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ روح چکمہ کھا گئی ہے اور یہاں تک میرے پیچھے نہیں آئی۔

جس ہوٹل میں میرا قیام تھا وہ اس شہر کے حسین ترین ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا اور یہاں قیام میں مجھے کوئی دقت نہیں تھی۔ ہر چند کہ یہاں میرے شناسا نہیں تھے لیکن دولت شناسا پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے چند لوگوں سے رابطہ قائم کر لیا اور میری راتیں رنگین ہونے لگیں۔

میں ابھی تک دلی جمعی سے اپنے لیے کوئی پروگرام نہیں بنا سکا تھا لیکن اب میں سوچنے لگا کہ مجھے کوئی کام کرنا چاہیے اور اس کام کے لیے میں نے اپنے شکار تلاش کرنا شروع کر دیے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہاں سے ہانگ کانگ جاؤں گا اور ہانگ کانگ سے پھر کوئی اور پروگرام ترتیب دوں گا۔ چناں چہ میں اس کی تیاریاں کرنے لگا۔

لیکن کہیں بھی خالی ہاتھ جانا بے وقوفی تھی۔ چناں چہ کچھ نہ کچھ لے جانے کا بندوبست کرنے لگا اور یہ ہی میرا

دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس رات میں بے حد خوش تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کل سے اپنے اس نئے کام کا آغاز کروں گا۔

ٹیلی ویژن میرے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے ٹی وی کھول لیا۔ بلیک اینڈ وائٹ پروگرام تھے۔ میں بیٹھ کر پروگرام دیکھنے لگا۔ چند منٹ تک تو اشتہارات آتے رہے۔ پھر اناؤنسر ٹیلی ویژن پر نظر آئی، اس نے ٹیلی ویژن پر کسی ڈرامے کا اناؤنسمنٹ کیا اور میں دلچسپی سے سگریٹ سلگا کر مسہری پر دراز ہو گیا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کیا ڈرامہ ہے۔ چند ہی لمحات کے بعد یہ ڈرامہ شروع ہو گیا لیکن اس میں مصر دیکھ کر میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ ان کم بختوں نے بھی یہ ہی مصیبت شروع کر دی تھی۔ جسے دیکھ کر مجھے بخار چڑھتا تھا۔

نجانے کیا کنٹری شروع ہو چکی تھی۔ پیچھے سے پھر ایک اہرام کا دروازہ کھلا۔ اس دروازے سے ایک پُراسرار شخصیت باہر نکلی۔ سیاہ لباس میں ملبوس اور میرے ہاتھوں سے سگریٹ گر گئی۔ چال ڈھال جسامت سب کچھ وہی تھا اور چند لمحات کے بعد وہ میرے سامنے آ گئی۔

"میرا محبوب مجھے لوٹا دو۔ خدا کے لیے میرا محبوب مجھے لوٹا دو...... مجھے واپس کر دو۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور میرے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ میں دہشت زدہ ہو کر مسہری سے نیچے اُتر آیا۔

"کہاں جاؤ گے۔ کہاں تک بھاگو گے؟ میں تمہارا تعاقب کرتی رہوں گی۔ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی، کہاں جاؤ گے۔ تم میری اُمیدوں کا واحد مرکز ہو۔ ٹیلی ویژن کے آرٹسٹ نے کہا۔

لیکن یہ آرٹسٹ نہ تھی۔ یہ وہی تھی بالکل وہی، وہی سلگتا ہوا چہرہ وہی گداز بدن وہی رسیلے ہونٹ جو دل کو کھینچنے کی قوت رکھتے تھے لیکن میرے لیے بہت بھیانک تھے۔

"میری یہ آخری تمنا پوری کر دو۔ تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" وہ میری طرف رُخ کر کے کہہ رہی تھی اور میرا دل دھڑکنا بھولتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں تاریکی سی چھاتی جا رہی تھی اور پھر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ٹی وی سے آوازیں اُبھرتی رہیں لیکن ان میں سے کوئی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

کیا اب میں خود کو فریب دوں۔ وہ میرا تعاقب کرتی ہوئی یہاں تک آ گئی تھی۔ آہ...... آہ۔ اب مجھے فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ بھاگ جاؤں گا میں یہاں اور دوسرے دن یہاں سے چلنے کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔ میں نے اپنا مشن ادھورا چھوڑ دیا تھا اور بس اب اسکاٹ لینڈ میرے ذہن میں رہ گیا تھا۔ چناں چہ میں اسکاٹ لینڈ کے لیے چل پڑا۔

ذہن و دل کی حالت ٹھیک نہ تھی۔ کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا عجیب مخمصے میں پڑ گیا تھا۔ اچھی خاصی زندگی کو گھن لگ گیا تھا۔ درحقیقت تقدیر ہی خراب تھی۔ پچھلے پانچ چھ سالوں سے پریشانیوں کا شکار تھا۔ زندگی کے پورے پانچ سال اس طرح گنوا بیٹھا تھا۔ جیسے کہ وہ کوئی حیثیت ہی نہ رکھتے ہوں۔ یہ پانچ سال میری زندگی سے اس طرح خارج ہو گئے تھے کہ اور اب یہ نئی مصیبت گلے آ گئی تھے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا کرنا چاہیے تھا کیا اس کی پیش کش قبول کر لوں لیکن عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔ میں کیا کروں گا۔ کیسے کروں گا۔ یہ سب کچھ میرے لیے بہت مشکل تھا۔

اسکاٹ لینڈ میں بھی ایک ہوٹل میں میرا قیام ہوا اور میں نے شراب میں خود کو غرق کر لیا اور زیادہ سے زیادہ پیتا رہتا تھا تا کہ اس منحوس خیال سے چھٹکارا نصیب ہو سکے۔ درحقیقت شراب میرے ذہن و دل کو اس طرف سے پلٹا دیتی تھی اور میں اس میں غرق ہو کر کچھ لمحات پُرسکون بنا لیتا تھا لیکن اتنی شراب مجھے نقصان بھی دیتی۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا۔

اسکاٹ لینڈ بین الاقوامی شہر گوناں گوں دلچسپیوں کا

مظہر تھا۔ یہاں تفریحات کی کمی نہیں تھی۔ نائٹ کلب، شبینۂ بار اور نہ جانے کیا کیا۔ میں عموماً کسی بار میں بیٹھ کر وقت گزارتا تھا۔ پھر ایک دن میرا رُخ ایک نائٹ کلب کی طرف ہوگیا۔ میں نے کلب کا ٹکٹ حاصل کیا اور اندر جا بیٹھا۔ رقص و موسیقی کے پروگرام کے ساتھ ساتھ دوسری تفریحات بھی جاری تھی۔ مختلف رقص ہو رہے تھے۔

رقاصائیں اسٹیج پر آتیں، رقص کرتیں گانے گاتیں اور چلی جاتیں۔ میں ان تمام تفریحات کے ساتھ شراب نوشی بھی کرتا جا رہا تھا لیکن اعتدال کے ساتھ میں نے پچھلے دو تین دنوں سے خود کو سنبھالا تھا اور اپنی صحت بہتر کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس طرح تو میں اپنی زندگی کے بہت سے سال ضائع کرلوں گا۔ یہ مناسب نہیں تھا۔ مجھے کوئی فیصلہ کرنا چاہیے، کسی مناسب فیصلے پر پہنچنا چاہیے۔

رقاصائیں رقص پیش کر رہی تھیں۔ پھر اسٹیج پر تاریکی پھیل گئی۔ اناؤنسر نے کوئی اناؤنسمنٹ کیا۔ جس پر میں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ میں تو اس وقت اس ویٹرس کو دیکھ رہا تھا جو بہت پُرکشش اور گداز بدن کی مالکہ تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس سے گفتگو کروں۔ کہ وہ میری رات کی تنہائی کو دور کردے۔

ویٹرس مقامی ہی تھی۔ اس کا حصول میرے لیے مشکل نہیں تھا لیکن اچانک ہی موسیقی شروع ہوگئی اور میرا ذہن و دل جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ یہ موسیقی میں سُن چکا تھا۔ ہاں اس طلسم کدے میں۔ جس میں فرعون رااِعلوس کو میں اپنے سامنے سامنے دیکھ چکا تھا۔

میری سحر زدہ نگاہیں۔ اسٹیج کی جانب اٹھ گئیں۔ اسٹیج پر اہرام کے مناظر نظر آرہے تھے اور پھر ان اہراموں میں سے ایک رقاصہ نکل آئی۔ آہ یہ رقاصہ وہی تھی۔ وہی تھی۔ اس کا چہرہ ایک نقاب میں چھپا ہوا تھا لیکن اس کا بدن تھرک رہا تھا۔ اس طرح تھرک رہا تھا کہ اس پر نگاہیں جمانا مشکل ہوجائے دیکھنے والے دلچسپ نگاہوں سے اس رقص کو دیکھ رہے تھے لیکن میری حالت بہت خراب تھی۔ رقص کرتے کرتے وہ رقاصہ عروج پر پہنچ گئی۔ تو اس نے اپنا نقاب چہرے سے ہٹا دیا اور میرے حواس پر بجلی سی گری۔

"وہی تو تھی۔ ہاں وہی تھی۔ وہاں یہاں بھی پہنچ گئی تھی میری گردن کرسی سے جا لگی میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے رقص کو دیکھتا رہا۔ وہ دنیا وَمافیہا سے بے خبر وحشیانہ رقص کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر نہیں تھیں لیکن اس کے اعضاء ہاتھ پاؤں عجیب سے انداز میں حرکت کر رہے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر جنبش کی ایک آواز ہو۔ ایک زبان ہو۔ وہ مجھ سے وہی مطالبہ کر رہی ہو۔ مجھ سے اپنا مطالبہ دوہرا رہی ہو۔

دفعتہً رقص رُک گیا۔ موسیقی تھم گئی رقاصہ جھکی اور پردہ کھینچ گیا۔ ہال میں روشنی تیز ہوگئی اور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہا تھا تو یہ میرا دوست مائیکل ہی ہے۔ کیا میں نے غلط کہا۔" میں نے اس آواز پر چونک کر دیکھا۔ یہ میرا بہترین دوست ایلس تھا۔

ایک عظیم جعلساز جو بین الاقوامی شاطر تھا اور ساری دنیا میں ہنگامے کرتا پھرتا تھا۔ میری اس سے تقریباً نو سال قبل ملاقات ہوئی تھی۔ نو سال سے وہ میری نگاہوں سے روپوش تھا لیکن اس میں ذرا فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہی گٹھا ہوا بدن ویسی ہی چمکدار آنکھیں وہی دمکتا ہوا چہرہ۔ میں بے اختیار کھڑا ہو کر اس سے لپٹ گیا۔

"آہ...... ایلس، ایلس، کتنے عرصے کے بعد تم مجھے نظر آئے ہو۔"

"اور اگر یہی میں تم سے کہوں، تو......" ایلس نے کہا۔

"میرے ساتھ تو بہت غلط سلوک ہوگیا تھا۔ ایلس، میں نے تو پانچ سال قاہرہ جیل میں گزارے ہیں۔"

"واہ یہ تجربہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ بہر صورت اس طرح تمہیں دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ بلکہ مسرت میں کئی

گناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ کیا کر رہے ہو۔ آؤ کس فضول جگہ آبیٹھے ہو۔ چلو باہر چلو...... ہاں کہاں قیام ہے تمہارا......؟"

"جوزمین میں۔" میں نے جواب دیا۔

"اونہہ چھوڑو جوزمین کو۔ سامان کسی ویٹر کو بھیج کر منگوالیں گے آؤ میرے ساتھ قیام کرو۔"

"تم کہاں ہو؟"

"میں لائسیم میں ہوں اور یقین کرو دوست لائسیم یہاں کا خوب صورت ترین ہوٹل ہے۔" ایلس نے کہا۔

میں نے ایلس کا ساتھ نہایت مناسب سمجھا تھا۔ ایک سے دو ہوگئے تھے۔ میرے بہت کم دوست تھے لیکن ایلس میرے بہترین دوستوں میں سے تھا۔ حالاں کہ خاقان نے بھی مجھ سے دوستی کے دعوے کیے تھے، لیکن خاقان خود پرست آدمی تھا اور میں نے اس ایلس پر کبھی ترجیح نہیں دی تھی۔

بہر صورت ایلس مجھے اپنے ساتھ ہوٹل لائسیم لے گیا۔ جہاں اس کے پاس ایک عظیم الشان سوٹ تھا۔

اسکاٹ لینڈ جیسے شہر میں کسی سوٹ کا حاصل کرنا جس قدر مشکل کام تھا میں جانتا تھا۔ بہت ہی مہنگی جگہ ہوگی یہ لیکن ایلس ہمیشہ سے شاہ خرچ تھا۔ اپنی حیثیت سے بہت زیادہ خرچ کرتا تھا اور بہت کروفر سے رہتا تھا۔ یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی۔

بہر طور اس نے میرا سامان میرے ہوٹل سے منگوالیا اور مجھے اپنے ساتھ ہی ٹھہرالیا۔

رات کو ہم لوگ تقریباً تین بجے تک گفتگو کرتے رہے ایلس مجھ سے میری گرفتاری کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں نے اسے خاقان کے بارے میں بتایا۔ تب ایلس نے مجھے بتایا کہ خاقان ان دنوں ترکی کی جیل میں ہے۔

"بڑی خوشی ہوئی مجھے اس کی گرفتاری کی خبر سن کر بہت ہی خود غرض قسم کا انسان ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور ایلس گردن ہلانے لگا۔

"بہر طور ہماری لائن میں عام طور پر لوگ خود غرض ہی ہوتے ہیں مائیکل، لگ جائے تو ریل، نہیں تو جیل، یہ تو ہے ہی اس فیلڈ میں۔"

"بہر طور خاقان نے میرے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔ ورنہ شاید یہ نہ ہوتا......"

"چھوڑو یار! کس چکر میں پڑ گئے۔ اب تمہارے ساتھ میں ایک دھوکہ کرنا چاہتا ہوں۔" ایلس نے کہا اور میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کرو...... کرو...... تم بھی میرے ساتھ دھوکا کرو...... پانچ سال میں تمہارے نام پر بھی قربان کرسکتا ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں میرے دوست! ایلس کم از کم اس قسم کے دوستوں میں سے نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" ایلس نے کہا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد ایلس بولا۔

"درحقیقت میں ایک کام کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا اور اگر تم تیار ہو تو اس سلسلے میں تم بھی شامل ہوسکتے ہو۔ دس لاکھ ڈالر کا معاملہ ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو میں پانچ لاکھ ڈالر تمہارے حوالے کرسکتا ہوں چوں کہ یہ کیس مکمل طور پر میں نے لے لیا ہے۔"

"پانچ لاکھ ڈالر۔" میں نے دلچسپی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں سو فیصدی، یہ بالکل ٹھوس معاہدہ ہوگا اور اس میں کوئی سقم نہ ہوگا۔"

"لیکن کام کیا ہے۔" میں نے سوال کیا۔

"ہمیں لندن روانہ ہونا پڑے گا۔ لندن آرٹ میوزیم سے ہمیں ایک تصویر حاصل کرنی ہے۔ جو ایک بہت بڑے برٹش تاجر کو درکار ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں گہرائیوں میں نہیں پڑتا۔ اس تاجر نے بیس لاکھ ڈالر میرے نام سے بینک میں جمع کرا دیے ہیں لیکن میں اسے اسی وقت حاصل کرسکتا ہوں۔ جب تم یہ تصویر لندن میوزیم سے

حاصل کرنے میں میری مدد کرو۔"

"کیسی تصویر ہے؟"

"پتہ نہیں جیسی بھی ہے۔ بہر طور اس تاجر نے تصویر کو حاصل کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں اور چوں کہ معاوضہ بہت بڑا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی لائن سے ہٹ کر اس کام کو قبول کرلیا۔ میرا خیال ہے تم ان لائنوں کے ماہر ہو تم میری بہتر راہنمائی کر سکتے ہو اور میں تمہیں اس کے عوض پانچ لاکھ ڈالر دے سکتا ہوں۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے جواب دیا اور ایلس خوشی سے اُچھل پڑا۔

"ہاں یقیناً۔" میں نے جواب دیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ایلس کو اپنی مصیبت کے بارے میں بتادوں لیکن میں نے سوچا کہ پتہ نہیں کہ وہ کیا محسوس کرے اور میرے لیے مشکلات نہ کھڑی ہو جائیں۔ اس لیے میں نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔

بہر حال ایلس تعاون کرنے والا آدمی تھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اگر ضرورت پیش آئی تو میں کسی مناسب وقت پر اسے اپنی کہانی سنادوں گا۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے وہ کوئی کام کی بات بتا سکے۔ ایلس کی تیاریاں مکمل ہو گئیں اور ہم صبح لندن کے لیے چل پڑے۔

شہر بے مثال لندن، حسین شب و روز کا حامل، میں پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔ ایلس نے یہاں بھی اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اس کی معیت میں مجھے کافی سکون ہوا تھا۔ کم از کم تنہا نہیں تھا اور ہر وقت وہ بھیانک خیال مجھ پر مسلط نہیں رہتا تھا۔

تقریباً ایک ہفتہ ہم نے آرام کیا۔ اس دوران ہم مختلف تفریحات میں مشغول رہے تھے۔ میں نے یہاں جوئے میں کافی رقم بنائی ایلس میرے اس فن سے بے حد متاثر تھا۔

"تمہیں دولت کے حصول کے لیے اتنی جدوجہد کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارے بینک اکاؤنٹ تو ہر ملک اور شہر میں کھلے پڑے ہیں۔" اس نے ایک دن متاثر لہجے میں کہا۔

میں ہنسنے لگا پھر ایلس بولا۔

"اب کیا خیال ہے اپنا کام کریں۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ بہت آرام کر چکے۔"

"تو آج آرٹ میوزیم چلتے ہیں۔"

"اوکے۔" میں نے جواب دیا اور ہم لوگ تیاریاں کرنے لگے۔ میوزیم اسکوائر میں واقع تھا۔ ہم وہاں پہنچ کر اندر داخل ہو گئے۔ آرٹ میوزیم بے مثال تھا۔ اس سے قبل اسے دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ یہ میری لائن سے الگ چیز تھی۔ ہم دونوں نوادرات زمانہ دیکھتے ہوئے آرٹ گیلری میں داخل ہو گئے۔ دنیا کے مشہور ترین مصوروں کی تخلیقات یہاں آویزاں تھیں۔ ایمبرانت، ڈیگاس، اوین اور مائیکل اینجلو جیسے شہرہ آفاق مصوروں کی کئی عظیم شہکار تصاویر یہاں موجود تھیں۔

ایلس ایک تصویر کے سامنے رُک گیا۔ یہ ایک فقیر اور ایک معصوم بچے کی تصویر تھی۔ ایلس نے جیب سے فوٹو گراف نکالا اور اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے وہ فوٹو گراف میری طرف بڑھادیا۔ میں اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔

"یہی ہے۔" میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"آرٹس گیلری میں دن میں داخلہ جس قدر آسان ہے رات میں اسی قدر مشکل ہے۔ رات کو یہاں سخت پہرہ رہتا ہے اور زبردست انتظامات رہتے ہیں۔"

"ہاں...... نوادرات کے علاقے میں کافی قیمتی اشیاء ہیں۔ میرے خیال میں تصاویر کے اس حصے پر زیادہ توجہ نہیں ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ رات کو اس طرف بھی توجہ ہوتی ہوگی۔ آؤ یہاں موجود انتظامات کا جائزہ لیتے ہیں۔"

ہم دونوں کئی گھنٹے آرٹ گیلری میں گزار کر آئے۔ اس دوران ہم پروگرام ترتیب دیتے رہے تھے۔ واپسی پر میں نے کسی قدر متعجبانہ انداز میں کہا۔

"مجھے اس بات پر حیرت ہے ایلس اس تصویر میں ایسی کون سی بات ہے کہ کوئی اسے بیس لاکھ ڈالر خرچ کر کے حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"صرف ایک خاص بات مجھے معلوم ہے۔" ایلس بولا۔

"کیا؟"

"یہ کسی قیمت پر فروخت نہیں جاسکتی کیوں کہ یہ سرکاری ملکیت ہے اور پھر یہ دولت مند لوگ سرپھرے ہوتے ہیں۔ کوئی شرط لگ گئی ہوگی۔ دو ارب پتیوں میں۔" ایلس ہنس پڑا۔

دوسرا اور تیسرا دن بھی ہم نے آرٹ میوزیم میں گزارہ اور اپنے پروگرام کو آخری شکل دینے لگے۔

میوزیم سات بجے بند ہوتا تھا اور دوسرے دن نو بجے کھلتا تھا۔ وہاں ہم نے ایسی جگہیں منتخب کرلیں۔ جہاں محافظوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہوئے رات گزارنی تھی اور تصویر حاصل کر کے پھر صبح نو بجے یہاں سے نکلنا تھا۔

چوتھے دن شام چھ بجے ہم ضروری انتظامات کے ساتھ میوزیم میں داخل ہو گئے میوزیم میں بہت کم لوگ تھے لیکن محافظوں نے ابھی اندر کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ ہم اپنی منتخب کردہ جگہوں پر پوشیدہ ہو گئے اور وقت لمحہ لمحہ گزرنے لگا۔ سات بجے اور پھر آٹھ بجے، میوزیم کی روشنیاں گل ہو گئیں۔ باہر محافظوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر یہ آوازیں معدوم ہو گئیں۔

تاہم ہم اپنی جگہ انتظار کرتے رہے۔ پھر جب ہماری کلائیوں پر بندھی ہوئی گھڑیوں نے گیارہ بجائے تو ہم نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور ہم باہر نکل آئے۔

اب چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ "تم دروازے پر پہنچ جاؤ اور وہاں مستعد رہو۔" ایلس نے کہا اور میں نے گردن ہلادی۔

دروازہ اس جگہ سے بہت دور تھا۔ میں راہداری میں چل پڑا۔ دونوں طرف لگی ہوئی تصویریں تاریکی میں چھپی ہوئی تھیں۔ ایلس دوسری طرف چل پڑا تھا۔ میں آہستہ قدموں سے گیلری میں بڑھنے لگا۔ دفعتہً مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔ مجھے ایک ہلکی سی روشنی محسوس ہوئی تھی ایلس جیبی ٹارچ لایا تھا۔ اسے اپنا کام کرنے کے لیے روشنی کی ضرورت تھی لیکن یہ روشنی میرے سامنے تھی۔ ایلس تو عقب میں بہت دور تھا۔

اور میں نے دیکھا کہ روشنی ایک تصویر سے ابھر رہی تھی۔ میں حیرانی میں آگے بڑھا۔ یہ قد آدم تصویر تھی۔ جس کے فریم سے روشنی پھوٹ رہی تھی لیکن میرے حواس جواب دے گئے۔ بدن سُن ہو گیا۔ یہ تصویر...... یہ تصویر اس کی تھی۔ ہاں یہ وہی تھی۔ جو شکایت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں خبط الحواس نہیں ہوں۔ احمق نہیں ہوں۔ زندگی میں سخت حالات کا شکار ہو چکا ہوں لیکن اس وقت میں نے خود کو بلی کے پنجوں میں پھنسا ہوا محسوس کیا۔ میں اس کے سامنے شرمندہ تھا۔ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

"میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ تم میرا آخری سہارا ہو سمجھے؟ میری مدد کرو۔ مجھے میرے محبوب سے ملادو۔"

"تم...... تم دن میں تو یہاں نہ تھیں۔" نہ جانے کس طرح میرے ہونٹوں نے سرگوشی کی۔

"میں تمہارا تعاقب کر رہی ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔" اس نے کہا اور پھر وہ فریم سے نیچے اتر آئی۔ "تم جس لیے آئے ہو مجھے معلوم ہے۔ آؤ...... تمہارے دوست! نے اپنا مقصد پورا کرلیا ہے۔ میں تمہیں یہاں سے باہر نکال دوں اپنے دوست سے کہو تمہارے ساتھ چلا

آئے......آؤ......" وہ آگے بڑھ گئی اور میں سحر زدہ سا اس کے ساتھ چلتا رہا۔ ایلس تصویر اُتار چکا تھا۔ اس نے فریم کھول کر تصویر لپیٹ لی تھی۔

"ارے تم واپس آ گئے؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"ہاں تم نے اپنا کام کرلیا۔ میرے ہونٹوں سے آواز نکلی لیکن اس جواب میں میرے ارادے کو دخل نہ تھا۔

"ہاں کام ہو گیا۔ بس اب۔"

"آؤ۔" میں نے کہا اور ایلس چونک پڑا۔

"کہاں؟"

"آؤ یہاں سے نکل چلیں۔" میں بولا۔

"خبط الحواس ہوئے ہو گئے۔ یہاں سے نکلنا آسان نہ ہوگا اس وقت۔"

"میں تمہیں ایک ایسے راستے سے لے چلوں گا۔ جہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔" میں نے کہا لیکن میرے فرشتوں کو بھی ایسے کسی راستے کا پتہ نہیں تھا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ ایلس لڑکی کو کیوں نہیں دیکھ رہا۔ میں جو کچھ اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ میرے الفاظ نہیں تھے۔ میری آواز کسی اور کے قبضے میں تھی۔

ایلس بحث کرتا رہا۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتا تھا لیکن اچانک میں کوئی ایسا راستہ دریافت کرلوں گا۔ اس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن پھر وہ تیار ہو گیا اور تصویر سنبھالتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑا۔

راہداریاں سنسان اور تاریک تھیں لیکن میں اناطورہ کے دھندلے سائے کو دیکھ رہا تھا اور میرے قدم اس کے قدم پر پڑ رہے تھے۔ میرے پیچھے ایلس تھا۔ ہم کئی راہداریاں عبور کر کے میوزیم کے بالکل عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ پھر میرے ہاتھوں نے ایک دروازہ کھولا اور دوسرے لمحے ہم ایک عقبی پارک میں تھے۔

ایک محافظ گشت کرتا ہوا نکل رہا تھا۔ چناں چہ ہم رک گئے۔ لیکن اس کے دور نکل جانے کے بعد ہم پھر چل پڑے اور پھر میوزیم کی چار دیواری کود کر بھاگنا ہمارے لیے مشکل نہ ہوا۔

یہاں اچانک میرے حواس آزاد ہو گئے۔ گزرے ہوئے واقعات مجھے یاد آ گئے لیکن میں بے دست و پا رہا تھا۔ میں سراسیمہ تھا لیکن ایلس کی مسرتوں کی انتہا نہیں تھی۔ نجانے کس طرح ہم اپنے ہوٹل پہنچے۔ ایلس مسرت سے کھلا پڑا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں تمہاری صلاحیتوں کا دل سے قائل ہوں لیکن اس وقت واقعی تم نے مجھے ششدر کر دیا ہے۔ آخر تم نے یہ راستہ کیسے دریافت کرلیا؟"

بہرحال میں نے ایلس کو اس سلسلے میں کوئی خاص بات نہیں بتائی لیکن اب میں تھک گیا تھا۔ میں کہاں اس سے فرار حاصل کرسکتا تھا۔ وہ تو ہر جگہ میرے قریب ہوتی تھی۔

ایلس اپنے پروگرام بناتا رہا۔ میں اس سے تعاون کر رہا تھا۔ یہ تصویر اس نے بیس لاکھ ڈالر میں ایک امریکی ارب پتی کے نمائندے کے حوالے کی۔ رقم وصول کر کے پانچ لاکھ ڈالر میرے حوالے کیے اور آئندہ اقدامات کے بارے فیصلے کرنے لگا۔

میری خواہش ہے۔ جانِ من کہ ہم آئندہ بھی مشترکہ پروگرام بنائیں اور مل کر کام کریں کیا خیال ہے۔ کیا تم میری یہ پیشکش قبول کرو گے؟" اس نے کہا۔

"مجھے اعتراض نہیں ہے۔ ایلس بلکہ ایک پروگرام میرے ذہن میں ہے۔" میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ میں اب مجبور ہو گیا تھا۔ میں اس سے فرار حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ لہٰذا اب یہ سوچ رہا تھا کہ نتائج کچھ بھی ہوں۔ میں اس روح کی بات مان ہی لوں۔ ایلس خوشی سے اُچھل پڑا تھا۔

"میں پوری بات جانے بغیر ہی تمہارے ساتھ کام کرنے پر تیار ہوں۔" وہ بولا۔

"اگر ہمیں ایک بار ہی اتنی بڑی دولت مل جائے جس کے سہارے ہم پوری زندگی عیش سے گزار سکیں۔ تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جہاں تک زندگی میں دوسری دلچسپیوں کا معاملہ ہے تو دولت ہونی چاہیے۔ ہر تفریح کی جا سکتی ہے۔

"سو فیصدی لیکن ہم جیسے لوگوں کے لیے جتنی دولت زندگی گزارنے کے لیے درکار ہے۔ کیا تم اتنی دولت کی بات کر رہے ہو۔"

"ہاں۔"

"تو میری جان......پھر انتظار کیا ہے؟"

"ہمیں بہت سے انتظامات کرنے ہوں گے۔ ہمیں اس کے لیے قاہرہ کا سفر کرنا ہوگا۔"

"ضرور چلو۔" ایلس نے کہا۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرنے لگا تھا۔ بہرحال میں تنہا یہ سب کچھ نہیں کرسکتا۔ ایک بالکل غیر یقینی معاملہ تھا۔ اگر میں اسے حقیقت حال بتا دیتا تو شاید وہ مجھے قاہرہ جانے کے بجائے لندن کے کسی دماغی ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیتا۔ خود میں بھی یقین کی منزل میں نہیں تھا۔ دولت کی بات میں نے اس لیے کی تھی کہ اناطورہ کی روح نے مجھ سے اس بارے میں کہا تھا۔

بہرحال میں ایلس کو ایک الٹی سیدھی کہانی سنا دی۔ جس میں میں نے اپنی ضرورتوں کا خیال رکھا تھا۔ میں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمیں اس عمل کے لیے کافی اخراجات کرنے ہوں گے۔ اس لیے میں نے ان پانچ لاکھ ڈالر کو خرچ کرنے کا فیصلہ کیا جو تصویر کی چوری سے حاصل ہوئے تھے۔

ایک بات میں نے بخوبی محسوس کی تھی۔ جب سے میں اناطورہ کی بات ماننے کا فیصلہ کیا تھا۔ میری روح کا اضطراب ختم ہو گیا تھا۔ وہ کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ جو مجھے بے چین کیے رہتی تھی۔ میں ہشاش بشاش ہو گیا تھا' ایلس میرے ساتھ قاہرہ آ گیا۔ اس دوران اناطورہ سے میرا ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔

یہاں آ کر میں اس کی تلاش میں مصروف ہو گیا اور مجھے اس میں دقت نہ ہوئی۔ ابوالہول کے دیو پیکر مجسمے کے عقب میں وہ مجھے مل گئی۔ اس کی حسین آنکھوں میں تشکر کے جذبات تھے۔

"تم اپنے ذہن سے سارے وسوسے نکال دو......میں لحہ بہ لحہ تمہاری رہنمائی کروں گی۔"

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔" میں نے پوچھا۔

"تھوڑا سا انتظار یہ بہت ضروری ہے۔ بہرحال مصر اور پھر خاص طور سے قاہرہ کوئی معمولی جگہ نہیں تھی۔ میرے اور ایلس کے لیے یہ ایک سرپرائز تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس میں دولت کے حصول کا تصور تھا۔ انسان دولت کے لیے نجانے کیا کیا کچھ کرلیتا ہے۔ غرض یہ کہ یہ سارا سلسلہ چل رہا تھا۔ اناطورہ ہم سے کیا چاہتی تھی۔ یہ تو بعد کی باتیں تھیں لیکن اب تک جو مدد اس نے میری کی تھی۔ وہ بھی میرے لیے ایک حیثیت رکھتی تھی اور پھر سچی بات یہ ہے کہ بے شک وہ ایک روح تھی لیکن مجھے اس سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔

ایلس......اپنی مصروفیات میں گم ہو گیا۔ قاہرہ کے شبینہ کلب اس کے لیے باعثِ دلچسپی تھے اور میں اپنے طور پر اپنی تفریحات تلاش کرنے لگا۔ اناطورہ ایک انوکھی روح ہے۔ جس کا مؤقف نجانے کیا ہے لیکن پھر اس نے جو کہانی مجھے سنائی وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ اس نے کہا۔

"سنو۔ یہاں کچھ ایسے کردار ہیں جن سے میرا ایک حساب کتاب ہے۔ یہ بات تو تم جانتے ہو۔ کہ میرا تعلق مصر سے ہی ہے۔ میں ماضی میں کچھ کھو چکی ہوں۔ جسے زندگی میں تو نہیں پا سکی لیکن اس بات کی آرزومند ہوں کہ وہ سب کچھ مجھے ملے کیا اس سلسلے میں تم میری مدد کر سکتے ہو۔"

"اناطورہ......پہلی بات تو یہ کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اپنی زندگی کو روشن دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ اگر تم مجھے ان دونوں چیزوں کے سلسلے میں مطمئن کرسکتی ہو تو تم یہ سمجھ لو...... کہ میں تمہاری ہر

خواہش کی تکمیل کے لیے تیار ہوں۔" انا طورہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے غم کے تاثرات پھیل گئے پھر اس نے کہا۔

"ایک روح سے محبت کر کے تم کیا کرو گے؟" کیا حاصل ہوگا تمہیں باقی رہا دولت کا سوال تو جو کچھ میں تمہیں بتانے جارہی ہوں۔ تم یہ سمجھ لو کہ وہ تمہاری زندگی کا ایک اہم حصّہ بن جائے گا۔"

"تم مجھے کیا بتانے جارہی ہوں؟" میں نے سوال کیا تو اس نے مجھے ایک کہانی سنائی۔

"ماضی میں کچھ لوگوں کے ساتھ' کچھ لوگوں نے جو کچھ کیا ہے' تم یہ سمجھ لو کہ میں اس کا انتقام لینا چاہتی ہوں۔"

پھر اس نے مجھے ایک انوکھی کہانی سنائی اور اس انوکھی کہانی کے تحت میرا کردار ایک ایسے شخص کا تھا۔ جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے۔ قاہرہ کا مقامی آدمی ہے اور کچھ مشکلات میں پڑ کر اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے اس نے کہا۔

"حقیقت یہ ہے کہ تم ابوسعد ہو۔ ایک دولت مند باپ نعمان سعد کے بیٹے ایک لمبی کہانی اس داستان سے منسلک ہے۔"

"وہ تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن کیا مجھے اس نئی حیثیت میں کسی سے روشناس ہونا پڑے گا۔"

"ہاں...... بہت سے افراد سے جس میں حسناتی ہے۔ عاکف غماز ہے۔ محمود نعری ہے اور نجانے کون کون۔"

"ارے باپ رے باپ' تو پھر میرا بنے گا کیا؟"

"کچھ نہیں۔ جب اس کہانی کا اختتام ہوگا۔ تو تم ایک ارب پتی شخص ہو گے۔" اس طرح کے الفاظ ہی مجھے اپنی زندگی کے دلکش ترین الفاظ محسوس ہوتے تھے۔ انا طورہ نے میری مشکل دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے سچے دل سے جواب دو کہ کیا تم میری اس پیشکش کو قبول کرو گے۔"

"انا طورہ میرے دل میں تو خواہش تھی کہ میں تمہاری محبت بھی حاصل کروں لیکن اگر محبوب کی مجبوریاں آڑے آجائیں۔ تو انسان کو ان سے تعاون کرنا ہی ہوتا ہے کیوں کہ بہرحال محبوب کو محبوب ہی کہا جاتا ہے۔"

"بے شک تم ٹھیک کہتے ہو۔" انا طورہ نے جس شخص سے میری ملاقات کروائی۔ اس کا نام حسناتی تھا۔ یہ نام وہ مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ حسناتی اسی کی ہدایت پر تم سے ملے گا لیکن تم یہ سمجھ لو کہ میں اسے تمہارے پاس بھیجوں گی اور وہ تمہیں میرا ہی حوالہ دے گا۔

اور حسناتی نے جو ایک اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ مجھ سے کہا۔ "اگر میں تمہیں انا طورہ کا حوالہ دوں۔ تو کیا اس کے بعد مجھے کچھ اور بتانے کی ضرورت رہ جاتی ہے۔"

"نہیں مسٹر حسناتی' میں آپ کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"بے حد شکریہ! تو بس اب تم یہ سمجھ لو کہ تم میری تحویل میں ہو اور میں تمہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں کیا سمجھے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔"

"اور میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے پر مکمل اعتماد کریں۔"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔" بہرحال یہ سب کچھ جاری رہا اور پھر حسناتی مجھے ایک خوب صورت محل نما عمارت میں لے گیا۔ یہ عمارت اسی کی ملکیت تھی۔ مجھے عمارت کے اُوپری منزل کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے کی عقبی کھڑکی سے قاہرہ کی زندگی نظر آتی تھی۔ ایک بہت ہی حسین ماحول تھا۔ پھر بہت سے معاملات ہوئے۔ ایک ڈاکٹر نے میرا دماغی تجزیہ کیا اور مجھے بالکل فٹ قرار دے دیا۔ ڈاکٹر ہی سے گفتگو کرتے ہوئے حسناتی نے کہا۔

"آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے۔ آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔"

"نہیں۔"

"نعمان سعد کا نوجوان بیٹا۔ ابوسعد' جس کے بارے میں مصر کے اخبارات بہت سی کہانیاں لکھتے رہے ہیں' لیکن یہ بات طے ہے کہ میں نے پہلے بھی ان کہانیوں کو جھوٹ ثابت کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا اور محمود نعری کو اسکی سازشوں کی سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اب یہ کام شروع ہوگیا ہے۔ میں دیکھوں گا کہ محمود نعری کیا کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حسناتی نے مجھے میرا نام بتاتے ہوئے کہا۔

"ابوسعد فی الحال میں تمہیں روحا کے حوالے کررہا ہوں۔ روحا تمہیں مصر کی سیر کرائے گی اور بہت کچھ دکھائے گی۔ روحا کا نام میرے لیے بڑا عجیب تھا۔ عجیب سا تو میرا اپنا نام بھی تھا۔ کیوں کہ میں مائیکل سے ابوسعد بن گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ کہ میرے چہرے پر نہ تو کوئی میک اپ کیا گیا تھا اور نہ ہی کچھ اور پھر میں اچانک ہی اپنی جون بدل کر مائیکل سے ابوسعد کیسے بن گیا؟ اور کیا اہل مصر مجھے اس نئی حیثیت سے قبول کرلیں گے؟ لیکن بہرحال انا طورہ ایک پُراسرار شخصیت تھی۔ جسے میں تو آج بھی روح ہی سمجھتا ہوں۔

پھر روحا مجھے ملی۔ نام نے تو کچھ خاص متاثر نہیں کیا تھا لیکن مصر کی خواتین کے حسن و جمال کے بارے میں پہلے بھی پڑھ چکا تھا۔ روحا اس حیثیت سے مکمل تھی۔ پھر اس کا محبت بھرا انداز بھی میرے لیے بڑی دلکشی کا باعث تھا۔ دو ہی تو شوق تھے۔ حسین چہرے اور بھرپور دولت۔ بہرحال روحا مجھے لے کر مصر کے بازاروں میں نکل آئی اور میں روایتی شہر قاہرہ کی حسین رونق دیکھنے لگا۔ بلاشبہ یہ حسن و جمال کا خزانہ تھا۔ ہر چیز قابل دید نجانے کیا کیا۔ مناظر نگاہوں کے سامنے آتے رہے۔ رات گئے واپسی ہوئی۔ روحا کے ساتھ یہ وقت انتہائی خوش گوار گزرا تھا۔ پھر اس کے بعد غالباً یہ روحا کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی کہ وہ روزانہ مجھے قاہرہ کی سیر کرائے۔ ایک دن مجھے ایک بہت ہی عالی شان عمارت دیکھائی گئی۔ کیا حسن و جمال تھا اس عمارت کا' روحا نے وہاں کچھ لمحوں کے لیے کار روکتے ہوئے کہا۔

"اس عمارت کو دیکھ رہے ہیں۔ ابوسعد؟" روحا مجھے ابوسعد ہی کہہ کر مخاطب کررہی تھی اور اس نے مجھے یہ باور کر دیا تھا کہ مجھے اپنے اُوپر ابوسعد کو مسلط کرلینا چاہیے۔ چوں کہ آنے والے وقت میں مجھے ایک بہت بڑا کردار سر انجام دینا ہے۔ میں نے اس عمارت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"واہ...... کیا حسین عمارت ہے۔"

"کیا تم اس بات پر یقین کرو گے کہ یہ تمہاری ملکیت ہے۔" جواب میں مجھے ہنسی آگئی۔ روحا نے کہا۔

"نہیں ابوسعد ہنسو مت۔ حقیقتاً یہ تمہاری ملکیت ہے۔ تمہارے باپ کی ملکیت' جس پر اس وقت محمود نعری نے قبضہ کیا ہوا ہے۔"

"محمود نعری؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے روحا کو دیکھا۔

"ان لوگوں سے تمہارا باقاعدہ تعارف کرایا جائے گا۔ ابھی تم ذرا قاہرہ کا جائزہ لے لو...... اپنے ذہن کو اس بات کے لیے آمادہ کرلو...... کہ تم ایک کھوئی ہوئی یادداشت کے مریض ہو اور بہت عرصے کے بعد اپنی دنیا میں واپس آئے ہو۔ تمہارے ساتھ گہری سازش ہوئی ہے۔" جواب میں مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا۔

"گہری سازش تو اب ہورہی ہے روحا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ حسناتی نے تم اپنا ماضی بھول چکے ہو۔" یعنی میر کے والد نے تو کہا تھا۔

"ماضی بھولنے کی چیز نہیں ہوتا روحا۔ اگر انسان ذی ہوش ہو۔"

"خیر یہ بات میں مانتی ہوں۔" پھر اس دن حسناتی نے علی الصبح مجھ سے ملاقات کی اور بولا۔

"واہ...... تمہاری صحت یہ بتا رہی ہے کہ تم ذہنی طور پر بالکل مطمئن ہو۔ چلو ٹھیک ہے ویسے بھی آج رات کو میں تمہاری ملاقات عاکف غماز سے کرا رہا ہوں۔ یہ بہت بڑا پولیس آفیسر ہے اور اس کے بارے میں بڑی بڑی

کہانیاں مشہور ہیں۔ انتہائی سفاک ہے لیکن میرا دوست ہے۔ تمہیں انہی لوگوں کے سامنے اپنی اصل شخصیت کا اظہار کرنا ہے کیا سمجھے؟"

"سمجھ رہا ہوں۔"

"بس یہ سمجھ لو کہ انا طورہ کی خواہش کے مطابق تمہاری ذہانت تمہیں وہ سب کچھ دے گی جس کے تم حقدار ہو۔ کیا سمجھے؟" عاکف غماز کے سامنے اپنے آپ کو بالکل صحیح صورت حال پیش کرنا۔ میرا مطلب ہے۔ ابو سعد کی حیثیت سے وہ تم سے غیر متوقع سوالات کرسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اطمینان رکھیے۔" روحا نے تمہیں بتا ہی دیا ہوگا۔ کہ محمود نعری نے تمہارے والد کی بہت بڑی دولت پر قبضہ کررکھا ہے۔ اتنی بڑی دولت کہ اگر اس کا دس فیصد بھی تمہیں مل جائے تو زندگی میں تمہیں مزید دولت کی ضرورت باقی نہ رہے۔ تم دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے اور مہنگے ملک میں ایک شہزادے کی سی زندگی بسر کر سکو۔" میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ مجھے میرے ذہن میں بسے ہوئے خواب دکھا رہا تھا۔ بہرحال میری ملاقات اسی شام عاکف غماز سے کرائی گئی۔

درحقیقت وہ ایک شان دار شخصیت کا مالک تھا اور اس کی آنکھوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک ذہین آفیسر ہے لیکن وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اور دو بیٹیاں بھی تھیں۔ جو مصر کے حسن کا نمونہ تھیں۔ بہرحال اس سے میرا تعارف بھی کرایا گیا اور اس کے بعد بہت ساری باتیں ہوئیں۔ اس نے خاص طور سے کہا کہ محمود نعری اکثر میرے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا اور اسی دوران روحا بھی آگئی اور خواتین کا وہ کھیل شروع ہوگیا جو عموماً ایسے موقعوں پر کافی دلچسپ ہوتا ہے۔

روحا عاکف غماز کی دونوں بیٹیوں پر طنز کرتی رہی۔ جو خصوصاً میری جانب متوجہ تھیں۔ بہرحال وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی رہیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ روحا ان کی اور میری قربت سے کچھ برگشتہ ہوگئی ہے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد حسناتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وری گڈ۔ بہت اچھا کردار ادا کررہے ہو۔ اب ہم نہایت آرام کے ساتھ محمود نعری پر حملہ کرسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کل اس کا آغاز کردیا جائے۔ ویسے میں نے تمہارے لیے بہت ہی خوب صورت ہوٹل کا انتظام کرلیا ہے۔ تمہارا وہاں رہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

"اگر آپ اجازت دیں ڈیڈی! تو ان کے ہوٹل میں برابر والا کمرہ میں حاصل کرلوں تاکہ......"

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں ہے۔" بہرحال اس کے بعد حسناتی نے مجھے پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں محمود نعری کے مقابلے میں میدان میں اترنا ہوگا۔" اس نے کہا کہ محمود نعری اس ہوٹل میں روزانہ آتا ہے۔ جہاں میرے قیام کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے بہت سی تصویریں بھی دکھائی گئی تھیں۔ جن میں ضرورت کے تمام افراد سے میری شناسائی کرادی گئی تھی۔"

"ان لوگوں کو اس طرح اپنے ذہن میں بٹھالو...... کہ کسی سے بھی اجنبیت کا اظہار مت کرو...... اسی میں ہماری کامیابی ہے۔ میں گردن ہلانے لگا اور پھر مجھے قاہرہ کے سب سے شان دار فائیو اسٹار ہوٹل میں منتقل کردیا گیا۔ مجھے واقعی کافی ذہانت سے کام کرنا تھا۔ محمود نعری کے بارے میں مجھے پوری تفصیل بتادی گئی تھی۔ جس ہوٹل میں مجھے منتقل کیا گیا تھا۔ وہ درحقیقت خوابوں کی سرزمین تھی۔

یہاں رہ کر انسان اپنے آپ کو دنیا کے کسی گوشے میں محسوس ہی نہیں کرتا تھا بس یوں لگتا تھا جیسے کسی سیارے پر ہو۔ بہرحال ہوٹل میں ویٹر لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک لڑکی نے اپنے آپ کو میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سب آپ کے خادم ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ خادم کسی بات سے انکار نہیں کرتے۔" یہ ایک دعوت تھی جو

میرے لیے تھی۔ "میرے دوست تم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ بلکہ میں تمہاری آنکھوں میں وہ خواہش دیکھ رہا ہوں۔ جو میرے الفاظ کے ساتھ تمہاری آنکھوں کی زینت بنتی جارہی ہیں۔ یعنی مصر کے اس علاقے کو دیکھنے کی خواہش۔" شاہ ورا ایک دم چونکا پھر مسکرادیا اور بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ مائی ڈیئر مائیکل کیا میں انسانوں سے دور کی کوئی چیز ہوں۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم واقعی ایک خوب صورت نوجوان ہو اور میں بھی یہ ہی سمجھتا ہوں کہ تمہیں زندگی کے اتنے ہی قریب آجانا چاہیے۔ بہرحال میں تیاریاں کرنے کے بعد ہوٹل کی نچلی منزل میں آگیا اور یہاں میری سب سے پہلی ملاقات سینہ سے ہوئی۔ سینہ عاکف غماز کی بیٹی تھی اور پہلے بھی مجھے مل چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ بے انتہا خوب صورت لباس میں ملبوس تھی۔ اس نے میری جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر ہے۔ کہ روحا اس وقت تم پر مسلط نہیں ہے۔ ویسے کیا میں ابو سعد کی دوست بن سکتی ہوں۔"

"کیوں نہیں بھلا آپ جیسی حسین دوست کو کون انکار کرسکتا ہے۔"

"واہ...... یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے روحا پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ چند لمحات کے بعد وہ مجھے وہاں سے لے کر دوسری طرف آگئی۔ یہاں شاید جوار خانہ تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"میرے نام پر کھیلئے اس سے میں اپنے اور آپ کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔" میں مسکرادیا اور کہا۔

"میں اپنے پسندیدہ لوگوں کو کبھی داؤ پر نہیں لگاتا۔"

"اچھا۔" "آپ کی پسندیدہ شخصیت کون ہے اور کہاں ہے؟"

"میرے پاس...... میرے بالکل قریب۔" میں نے کہا۔

"اوہو...... اِدھر دیکھیے...... وہ محمود نعری! آپ تو انہیں پہچانتے ہیں ناں؟" میں نے اس طرف دیکھا۔

"شارک اسکن کے حسین سوٹ میں ملبوس بہت ہی خوب صورت شخصیت کا مالک وہ شخص بے مثال تھا۔ اس کے شانے جمال عبدل ناصر کی طرح چوڑے اور قد اس سے بھی کافی بڑا تھا۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک سخت گیر اور خطرناک انسان ہے۔ وہ ایک میز پر بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ مجھے چوں کہ اب اس کی توجہ حاصل کرنا تھی۔

چناں چہ منصوبے کے مطابق میں ایک ایسے زاویے پر آگیا کہ وہ مجھے وہاں سے دیکھ سکے اور یہ ہی ہوا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اس طرح چونکا جیسے آگ کی کسی چنگاری سے چھو گیا ہو۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی اپنی میز سے اٹھ گیا اور کسی قدر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ہال کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس دوران سینہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن میں نے اس کا ایک جملہ بھی نہیں سنا تھا۔ البتہ جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ کہہ رہی تھی۔

"کیا خیال ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"بے حد شکریہ۔" وہ شرمائے ہوئے لہجے میں بولی اور میں منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ نجانے کون سے الفاظ کہے تھے اس نے جس کے جواب میں میں نے ٹھیک ہے کہہ دیا تھا وہ پھر بولی۔

"تو پھر وعدہ ہے۔"

"ہاں!"

"مگر ہماری ملاقات کہاں ہونی چاہیے۔"

"میں آپ کو رنگ کرلیا کروں گا۔"

"کیا آپ یہاں رکیں گے۔"

"ہاں!" اس نے اپنا کارڈ نکال کر مجھے دیا اور پھر بولی۔

"تو پھر میں چلتی ہوں۔ ڈیڈی سخت گیر آدمی ہیں لیکن میں تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔ بہرحال وہ چلی گئی

اور میں پھر اس ہوٹل کا جائزہ لیتا رہا۔ بہت دیر تک میں وہاں غماز مصروف رہا اور اس کے بعد اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔

بستر پر لیٹ کر میں نے ان تمام باتوں کے بارے میں سوچا اور دل میں ہی فیصلہ کرنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟ یہ تو بڑی عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ میری تو شخصیت ہی بدل گئی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آگے مجھے کیا کرنا ہے؟ لیکن میں نے اپنے عقب میں گہرے گہرے سانسوں کی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا تو اناطورہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے عقب میں موجود تھی۔ میں نے حیران لہجے میں کہا۔

''اناطورہ۔'' وہ مسکرائی اور بولی۔

''تو تم کیا سمجھتے ہو؟ میں تمہیں نظر انداز کر دوں گی۔''

''اناطورہ بڑا اچھا ہوا کہ تم اس وقت آ گئیں اور میرے ذہن کو تھوڑا سا سکون مل گیا۔ ورنہ میں تو ایک لمحے کے اندر اندر بڑی الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا۔ جو کچھ ہو رہا ہے کیا تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہے۔''

''نہ صرف معلوم ہے میری جان بلکہ تم جس طرح اپنا کردار ادا کر رہے ہو وہ اپنی مثال آپ ہے۔''

''اناطورہ لیکن۔''

''دیکھو تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں ابھی تک کوئی بے سکونی ہوئی۔''

''سب سے بڑی بے سکونی میرے لیے یہ ہے کہ میرا اپنا نام تک مجھ سے چھن گیا ہے اور میں ایک ایسے نام سے اس نئی دنیا سے روشناس ہو رہا ہوں۔ جسے اگر کوئی اچانک پکارے تو میں شاید پلٹ کر بھی نہ دیکھوں۔''

''یہ ہی تو تمہارا کام ہے۔ مائیکل کہ تم مائیکل کو بھول جاؤ اور ابو سعد کو یاد رکھو۔ میں نے تم سے دولت کا وعدہ کیا تھا۔ تو خود تمہیں اندازہ ہو گا ... وہ شخص جس کا نام محمود نصری ہے۔ ابو سعد کی ... جائے بیٹھا ہے اور اب جب تم سامنے آؤ گے تو ...... سمجھ لو کہ سارا کچا چٹھا کھل جائے گا اور تمہارے پاس دولت کے انبار ہوں گے۔ اگر تم چاہو تو اپنے طور پر محمود نصری کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہو۔ وہ قاہرہ کی دولت مند ترین شخصیتوں میں سے ایک ہے۔''

''ہاں ...... خیر یہ تو ہے۔''

''اس کے علاوہ تمہارے اِرد گرد حسن کا مجمع لگا ہوا ہے۔'' عاکف غماز کی بیٹیاں پھر روحا ...... اور کیا چاہیے؟''

''اور اگر میں کہوں ...... کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تو؟'' جواب میں اناطورہ کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے کہا۔

''آہ ...... کاش ......'' اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔

بہر حال بہت دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلی گئی اور میں بھی گہری نیند سو گیا دوسری صبح غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ویٹر کو کال کی، اور جواب میں ایک نوعمر لڑکا اندر آ گیا۔ میں نے اس سے ناشتہ طلب کیا ناشتے سے فارغ ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

''آپ کی کال سر!'' دوسری طرف سے بولنے والا حسناتی ہی تھا۔

''میرا نام مت لینا آواز پہچان گئے؟۔''

''ہاں ......''

''بہت عمدہ جا رہے ہو۔ رات کو تم نے اسے پوری طرح زیر کر لیا۔ اس وقت اس کے چھ آدمی تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔ اچھا ایک بات بتاؤ پولیس آفیسر کی بیٹی سے تمہارے کیا تعلقات رہے۔''

''وہ مجھ سے دوستی کرنے کا اظہار کر رہی ہے۔''

''یہ بھی بہت اچھا ہوا۔ پولیس آفیسر ایک طرح سے ہماری مٹھی میں آ جائے گا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ بہر حال اس نے بھی اندازہ لگا لیا ہے۔ اصل میں مجھے شبہ ہے کہ عاکف غماز محمود نصری کا دست راست ہے۔ بہر حال ہمارا کام بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔ ہوشیار رہو اور اپنے طور پر بھی کسی صورت حال کا فیصلہ کر سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' میں نے کہا اور دوسری طرف لائن بے جان ہو گئی۔ اس کے بعد میں آئندہ پروگرام کے بارے میں غور کرنے لگا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ محمود نصری کو یہ معلوم کرنے میں دقت نہیں ہو گی کہ میں کہاں رہ رہا ہوں۔ اس لیے آزادانہ باہر نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قاہرہ کی سیر تو کر چکا تھا لیکن تشنگی باقی تھی۔ کار میں بیٹھ کر ابوالہول کے نیچے بیٹھے مصوروں اور پتھارے والوں کی زندگی کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ہو سکتی تھیں۔ چناں چہ ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

لفٹ کے ذریعے نیچے آیا۔ باہر نکلا ہی تھا۔ کہ خوشبو جھونکا ناک سے ٹکرایا اور ایک کلی میرے سامنے شگفتہ ہو گئی۔ اس کے سیاہ بالوں کے گچھے پیشانی پر لہرا رہے تھے اور اس سیاہی کے پیچھے شفق جھلک رہی تھی۔ وہ شاید لفٹ میں جانے کے لیے آئی تھی لیکن مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ دوسرے لمحے میری آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی یہ صورت میں نے دیکھی تھی اور مجھے اس سے خاص طور سے روشناس بھی کرایا تھا۔ یہ محمود نصری کی بیٹی نغمینہ نصری تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر رُکی تھی۔ انداز میں شناسائی لیکن تھوڑا سا طنز بھی تھا۔

''کیا تم مجھ سے ناواقفیت کا اظہار کرو گے؟''

''کیا جواب دوں اس بات کا؟''

''کیوں۔ تمہیں بھلا جواب دینے سے کون روک سکتا ہے۔ پھر وہ بولی۔ مجھے تمہاری آمد کے بارے میں علم ہو گیا تھا۔ کہاں جا رہے ہو؟''

''کہیں بھی نہیں بس ایسے ہی۔''

''چلو گے میرے ساتھ؟''

''کہاں؟''

''جہاں میں لے جانا چاہوں۔ حالاں کہ تم پہلے مجھ سے یہ سوال نہیں کرتے تھے۔ ویسے اسی ہوٹل میں رہ رہے ہو؟''

''ہاں تمہیں یقیناً اس بات کا علم ہو گا۔''

''میں تمہارے پاس ہی آئی تھی۔''

''اپنے ڈیڈی سے اجازت لے کر؟'' میرے جملے پر وہ چند لحات خاموش رہی میں جانتا تھا کہ مجھے اس سے کیا بات کرنی ہے پھر وہ بولی۔

''ڈیڈی کے بارے میں شاید تم غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔ آؤ اپنے کمرے میں واپس چلو۔''

بہر حال واپسی ہو گئی اور مجھے۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کیا کھیل ہو رہا ہے۔ جس قدر ان حالات سے روشناس ہوا تھا۔ اس کے بعد میں اپنے آپ سے متعلق ہر کردار کی ذہنیت کو بھی پڑھ سکتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ تھا کہ محمود نصری جس انداز میں مجھے دیکھنے کے بعد ہوٹل کے گیم روم سے باہر نکلا تھا۔ اس میں خوف' بے کسی' بے بسی' دہشت سب ہی کچھ شامل تھا۔ اس نے اپنے سارے مہرے استعمال کرنا شروع کر دیئے تھے۔ میں نغمینہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ نغمینہ کہنے لگی۔

''میرے لیے کافی منگواؤ۔'' میں نے روم سروس کو فون کر کے کافی طلب کر لی۔ وہ بیٹھ گئی تھی ...... چند لحات خاموشی رہی پھر بولی۔ ''ہوٹل میں قیام کیوں کیا ہے؟''

''میرے بارے میں تمہیں کس نے اطلاع دی؟''

''ڈیڈی نے۔''

''میرے ہوٹل میں قیام کے بارے میں بھی وہ ہی تمہیں تفصیل سے بتا سکتے ہیں۔''

''میں نے پوچھا تھا۔ ان سے۔''

''تو پھر؟''

''ان کا کہنا ہے کہ تم کسی غلط فہمی کا شکار معلوم ہوتے ہو۔''

''ہوں۔''

''ویسے تم چلے کہاں گئے تھے؟''

''اس کا جواب بھی تمہارے ڈیڈی ہی دے سکتے ہیں۔''

میرے ڈیڈی تمہارے کچھ نہیں رہے؟'' نغمینہ نے

شکایتی لہجے میں کہا پھر بولی۔ ”حالاں کہ ڈیڈی کا کہنا ہے کہ وہ تم سے اس خدشے کا اظہار کر چکے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے بات کی تھی ابوسعد سے۔ مگر ابوسعد دشمنوں کا شکار ہو گیا۔ جب کہ بہت سے لوگ ان کے اور ابوسعد کے درمیان نفاق ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”ہوسکتا ہے۔“

”نہیں ابوسعد تم جانتے ہو کہ میں دنیا میں سب سے زیادہ تمہیں چاہتی ہوں۔“

”پلیز‘ مجھے راستے سے مت بھٹکاؤ۔“

”تمہارا ہر راستہ میری ہی جانب جاتا ہے۔ کیا سمجھے؟ گھر واپس چلو ورنہ میں اسی ہوٹل میں آ کر مقیم ہو جاؤں گی۔“

”نغمینہ تھوڑی سی سنجیدگی سے کام لینا ہوگا۔ مجھ پر جو گزری ہے تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔“

”پھر کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”یہ بھی نہیں بتا سکتا.... “ ویٹر نے کافی سرو کر دی اور ہم دونوں چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے۔ نغمینہ تقریباً ایک گھنٹے تک میرے ساتھ رہی۔ اس دوران وہ مجھے بار بار ٹٹولتی رہی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں‘ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وہ بہت افسردگی کے ساتھ واپس پلٹی تھی۔ مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ سب سے بڑی حیرت کی بات یہ تھی۔ کہ مصر کی حسین ترین لڑکیاں ایک سے حسین لڑکی مجھ تک آ رہی تھیں اور مجھے ان سے گریز کرنا پڑ رہا تھا۔

بہرحال ابھی تو میں حالات کا قیدی تھا۔ سب سے زیادہ حیرانی مجھے اس بات پر تھی۔ کہ اناطورہ کا کردار آخر اس سلسلے میں کیا ہے۔ کافی دیر گزر گئی اور اس کے بعد مجھے ایک پیغام ملا۔

”ابرار صاحب! آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”یہ کون ہیں؟“

”سر‘ روم نمبر 813 میں ہیں۔“

”اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”جی سر۔“

”وجہ نہیں بتائی؟“

”نہیں۔“

”کیا کیا تھا تم سے؟“

”یہی کہ میں آپ کو یہ میسج دے دوں۔“

ٹھیک ہے میں مل لوں گا ان سے۔“ کافی دیر تک میں سوچتا رہا۔ کہ یہ ابرار صاحب نجانے کون ہیں؟ اور اس کے بعد میں اُٹھ کر ابرار صاحب کے کمر کی جانب چل پڑا۔ دروازے کی بیل بجائی اور دروازہ کھل گیا۔ ایک بے ڈھنگے سے آدمی نے میرا استقبال کیا تھا۔ اس نے بڑے بے تکلف لہجے میں مجھ سے کہا۔

”آیئے ابوسعد۔ تشریف لایئے۔“

”آپ کون ہیں۔ میں تو آپ کو نہیں جانتا۔“

”یقیناً ایسا ہی ہے۔ اب آپ یوں کیجیے کہ یہاں سے حسناتی صاحب کو فون کر لیجیے۔ آپ کے کمرے کا فون ٹیپ کر لیا گیا ہے۔ حسناتی سے فون پر بات ہوئی تو اس نے کہا۔

”ویری گڈ‘ ویری گڈ“ ویری ویری گڈ“ مسٹر ابوسعد! ویری گڈ آپ نے اس شخص کو ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے۔ بدحواس ہو گیا ہے کہ بیان سے باہر ہے‘ چاروں طرف دوڑتا پھر رہا ہے اور ہم اسکی اس بات کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“

”جی۔“

”آج رات کو تم سے ملاقات بہت ضروری ہے۔ یہ ابرار ہے۔ جو یہاں اس ہوٹل میں مقیم ہے۔ میرا خاص آدمی ہے۔ اس پر بھروسہ کرنا یہ تمہاری مکمل رہنمائی کرے گا۔“ میں نے خاموشی سے گردن ہلائی اور دوسری طرف سے فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ابرار نے کہا۔

”میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کے غلاموں میں ہوں لیکن مجھے آپ کے ساتھ ذرا بے تکلفی کا مظاہر کرنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ رات کو نو بجے میرے کمرے میں آ جانا۔“ رات کو نو بجے ابرار میرے کمرے میں آ گیا اور اس کے بعد مجھے لے کر نیچے اُتر آیا تھوڑی دیر کے بعد حسناتی نے اپنی کوٹھی کے ڈرائینگ روم میں میرا استقبال کیا تھا۔ شکر تھا کہ ردحا موجود نہیں تھی‘ وہ مسکرا کر مجھ سے گلے ملا اور بولا۔

”ویری گڈ...... مجھے انتہائی خوشی ہے کہ ہم نے ایک صحیح آدمی کا انتخاب کیا ہے۔“

”آپ نے نہیں۔ کسی اور نے۔“

”وہاں...... جس کا نام تم لینا چاہتے ہو۔ وہ ہمارے لیے بڑی محترم شخصیت ہے۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ نغمینہ نصری سے تمہاری کیا بات چیت ہوئی۔“

”وہ مجھے بتاتی رہی کہ میں نصری صاحب کی طرف سے غلط فہمی کا شکار ہوں اور مجھے گھر چلنا چاہیے لیکن بہرحال اسے مایوسی ہوئی تھی۔“

”خوب‘ خوب‘ خوب۔“ اس کا مطلب ہے کہ نصری پوری طرح بے قرار ہو چکا ہے۔ جانتے ہو۔ اس نے اس دوران کیا کیا ہے عائف غماز کی بیٹیوں سے تمہاری ملاقات ہوئی۔ نصری کی چھوٹی بیٹی میمونہ اس کی دوست ہے۔ چناں چہ فوراً اس سے مل بیٹھی اور یہ بات اڑا لے گئی کہ محمود نصری کی بیٹی سے تمہاری ملاقات ہو چکی ہے۔ ہاں مجھے ایک بات بتاؤ۔ کہ کیا تم نجاشی کو جانتے ہو؟“

”نجاشی؟“

”ہاں۔ یقیناً تم نہیں جانتے ہو گے۔ وہ ایک جرائم پیشہ آدمی ہے۔ ایک کرائے کا قاتل اور ایک بدنام ہوٹل کا مالک۔ محمود نصری اس سے خصوصی طور پر ملا ہے اور لازم بات ہے کہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی ہونے والی ہے۔“

ایک لمحے کے لیے میں اُلجھن کا شکار ہو گیا لیکن حسناتی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ہم سارے کام تم سے ہی نہیں لے رہے۔ بلکہ خود بھی بہت کچھ کر رہے ہیں۔ نجاشی کو اب تک اغواء کیا جا چکا ہوگا۔ اگر تھوڑی دیر کے اندر اندر ہمیں اس کے اغواء کے بارے میں اطلاع نہیں ملی بھی تب تو صبح یہ کام ضرور ہو جائے گا میرے آدمی اس کے پیچھے ہیں۔“

”اوہ......“ میں نے گہری سانس لی۔ وہ پھر بولا۔

”کام پورے جوش و خروش سے جاری ہے اور بہت جلد نتیجہ برآمد ہو جائے گا۔ میں نے تمہارے محافظوں کی تعداد بھی بڑھا دی ہے لیکن اس کے باوجود تمہیں خود بھی مسلح رہنا چاہیے۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک خوفناک پستول میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ بہرحال میں پستول لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔

”موجودہ حالات اس بات کے لیے مجبور کرتے ہیں کہ میں تم سے کم سے کم ملاقات کروں۔ ہاں کچھ ضروری کاغذات میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ جو محمود نصری کے خلاف مقدمہ درج کرنے کے سلسلے میں تیار کیے گئے ہیں۔ انہیں ایک نگاہ دیکھ لو۔ میں نے سرسری نگاہ سے ان کاغذات کو دیکھا اور انہیں حسناتی کو واپس کر دیا۔ یہ اس جائیداد کی یا دولت کی تفصیل تھی۔ جو میرا ورثہ تھی اور جس پر محمود نصری نے قبضہ جما رہا تھا۔“

”یہ تمہاری طرف سے دعوے کے کاغذات ہیں کل صبح ان سب کی نقول تمہیں مہیا کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

”ابھی تک مجھے نجاشی کے اغواء کی اطلاع نہیں ملی لیکن میں کل تک پوری تفصیل تم تک پہنچا دوں گا اور ہاں ایک بات ذہین میں رکھنا تمہیں اپنی حفاظت بھی کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ اب میں ایک پستول کا مالک بن چکا تھا۔ بہرحال خوب دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں اناطورہ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں میری زندگی کے لیے خطرات ہیں یا پھر اناطورہ اس طرف سے بالکل مطمئن ہے۔ اناطورہ سے ملاقات کا کوایسا ذریعہ نہیں تھا۔ کہ جب بھی

میں چاہوں اسے طلب کرلوں۔ وہ تو خود ہی مجھ سے مل لیا کرتی تھی۔ نجانے کیوں طبیعت میں ایک اُلجھن سی سوار تھی۔ صبح بہت دیر سے جاگا۔ غسل وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے روم سروس کو فون کیا اور ناشتہ منگوالیا۔

پھر ناشتہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد طبیعت سنبھل گئی تھی۔ بہرحال دولت کے حصول کے لیے پہلے بھی زندگی کی بازی بیشتر بار لگا چکا تھا اور اب بھی یہی کر رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب جب کہ اس حد تک قدم آگے بڑھا دیے ہیں تو آئندہ بھی پوری ثابت قدمی سے کام کروں۔ حالاں کہ ایک اجنبی سرزمین پر یہ ساری کاوشیں کسی بھی لمحے کوئی خوفناک شکل اختیار کر سکتی تھیں لیکن اپنے طور پر اعتماد بھی ضروری تھا۔

چناں چہ خاصا مطمئن ہوگیا تھا۔ حسناتی اور روحا میرے لیے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ یہ لوگ میرے لیے جو تگ و دو کر رہے تھے۔ ان میں ان کا بھی کوئی مفاد ضرور ہوگا۔ پھر نجانے کتنا وقت گزرا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں دروازے کی طرف بڑھ گیا کیوں کہ دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ دروازے پر جو کوئی تھا۔ اسے دیکھ کر میں چونکا تھا۔ یہ عائف غماز کی بیٹی سبینہ غماز تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔

بہرحال اس کی آمد میرے لیے ذرا حیران کن سی تھی۔ میں نے کہا۔

"آؤ......" وہ اندر آگئی لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ "خیریت تو ہے۔ سبینہ بہت سنجیدہ لگ رہی ہو۔"

"کیا تمہیں اس بارے میں اطلاع نہیں ملی۔"

"کس بارے میں؟"

"حسناتی کو قتل کر دیا گیا ہے۔" سبینہ نے جواب دیا اور میں بُری طرح اُچھل پڑا۔ یہ خبر میرے لیے بم دھماکے سے کم نہیں تھی۔ وہ پھر بولی۔ "روحا بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگئی ہے لیکن باوثوق اطلاع ہے کہ وہ بھی شدید زخمی ہوئی ہے۔"

"لیکن حسناتی کو کس نے قتل کیا؟ بمشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔

"نجاشی نے۔" وہ ایک جرائم پیشہ آدمی ہے لیکن وہ خود بھی حسناتی کے ہاتھوں مارا گیا دونوں میں سخت مقابلہ ہوا تھا۔ حسناتی شدید زخمی ہو گئے تھے لیکن اس حالت میں بھی انہوں نے نجاشی پر گولیاں چلائیں اور اسے ہلاک کر دیا۔"

"اُف میرے خدا...... یہ تو واقعی بڑی پریشان کن اطلاع ہے۔"

"میرا خیال تھا کہ تمہیں اس بارے میں ضرور علم ہو گیا ہوگا۔"

"نہیں مجھے علم نہیں تھا۔ تم نے مجھے اطلاع دے کر مجھ پر احسان کیا ہے۔" "حالاں کہ تم نے مجھ پر احسان کرنا بھی گوارہ نہیں کیا۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"میں سمجھا...... نہیں۔"

"جب کوئی اپنے آپ سے ہی فرار حاصل کرلے تو اسے سمجھانا بھی بے مقصد ہی ہو جاتا ہے۔ وہ دکھے دکھے سے لہجے میں بولی اور میں نے آہستہ سے کہا۔

"تمہاری یہ دل شکنی مجھے منظور نہیں ہے سبینہ لیکن میں پریشان کن حالات کا شکار ہوں اور اب تو مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے میری مشکلات کے دن قریب آگئے۔" کچھ وقت کے لیے...... واقعی میں اُلجھ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ انا طورہ کے بعد روحا اور حسناتی ہی میرے سب سے بڑے محسن تھے اور یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ گائیڈ تھے۔ وہی اس کھیل کے ڈائریکٹر تھے اور جب ڈائریکٹر ہی نہ ہوں تو پھر اداکار اداکاری کس طرح کرے گا۔ یہ پریشان کن خیالات میرے دل میں تھے اور بس ایک ہی تصور میرے ذہن میں تھا کہ دیکھیں انا طورہ اس سلسلے میں کیا کرتی ہے اور کیا سوچتی ہے۔ بہرحال سبینہ کافی دیر تک میرے ساتھ رہی اور پھر بولی۔

"اگر تم کوئی اُلجھن یا پریشانی محسوس کرو۔ تو میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں پیشکش کرتی ہوں۔ کہ مناسب سمجھو تو مجھ پر اعتبار کرلینا۔ جب وہ چلی گئی تو میں خاموشی سے کمرے میں آبیٹھا اور ان اُلجھے ہوئے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ میں تنہا کس طرح محمود نصری کا مقابلہ کرسکتا ہوں بہرحال بہت دیر تک سوچتا رہا۔

ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے آواز دی۔ "کون ہے یار! اندر آجاؤ۔" اس بار اندر آنے والی محمود نصری کی بیٹی نغمینہ تھی، نغمینہ کو دیکھ کر میرے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر پھیل گیا۔ اس کی روشن پیشانی پر سیاہ بالوں کے جھولتے ہوئے گچھے اتنے حد حسین لگ رہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اس نے مجھے دیکھا اور مسکرادی۔

"خوانخواہ...... خود پر نجانے کتنے عذاب نازل کر لیے ہیں۔ میں کہتی ہوں گھر لیو، اسکے دروازے آج بھی تم پر کشادہ ہیں۔ کیوں پریشانیوں کا عذاب مول لیے ہوئے ہو۔ تمہیں بہکانے والے نجانے تمہارے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک دم تبدیلی پیدا ہوئی۔ حسناتی کی موت کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے۔ انا طورہ کی طرف سے ابھی کوئی گائیڈ لائن نہیں ملی تھی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں محمود نصری سے سمجھوتہ کرلوں؟۔ اگر اس سلسلے میں وہ میرا مخالف کردار ہے۔ تو دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کیا کچھ کرتا ہے۔ نغمینہ میری صورت دیکھتی رہی پھر بولی۔

"اگر کوئی احساس تمہیں روک رہا ہے تو میں تمام ذمہ داریاں قبول کرنے کو تیار ہوں۔"

"مجھے ایک بات کا جواب دو کیا اس سلسلے میں انکل نصری۔ مجھ سے تعاون کریں گے؟۔"

میں تمہیں اس ملاقات کے بارے میں جب تک نہیں بتاؤں کی جب تک تمہارے اور ڈیڈی کے درمیان تعلقات بہتر نہ ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے جیسے تم پسند کرو۔" میں نے جواب دیا اور نغمینہ متحیرانہ انداز میں منہ کھول کر کھڑی ہوگئی پھر وہ میرے قریب آئی اور اس نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ اس کے بعد تیاریاں ہوئیں اور وہ مجھے ساتھ لے کر چل پڑی۔ اب کسی سے مشورہ تو کرنا نہیں تھا۔ اگر غلط قدم اٹھایا ہے۔ تو انا طورہ جانے اور اس کا کام۔ کم از کم محمود نصری کے پاس جا کر کوئی تبدیلی تو رونما ہوگی۔ نغمینہ نصری نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں اور اس کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر چل پڑی۔

بہرحال اس کے بعد وہ کار خوب صورت کوٹھی میں داخل ہوگئی اور جب میں کار سے باہر نکلا تو کوٹھی کے صدر دروازے میں ہی ایک اور خوب صورت شکل نظر آئی، قلوپراہ کی اس سرزمین پر جو بھی نظر آتا تھا۔ نسوانی حسن سے مالا مال ہوتا تھا۔ جب کہ مردوں میں کوئی وجیہہ انسان مصر میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ جو حسن کے معاملے میں اپنی روایات چھوڑ جاتا۔ وہ لڑکی آگے بڑھی اور کس قدر تیکھے انداز میں بولی۔

"تو آپ آگئے؟" انداز کچھ عجیب سا تھا۔ ظاہر ہے میں کوئی جواب نہیں دے سکا۔ لیکن نغمینہ نے فوراً ہی کہا۔

"شجانیہ تمہارا لہجہ بہتر نہیں ہے۔ جاؤ اندر جاؤ...... آؤ......" اس بار اس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

بہرحال ہم اس عالی شان کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ نغمینہ مجھے ایک کمرے کے دروازے کے سامنے لے آئی پھر اس نے دروازے کے اُوپر ایک جگہ سے لٹکی ہوئی چابی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کمرہ آج بھی اس طرح آراستہ ہے اور تمہارا منتظر ہے۔ ہم نے اسے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بس اسے کھول کر صاف کر دیا جاتا تھا اسی تصور کے تحت کہ شاید تم کبھی واپس آؤ گے۔"

میں نے اپنے کمرے کا تالا کھولا۔ اندر کا ماحول دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ کیا بات ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے اعلیٰ مستقبل کے بارے میں غور کرنے

لگا۔ دبیز اونی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ اتنی عظیم الشان مسہری بچھی ہوئی تھی کہ میں اس پر قلابازیاں کھا سکتا تھا۔ ہر چیز ایک سے ایک اعلیٰ، چھت پر قیمتی فانوس، دیواروں پر قیمتی تصاویر۔ نغمینہ نے میرے دونوں شانوں پر دباؤ ڈال کر مجھے مسہری پر بٹھادیا اور پرمسرت لہجے میں بولی۔

"اپنی دنیا میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ آج بھی ہماری آغوش تمہارے لیے ہے۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر دوپہر کے کھانے پر میں نے پہلی بار محمود نصری کو دیکھا۔ بلند و بالا قامت کے اسی شخص کو دوسری بار میں نے بالکل قریب سے دیکھا تھا۔ سفید بالوں کے درمیان جان دار چہرہ جس پر تلخ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"بیٹھو...... اور کھانا کھاؤ...... ابو سعد۔" یہاں بھی بڑی مدرات تھی کھانے کے بعد مجھے محمود نصری نے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا اور پھر اپنے خوب صورت کمرے میں لے آئے۔

"ہوں، تو تم نے دنیا کے مزے چکھ لیے لیکن بہرحال صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے میں اب بھی یہ ہی کہوں گا۔ کہ نعمان سعد میرے گہرے دوست تھے اور ہمارا کاروبار مشترک تھا۔ میں اس کاروبار کا اظہار کر کے مرحوم کی روح کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صورتحال یہ تھی کہ میں دماغ تھا اور وہ بدن...... بہرحال تم اس بات کو اپنے ذہن میں رکھو کہ اگر تم عدالتی کاروائی کے چکر میں پڑے تو پائی پائی کے محتاج ہو جاؤ گے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سب کچھ میرا ہے، نعمان سعد بھی میرے ساتھ شریک تھا لیکن صورت حال کچھ اور تھی میں تمہیں ایک بہترین مشورہ دیتا ہوں کہ تم مکمل طور پر میرے حق میں دستبردار ہو جاؤ۔ تمہاری اپنی زندگی کے لیے بھی وہی سب کچھ موجود ہے۔ جو نعمان سعد کے لیے تھا اور یہ سب کچھ اتنا ہے کہ تمہاری سات پشتیں عیش کرسکتی ہیں۔ کیا کہتے ہو؟"

"انکل میں نے زندگی میں بہت سے تجربات کیے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اب مجھے آپ کے ساتھ آپ کی خواہش کے مطابق تعاون کرنا چاہیے۔"

"بہت اچھا فیصلہ ہے اور اگر تم دل سے یہ الفاظ کہہ رہے ہو۔ تو آج سے میری اور تمہاری دشمنی ختم۔ جاؤ عیش سے رہو اور کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری زندگی میں وہ سب کچھ واپس آگیا ہے۔ جسے تم کھو چکے تھے۔" محمود نصری بہت زیادہ خوش نظر آرہے تھے۔

بہرحال اناطورہ کے دل میں کچھ بھی ہو مجھے لمحہ لمحہ گائیڈ کرنا چاہیے تھا۔ یہاں واقعی جس زندگی سے مجھے متعارف کرایا گیا۔ اگر غور کیا جاتا تو ساری زندگی ہنگامہ آرائیاں کرنے کے باوجود میں یہ سب کچھ حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ انتہائی شان دار گاڑی مجھے دی گئی۔ ویسے اس دوران شجانیہ اور نغمینہ کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا ہو گیا تھا۔

پھر ایک شام میں نے اپنی کوٹھی میں عائف غماز کو دیکھا۔ عائف غماز نے کافی دیر تک محمود نصری کے ساتھ بات کی تھی اور اس کے بعد ایک اور شخص سے بھی میری ملاقات کرائی گئی۔ جس نے کچھ کاغذات کی نقول میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"بہتر یہ ہے کہ آپ ان کا جائزہ لے لیں۔ ان کاغذات پر دستخط آپ کو عدالت میں پیش ہو کر کرنا ہوں گے۔ میں نے کاغذات کی فائل لے کر رکھ لی۔ ماحول خوش گوار ہو رہا تھا۔ محمود نصری نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے اس تعاون کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ تم اطمینان رکھو یہ سب کچھ ہونے کے بعد تمہاری قدرومنزلت میں کچھ اور اضافہ ہو جائے گا۔" پھر جب میں نے اپنے کمرے میں آکر ان کاغذات کو پڑھا۔ تو میری کیفیت ذرا مختلف ہو گئی۔ کاغذات میں واضح طور پر یہ تحریر درج تھی کہ میرے جعلی باپ یعنی نعمان سعد کی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ محمود نصری کے کروڑوں ڈالر کے مقروض تھے اور اپنے تمام حصے اس کے ہاتھوں فروخت کر چکے تھے۔ میں یہاں موجود کسی چیز کو بھی اپنا نہیں سمجھوں گا۔

بہرحال سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں پریشان تھا اور میں نے بڑی مشکل سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مجھے ان کاغذات پر دستخط کر دینے چاہئیں۔ یہ دستخط بھی زیادہ مشکل نہیں تھے۔ کیوں کہ مجھے ان کا نمونہ نظر آگیا تھا۔ بہرحال یہ سب کچھ ہوا میں نے کئی بار اناطورہ کو پکارا لیکن اناطورہ کا کوئی نشان مجھے نہیں ملا تھا۔ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔

بہرحال اس کے بعد میں نے عدالت میں پیش ہو کر ان کاغذات پر دستخط کر دیے۔ محمود نصری کے اہل خاندان بہت خوش تھے۔ ہر شخص مجھ سے محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ مجھے کئی بار عدالت میں پیش کیا گیا اور جو بیان مجھے رٹایا گیا تھا۔ وہ میں نے دہرا دیا۔ پھر سارے کام پورے ہو گئے لیکن اُسی دن جب عدالت سے واپسی ہوئی تو میں نے حالات بدلے ہوئے محسوس کیے۔ سب نے کینچلی اتار دی تھی۔ مجھے شام کی چائے پر بھی نہیں پوچھا گیا۔ رات کا کھانا مجھے میرے کمرے میں دے دیا گیا اور میں ایک دم خوفزدہ ہو گیا۔ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں نے رات کو میں نے نغمینہ کے دروازے پر دستک دی۔ اندر روشنی تھی اور وہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی اور وہ مجھے دیکھ کر بولی۔

"ہوں...... بولو...... کیا بات ہے؟"

"نغمینہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"وہ ہی جو ہونا چاہیے تھا۔" نغمینہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب ڈیڈی بتائیں گے۔" اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا اور میں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ محمود نصری میرے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔

"آؤ۔ میرے ساتھ۔" انہوں نے کہا اور میں ان کے ساتھ چل پڑا وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے تھے۔

"اصولی طور پر تمہیں بیٹھنے کی پیشکش بھی نہیں کرنی چاہیے لیکن بہرحال بیٹھو اور سنو۔ میں تمہیں اپنی زندگی کا ایک سب سے تلخ سچ بتانا چاہتا ہوں غور سے سنو۔ اسی میں تمہارا مستقبل پوشیدہ ہے۔ تمہارا باپ میرا سب سے بڑا دوست نہیں بلکہ دشمن تھا۔ میں ایک چھوٹا سا سا کاروباری تھا اور وہ کاروبار کی دنیا کا ایک خوفناک جن۔ اس نے مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا۔ میرا سارا کاروبار ختم کر دیا۔ میری ساری ساکھ ختم کر دی اور نتیجے میں مجھے اس کے قدموں میں جھکنا پڑا وہ یہ ہی چاہتا تھا۔ میں جھکا تو اس نے مجھے سہارا دیا۔

لیکن میری ٹوٹی انا کی کرچیاں میرے دل میں پیوست تھیں اور ہر کرچی میرے سینے میں کرب پیدا کرتی رہتی تھی۔ اس نے مجھ پر رحم کھا کر مجھے اپنا دوست بنا لیا تھا لیکن اب میری زندگی میں اس سے انتقام لینے کے علاوہ کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ میں حالات کا انتظار کرتا رہا اور اس سے انتقام لینے کے لیے میں نے اپنی عزت بھی داؤ پر لگا دی۔ بہت مشکل سے میری کوششیں بارآور ہوئیں۔ حسناتی اس کا قانونی مشیر تھا۔ میں نے اسے توڑ لیا اور اس کی مدد سے نعمان سعد کے مفادات اپنے قبضے میں کرنے لگا اور پھر ایک مرحلے پر مجھے اس کی ضرورت ہی نہ رہی۔ چناں چہ میں نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔

اب آخری کانٹا تم رہ گئے تھے۔ میں نے تمہارے گرد زبردست جال بنا لیا اور پھر میں نے تمہیں بھی راستے سے ہٹا دیا۔ مگر کمبخت نجاشی سے غلطی ہو گئی۔ جس کی اسے پوری پوری سزا دی گئی ہے۔ میرا تم سے اتنا ہی تعلق تھا ابو سعد کہ تم سے ان کاغذات پر دستخط کرالوں اور اس کام میں میرے پورے خاندان میری بیٹیوں نے بھی میری مدد کی۔ نعمان سعد کے تمام اثاثوں پر قبضہ کرنے کے بعد جب میں نے تمہیں راستے سے ہٹا دیا تو حسناتی نے بد

دیانتی کی اس نے اس دولت میں سے آدھا حصہ مانگا جو دینے سے میں نے انکار کردیا۔ میں اسے پانچ فیصد دینا چاہتا تھا اور وہ میرے قبضے میں تھا۔ کیوں کہ اگر اس جرم کا انکشاف کرتا تو خود بھی مجرم گردانا جاتا۔

پھر نجانے کہاں سے اس بدبخت نے تمہیں برآمد کرلیا اور نیا کھیل شروع کردیا۔ اس کی موت میرے لیے ضروری ہوگئی تھی۔ چناں چہ نجاشی نے اسے قتل کیا اور میں نے نجاشی کو۔ بعد کی کہانی تمہارے علم میں ہے۔ اب تمہارے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ جاؤ قاہرہ کے گلی کوچوں میں جاکر بھیک مانگو۔ دنیا کو بتاؤ کہ تم مغرور نعمان سعد کے بیٹے ہو۔ یہ ہی میرا انتقام ہے۔“

”میں آپ کی ہر بات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں‘ لیکن مجھے صرف اتنا دے دیں کہ میں......“

”بکواس...... بالکل بکواس...... میں تو تمہیں قاہرہ کی گلیوں میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ بس میرے نوجوان دوست مجھے اپنی زندگی کا سب سے بد ترین تجربہ ہوا تھا۔ بے شک اتنا طورہ میرے لیے سب سے زیادہ قابل حیثیت تھی اور میں صرف اس بات کا غم کا شکار تھا۔ کہ وہ اس طرح غائب ہوگئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ بعد میں میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ...... کہ...... کہ......“ مائیکل کی آواز بند ہوگئی تھی کیوں کہ باہر بھاری بوٹوں کی آوازیں آرہی تھی۔ شاہ ور بھی ہوشیار ہوگیا۔ آوازیں دوڑتے ہوئے قدموں کی تھیں۔ جیسے کوئی کسی کے تعاقب میں بھاگ رہا ہو۔

رات کے اس حصے میں یہ آوازیں بڑی بھیانک لگ رہی تھیں مائیکل کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوگئے۔

”یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا کہ اس کے بعد میں......“ وہ خود خاموش ہوگیا۔ کیوں کہ قدموں کی چاپ اس غار کے پاس بھی آکر رُکی تھی۔ شاہ ور اور مائیکل نے دم سادھ لیا۔ یوں لگا جیسے کوئی یہاں رُک کر صورت حال کا جائزہ لے رہا ہو۔ پھر یہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔ شاہ ور کو ایک دم یہ احساس ہوا کہ اس غار میں وہ بڑی آسانی سے چوہے کی موت مارا جاسکتا ہے۔ کم از کم نکل کر صورت حال کا جائزہ تو لے۔ چناں چہ وہ تیار ہوا لیکن مائیکل نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”کہاں جارہے ہو۔ میری بات تو سن لو؟“

”تمہارے دماغ خراب ہے۔ میں اس غار میں چوہے کی موت نہیں مرنا چاہتا۔ تم بھی باہر آؤ۔“

”آہ...... مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ یہ داستان سنانے سے میرے زخم ہرے ہوگئے ہیں اور میں خود کو انتہائی نڈھال محسوس کررہا ہوں۔“

”جہنم میں جاؤ۔“ شاہ ور نے اس کا بازو جھٹک دیا اور پھر رینگتا ہوا غار سے باہر نکل آیا۔ دفعتہً ہی زبردست فائرنگ شروع ہوگئی۔ چنگاریاں اِدھر سے اُدھر دوڑنے لگیں یوں لگ رہا تھا جیسے دو بڑے گروہوں میں آپس میں جنگ چھڑ گئی ہو۔ شاہ ور نے ایک چٹان کی آڑ لی اور لمبا لمبا لیٹ گیا۔ گولیوں کی آوازیں اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ہر طرف گونج رہی تھیں۔ شاہ ور کے اندازے کے مطابق وہ کم از کم پچاس افراد تھے۔ جو آپس میں نبرد آزما تھے۔ ان پہاڑوں میں اور اس ہیبت ناک علاقے میں اس طرح کی جنگ کرنے والے منشیات کے سوداگروں کے علاوہ اور کون ہوسکتے تھے۔

اسمگلروں کا کوئی بہت بڑا گروہ آپس میں ٹکرا گیا تھا اور بڑی دھواں دھار جنگ ہورہی تھی۔ بہت سی گولیاں اس چٹان سے بھی ٹکرائیں جس کے پیچھے شاہ ور موجود تھا۔ شاہ ور نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کے بعد رینگتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب کہ اس نے کافی فاصلے پر ایک ایسی چٹان کی آڑ لی تھی۔ جو پیالے نما تھی اور بہت مضبوط اور محفوظ تھی۔ گولیاں چٹان کے آس پاس سے بھی گزر رہی تھیں لیکن اس کے نیچے پہنچنے کے بعد ایک انسانی جسم بآسانی گولیوں سے محفوظ ہوسکتا تھا۔

شاہ ور وہیں سمٹ گیا تقریباً پچیس منٹ تک یہ کاروائی جاری رہی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اس میں کمی ہوتی چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اس میں مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔ جیسے انسان اپنی دہشت ناکیوں سے اکتا کر خود ہی تھک گیا ہو۔ اور جب پندرہ بیس منٹ تک مزید کوئی کاروائی نہ ہوئی تو شاہ ور چٹان کے پیچھے سے نکلا اور اسی چٹان کے ساتھ کھڑا ہوکر حالات کا جائزہ لینے لگا۔ بہت دور گہرائیوں میں کچھ روشنیاں رینگ رہی تھیں یہ گاڑیوں کی روشنیاں تھیں اور عقب سے سرخ نظر آرہی تھیں۔ ...... وہ دور ہوتی جارہی تھیں اور تھوڑی دیر کے بعد یہ روشنیاں گم ہوگئیں۔ اب ہر طرف مکمل خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ شاہ ور تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ نجانے اس وقت اس کے ذہن پر ایک دہشت سی سوار ہوگئی تھی۔

کیا ہے یہ سب کچھ؟ ہر طرف موت کی حکمرانی ہے۔ لگتا ہے اس کائنات میں انسان کا انسان سے بڑا دشمن اور کوئی نہیں ہے۔ کیا کررہے ہیں یہ سب کچھ، نجانے کیا کررہے ہیں؟۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھا اور پھر غار میں داخل ہوگیا۔

غار میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ دفعتہً ہی اس کی نگاہ مائیکل پر پڑی اور وہ ایک دم اُچھل پڑا۔

مائیکل گولیوں سے چھلنی تھی اور اس کا جسم زمین پر مڑا تڑا پڑا ہوا تھا۔ شاہ ور نے ایک چھلانگ لگائی اور مائیکل کے قریب پہنچ گیا۔ مائیکل میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ شاہ ور ایک دم پیچھے ہٹا اور چٹانی دیوار سے ٹک کر کھڑا ہوگیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مائیکل کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مائیکل جو تھوڑی دیر پہلے اپنی زندگی کسی طویل ترین کہانی سنا رہا تھا۔ وہ کہانی جس میں اس نے نجانے کیا کیا کچھ کہا تھا اور اب وہ کہانی لمحوں کے اندر ختم ہوگئی تھی۔ یہ...... یہ...... یہ کیا ہوا...... ایسا‘ کیسے ہوگیا؟“ کون لوگ تھے جو مائیکل کو قتل کرکے چلے گئے۔ کس لیے آئے تھے۔ وہ لوگ مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ہر چیز کا فوری حل تو ملنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ بہت دیر تک وہ مائیکل کی لاش کو گھورتا رہا۔ کیا انسانی زندگی کی کہانیاں اس طرح لمحوں میں ختم ہوجاتی ہیں۔ بڑا درد انگیز خیال تھا اور اس خیال سے وہ نجانے کب تک دکھی رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی جگہ بیٹھ کر سر پکڑ لیا۔

پورے جسم پر ایک تھکن سوار ہوگئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی طویل ترین فاصلہ طے کرکے آیا ہو۔ برابر ایک انسانی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک ایسے شخص کی لاش جو تھوڑی دیر پہلے اپنی زندگی کی کہانی مزے لے لے کر سنا رہا تھا اور اب زندگی سے بہت دور چلا گیا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت دماغ میں ابھرتی چلی آرہی تھی۔ یہ کیفیت بحرانی تھی کیا ہے یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں اس دنیا کو ابھی تک سمجھ کیوں نہیں پایا۔ کیا کرنا چاہیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟۔ اسے بدن میں انگارے سے بھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ انگاروں کے بستر پر پڑا ہوا تھا اور یہ انگارے اس کے جسم کو خاکستر کررہے تھے۔ جیل کی زندگی اسے یاد آرہی تھی۔ ماں کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی۔ ماں جیل میں چکی پیستی تھی۔ کسی نے اسے کسی ایسے جرم میں پھنسا دیا تھا۔ جس کی سزا ساری زندگی کے لیے تھی۔ ماں کے ساتھ وہ جیل میں رہتا تھا۔ وہاں کی دنیا اس کے لیے ساری دنیا تھی۔

باہر کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ پھر وہ زندگی بھی چھین گئی اور اس کے بعد...... اس کے بعد...... جو کچھ ہوا وہ ایک لمبی کہانی تھی۔ پھر ماں بھی چھن گئی اور وہ اس دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ ناسمجھ ناواقف دنیا نے اس کے ساتھ کھیلنا شروع کردیا۔ یہ دنیا اس کے ساتھ کیوں کھیل رہی ہے۔ ایاز سعدی‘ وزیر پاشا‘ اور دوسرے تمام لوگ سب کے سب اسے اپنی مرضی کے مطابق نچا رہے تھے۔ میں کب تک ناچتا رہوں گا۔ کب تک ناچتا رہوں گا۔ دنیا میں رہنے والوں کو اپنی زندگی اپنی پسند کے مطابق

گزارنے کا حق ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا سارا وجود پیاسا ہو۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اپنے بال نوچنے لگا اور چیخا۔

''موسمو...... میری تخلیق کرو، مجھے اس دنیا میں دوبارہ پیدا کرو۔ ہواؤں مجھے زندگی گزارنے کے راستے بتاؤ۔ میں کیوں دنیا کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہوں۔ میں اپنی زندگی کا مالک ہوں۔ مجھ پر سب کا تسلط کیوں ہے۔ وقت مجھے ایک بار پھر سے جنم دے۔

ماں...... تو بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ میں تجھے تلاش کرنے کی کوششوں میں ناکام رہا ہوں، تو مجھے کیوں تلاش نہیں کر لیتی۔ کیوں نہیں تلاش کر لیتی مجھے تو۔ مجھے تیری آغوش چاہیے۔ پہلے کی طرح مجھے گود میں اٹھا لے۔ اوہ...... مجھے سمیٹ لے میری ماں۔ میں پھر تیری طلب محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنا لمس دے لمس دے مجھے۔ وہ زور زور سے چیختا رہا اور پھر غار سے باہر نکل آیا۔ شاید غار سے باہر بھی اس کی چیخیں فضاؤں میں گونج رہی تھیں۔ ذہن ماؤف سا ہو رہا تھا اور وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بے مقصد، بیکار کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ ایک نئی زندگی چاہتا تھا۔ ایک ایسی زندگی جو اسے سکون دے، سکون اور صرف سکون، اور اس ذہنی بحران نے اس نیم دیوانہ سا کر دیا تھا اور اس نیم دیوانگی کے عالم میں کون سے فاصلے طے ہوئے۔ کب اور کہاں پہنچا۔ ایک طرح سے اپنے آپ سے بے نیازی سی ہو گئی تھی۔ وہ ایک خوب صورت جوان تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا حلیہ کافی خراب ہوتا جا رہا تھا۔

بہت سا وقت عیش و عشرت میں بھی گزرا تھا لیکن صبحوتوں کی زندگی سامنے تھی۔ کوئی منزل نہیں تھی۔ آنکھوں میں صرف ایک ہی چمک تھی ماں مل جائے۔ ماں..... کسی کونے کسی گوشے میں کاش اس کی صورت مل جائے۔ فاقہ کشی ہو رہی تھی۔ نجانے کہاں کہاں سے کھانے کو مل جاتا تھا۔ جس سے زندگی قائم تھی۔ سفر...... سفر...... اور صرف سفر...... لیکن منزل نامعلوم بدن کافی حد تک کمزور ہو گیا تھا۔ لباس نام کی کوئی دوسری چیز اس کے پاس نہیں تھی۔ بدن پر جو کپڑے تھے۔ ان کو اُتار کر دھونا بھی ایک مشکل کام ہو گیا تھا۔ شیو بڑھ گئی تھی بال بکھر گئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زندگی کو کون سی منزل پر لے جایا جائے۔

ایک دن ایسے ہی ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ فاقہ کشی سے چہرے پر ہڈیاں نکل آئیں تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ کبھی پانی پیتے ہوئے شفاف پانی میں اگر اپنی شکل نظر آ جاتی تھی۔ تو خود کو پہچاننا تک مشکل ہو جاتا تھا لیکن نجانے کیوں اسے اپنے آپ کو اذیت دینے میں ایک سکون سا مل رہا تھا۔ بہر حال اس وقت بھی درخت کے نیچے بیٹھا گھٹنوں میں سر دیئے یہ ہی سوچ رہا تھا کہ کیا کرے؟'' ماں کی تلاش کا کوئی پہلو سامنے نہیں آتا تھا۔ درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے یوں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہ سامنے کسی سکے کی کھنک محسوس ہوئے۔ یونہی اس آواز پر گردن اٹھا کر دیکھا لیکن سامنے جو کچھ دیکھا۔ اسے دیکھ کر دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس کے سامنے اچھی خاصی ریزگاری پڑی ہوئی تھی۔ گزرنے والے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی صورت دیکھتے اور دو چار سکے اسے دے جاتے اسے تو پتہ بھی نہیں چل سکا تھا لیکن اب اندازہ ہوا تھا کہ لوگ اسے بھیک دے رہے ہیں۔

اچانک ہی یہ سکے دیکھ کر اس کے پیٹ میں انتڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ جس انداز میں جو کچھ ملا ہے۔ وہ درحقیقت میں باعثِ سکون ہے۔ کسی انسان کو جو آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے کی کوششیں کر رہا ہو اگر اس طرح بھیک ملنے لگے۔ تو کم از کم اسے اپنی اوقات کا اور قدرت کے فیصلوں کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ بھوک اس وقت کسی اور احساس کی توقع پیش دے رہی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک جھونپڑا ہوٹل نظر آ رہا تھا وہ اس کی پر بیٹھ گیا۔

''بھوکے ہو؟...... ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''پیسے ہیں؟۔ مالک نے دوبارہ پوچھا اور اس نے ساری ریزگاری ہوٹل کے مالک کے سامنے رکھ دی۔

چھوٹی سی ایک پلیٹ میں گوشت کی چند بوٹیاں لوکی کے قتلے اور دو روٹیاں آ گئیں۔ اس نے کھانا شروع کر دیا۔ یہ بھیک کا پہلا کھانا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر انسان کے جسم میں یہ رزق اتر جائے تو وہ کسی اور کام کے قابل نہیں رہتا۔ ایسا ہی ہوا پیٹ بھر گیا اور اس کے بعد وہ پانی پی کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کی زندگی بھیک کے مرہون منت ہو گئی تھی۔ جو حلیہ بن گیا تھا۔ اس کے بعد مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ لوگ خود بخود دے دیا کرتے تھے۔ کہیں کسی بھی جگہ بیٹھ جائیں۔ بس کچھ نہ کچھ مل ہی جایا کرتا تھا اور جو کچھ مل جاتا تھا۔ اس سے پیٹ بھر لیا کرتا تھا۔ رات کو کسی بھی جگہ پڑ جاتا اور بس صرف ماں کو یاد کرتا رہتا۔

بہر حال اب وہ ایک باقاعدہ بھکاری بن گیا تھا۔ وہ شہر کی ایک خوب صورت سڑک سے گزر رہا تھا اور دنیا کو دیکھ رہا تھا کہ اس نے ایک شان دار قیمتی کار دیکھی۔ جو ایک عالی شان بنگلے کے سامنے آ کر رُکی تھی، اس کار سے ایک شخص نیچے اُترا۔ شان دار لباس میں ملبوس چہرہ دیکھنے کے قابل، زندگی کی چمک تھی اس کے چہرے پر۔ اس کار میں ایک بہت ہی حسین عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

شاہ ور ان لوگوں سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس شخص نے عورت سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ کل دس بجے یہاں پہنچ جانا تمہاری مشکلوں کا حل میرے پاس ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ سر میں آ جاؤں گی۔ عورت نے کہا۔ وہ شخص کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ماضی کے بہت سے باب شاہ ور کے ذہن میں کھل گئے۔ بے شمار دھوکے مرزا خیال بیگ اور دوسرے لوگ مائیکل، اسکارو گروپ، شاہ ور نے ڈاکٹر فولاد سے ملنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس تک پہنچنے میں اسے بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ البتہ ڈاکٹر فولاد نے اسے فوراً پہچان لیا اور شاہ ور نے اسے کسی قدر سنبھلتے دیکھا۔ اس نے اسے شاہ ور کے نام سے ہی مخاطب کیا تھا۔

''شاید تم یقین نہ کرو، مجھے تمہاری تلاش بھی تھی اور ضرورت بھی۔''

''میں آپ کو یاد ہوں۔'' شاہ ور نے پوچھا اور فولاد ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

''یہ بتاؤ دماغ میں دشمنی کا کوئی خناس ہے یا۔''

''نہیں ڈاکٹر ...... ہیں میں نے کسی مقصد کے تحت آپ سے تعاون کیا تھا لیکن......''

''مجھے سب معلوم ہے......'' اس نے شاہ ور کو جملہ پورا نہ کرنے دیا۔

''اس کارو، مائیکل، بذر شیر، زیڈ، یہی تو بڑی خوبی ہے۔ جس سے میرا رابطہ ہوتا ہے میں اس کی زندگی کے ہر لمحے کو نگاہ میں رکھتا ہوں۔''

''یہ جادوگری ہے ڈاکٹر......''

''یہی زندگی ہے شاہ ور......''

''ڈاکٹر فولاد کے سامنے دشمن بن کر آؤ اور ڈاکٹر فولاد کی قوت کے کرشمے دیکھو، دوسری صورت میں اگر تم میرے دوست بن جاتے ہو تو میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ زندگی بھر اس دوستی کو تم یاد رکھو گے۔''

''نہیں ڈاکٹر فولاد مجھے کون سا کسی سے مشورہ کرنے جانا ہے، ٹھیک ہے آپ نے وعدہ کیا ہے کہ میری ماں کو تلاش کرنے میں میری بھرپور مدد کریں گے۔''

''نہیں مدد نہیں کروں گا بلکہ تلاش کروں گا اور بہت جلد تمہیں اس کا رزلٹ دوں گا۔''

''تو بس مجھے تین دن تک نہیں سوچنا میں آپ کے

ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہوں ڈاکٹر فولاد اپنی جگہ سے اٹھا اور شاہ ور کے پاس جا کر اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔"

"میرے لیے اس وقت تم میرے سب سے زیادہ معزز ہو مجھے رشتوں وغیرہ کو کوئی نام نہیں دیتا کیوں کہ میں ان رشتوں کو مانتا ہی نہیں؛ میں صرف اس رشتے کو مانتا ہوں جو دوستی اور مفاہمت کا رشتہ ہوتا ہے اب باقی سب کچھ بھول جاؤ اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو میں تمہارے لیے دوسرا بندوبست کرتا ہوں اور دیکھو میں نے غلط نہیں کیا تھا یہ کہہ کر اس نے سامنے رکھا ہوا بٹن دبایا اور دیواروں میں چند قمقمے کھل گئے ان سے ہتھیاروں کی نالیں باہر نکل آئیں ڈاکٹر فولاد نے کہا۔

یہ بٹن دبا کر اگر میں نیچے زمین پر جھک جاؤں تو ایک لمحے تک تم سوچ بھی نہیں سکو گے کہ میرا مقصد کیا ہے لیکن چاروں طرف سے برسنے والی گولیاں تمہارے جسم کو اس طرح چھلنی کردیں گی کہ تم سوچ نہ سکو گے بہر حال میں تمہارے لیے بندوبست کرتا ہوں؛ ڈاکٹر فولاد نے کہا اور پھر کسی کو طلب کرلیا یہ ایک لمبے چوڑے بدن کا آدمی تھا۔

"میرا معزز دوست شاہ ور؛ وقت کا کوئی تعین نہ کرو شاہ ور کو غسل کراؤ اس کا لباس فوراً تبدیل کراؤ اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کردو اور اسے انتہائی معزز مہمان کی حیثیت سے رہائش کے لیے کوئی بہترین کمرہ دو؛ مجھے تمہیں دوبارہ کوئی ہدایت دینے کی ضرورت پیش نہ آئے اس شخص نے گردن خم کی اور سینے پہ دونوں ہاتھ رکھ کر شاہ ور کی طرف رخ کرکے بولا۔

"آیئے جناب......" شاہ ور نے ڈاکٹر فولاد کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب؛ نہیں میرا خیال ہے کبھی کبھی اس طرح بھی حالات بدل جاتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک خیال ہے تمہارا......"

"آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں۔"

"ہاں ایک دھن کا پکا شخص جو میری طرح ہو جب کچھ وعدے کرلیتا ہے تو مجھے اس پر بھرپور اعتبار رہتا ہے میں تمہیں اپنا عکس کہہ چکا ہوں اس لیے مجھے تم پر اعتماد ہے۔"

"شکریہ......" شاہ ور نے کہا۔

"اب جاؤ۔" ڈاکٹر فولاد بولا اور شاہ ور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا؛ ڈاکٹر فولاد نے اس کی معنی خیز مسکراہٹ پر غور نہیں کیا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ڈاکٹر فولاد چونکہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں اس لیے میرے بارے میں تمہارے اندازے بھی غلط ہیں بہر حال جو شخص اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا اس نے ڈاکٹر فولاد کی ہدایت کے مطابق وہ تمام چیزیں شاہ ور کو مہیا کیں جن کی اسے ضرورت ہوسکتی تھیں؛ شیو بنانے کا سامان اور دوسری چیزیں لباس کے لیے اس نے کہا کہ تھوڑا سا وقت درکار ہے اور اس کے بعد اس نے ایک لباس اسے مہیا کردیا پھر بہت ہی عمدہ چائے بہت سے لوازمات کے ساتھ شاہ ور کو پیش کی گئی اس کے بعد اس نے کہا۔

"سر میں آپ کا نام نہیں پوچھ سکتا کیونکہ مجھے اس کی اجازت نہیں ہے لیکن میرا نام جیکسن ہے آپ مجھے اس نام سے بلا سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات تھی کہ جیکسن کو شاہ ور کا نام پوچھنے کی اجازت نہیں تھی غرض یہ کہ شاہ ور کا پہلا دن یہاں گزرا؛ لباس وغیرہ بھی اسے مہیا کردیا گیا تھا اس کے علاوہ جو بیڈ روم اسے دیا گیا تھا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا دوسرے دن ڈاکٹر فولاد نے اسے صبح کے ناشتے پر طلب کرلیا اور اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے کوئی پہاڑی جوان میرے سامنے کھڑا ہو؛ تم واقعی ان چٹانوں کے جیسے معلوم ہوتے ہو شاہ ور مجھے اجازت دو کہ میں آج سے تمہارے سلسلے میں اپنے کام کا آغاز کروں......"

"ڈاکٹر اب جب آپ نے مجھے اپنے زیر سایہ لے ہی

لیا ہے تو یہ اجازت وغیرہ کی بات نہ کریں میں ہر طرح سے اب آپ کا ساتھی ہوں۔"

"شکریہ مائی ڈیئر میرا پہلا عمل یہ ہے کہ میں تمہارا نام بدل رہا ہوں۔" لیزر میری پسند کا نام ہے آج سے تم لیزر ہو؛ قبول کرو گے یہ نام۔" شاہ ور نے مسکرا دیا اور بولا۔"

"میرا نام لیزر ہے۔"

"گڈ ویری گڈ؛ جیکسن نے تمہارا نام پوچھنے کی کوشش تو نہیں کی۔"

"نہیں......"

"تم اپنا نام اسے لیزر بتا سکتے ہو بلکہ وہ تمہیں خود اس نام سے مخاطب کرے گا کیونکہ میں یہ نام خود اس کے کانوں تک پہنچا دوں گا۔"

"جی ڈاکٹر......"

"اس کے علاوہ تم اس جگہ سے منتقل ہوجاؤ گے میں تمہیں اسی اسپتال میں رکھوں گا جس میں میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہوئی تھی تم ڈاکٹر لیزر ہو اور ڈاکٹروں کے لباس میں اسپتال آؤ گے اور اسپتال ہی کے ایک گوشے میں قیام اختیار کرو گے تم انتہائی سنجیدہ اور الگ تھلگ قسم کی شخصیت ہو تمہارے بارے میں اطلاع کردی جائے گی کہ کوئی تم سے الٹا سیدھا سوال نہ کرے؛ لوگوں سے دوستی بھی کرسکتے ہو ان کے ساتھ شامل بھی رہ سکتے ہو؛ مجھے معاف کرنا صرف آخری بار یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھے کچھ روحانی قوتیں بھی حاصل ہیں میں ہر وہ بات آسانی سے معلوم کرسکتا ہوں جو میرے خلاف ہوتی ہے؛ پلیز میری اس بات کو مائنڈ مت کرنا؛ میں نے کہا نا بس یہ آخری بات ہے اس کے بعد ہمارے درمیان بس اعتماد ہی اعتماد ہوگا۔"

"میں جانتا ہوں ڈاکٹر جب اس طرح کے واقعات سامنے آتے ہیں اور تھوڑا سا وقت انسانی فطرت کا حصہ ہی ہوتا ہے اب ہم ایک دوسرے سے مخلص ہیں تو یہ ہمارا تازہ ترین عمل ہے اور اس کے بعد ہمارے درمیان اعتماد ہی اعتماد ہوگا۔"

"جیتے رہو؛ میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا ڈاکٹر فولاد نے کہا پھر جب وہ چلا گیا تو شاہ ور نے دل ہی دل میں سوچا کہ مائی ڈیئر ڈاکٹر فولاد پہ تو تم میری مشکل آسان سے آسان تر کرتے چلے جارہے ہو تھوڑا سا تعجب بھی تھا شاہ ور کو چونکہ اس اسپتال میں بہت سی جانی پہچانی شخصیتیں بھی تھیں جو شاہ ور کو جانتے تھے پتا نہیں ڈاکٹر فولاد نے یہ خطرہ مول کیوں لے لیا تھا لیکن بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر فولاد بھی کم ذہنی قوتوں کا مالک نہیں ہے شام کو تقریباً پانچ بجے ایک بار پھر اس سے چائے پر ملاقات ہوئی ابھی تک اسے اسپتال منتقل نہیں کیا گیا تھا چائے کے بعد ڈاکٹر فولاد اسے ساتھ لے کر ایک کمرے میں داخل ہوگیا اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے چہرے کو تھوڑا سا بدلنا پڑے گا کیونکہ ممکن ہے اسپتال میں تمہیں کوئی تمہاری اصل حیثیت سے پہچان لے اور ویسے بھی یہ ایک دلچسپ عمل ہوگا تمہیں ایک نئی شخصیت مل جائے گی؛ شاہ ور کے لیے یہ لمحات بڑے سنسنی خیز تھے ڈاکٹر فولاد نے ایک الماری سے بہت سے ماسک نکالے اور انہیں میز پر ڈھیر کردیا اس نے کہا۔

"میں دنیا کے ان گنے چنے لوگوں میں سے ہوں جنہیں پلاسٹک سرجری پر عبور حاصل ہے تم یہ ماسک دیکھ رہے ہو ان کی تعداد درجنوں ہے اور یہ سن کر تمہیں خوشی ہوگی کہ یہ سب میں نے بنائی ہیں؛ میں اپنے اس فن کا بہت بڑا ماسٹر ہوں اور ماسک بنانے میں میری ٹکر کے چند ہی افراد ہوں گے میں تمہیں ایک خوب صورت چہرہ دیتا ہوں؛ دنیا میں خوب صورتی بھی زندگی کا ایک حصہ ہوتی ہے انسان کی ازلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خوب صورت نظر آئے کیا سمجھے آؤ بیٹھو۔"

شاہ ور نے ایک گہری سانس لی تھی بہر حال ان تمام باتوں کو تجربات ہی کہا جاتا تھا اور شاہ ور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں اپنے آپ کو مکمل طور پر اس ماحول

سے واقف کوئی شخص تصور کروں تو اس سے زیادہ احمقانہ سوچ اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیا بہت آگے کی چیز ہے اور کوئی بھی انسان اپنے آپ کو دنیا کا مکمل انسان نہیں کہہ سکتا حقیقت یہ تھی کہ تقریباً چالیس منٹ کی محنت سے ڈاکٹر فولاد نے جو چہرہ تیار کیا تھا جب شاہ ور نے اسے آئینے میں دیکھا تو اس کا سانس رکنے لگا اتنے خوب صورت چہرے کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہر لحاظ سے ایک مکمل نقوش والا چہرہ اسے یونان کا کیوپڈ کہنا غلط تھا کیونکہ کیوپڈ اتنا حسین نہیں تھا اسے روم کا ایکلوسس کہنا بھی غلط تھا کیوں کہ ایکلوسس کے چہرے میں یہ مردانہ شان نہیں تھی اس میں نسوانیت تھی ڈاکٹر فولاد نے شاہ ور کی آنکھوں کا رنگ تک بدل دیا تھا یہ نیلی اور حسین ترین آنکھیں ایک بار جس جانب اٹھ جاتیں تو وہ شخص سحر زدہ ہو جاتا جوان آنکھوں کو دیکھتا شاہ ور خود بھی ایک انتہائی حسین انسان تھا اس کے پورے وجود سے ایک خوب صورت پہاڑی وجود جھلکتا تھا لیکن اب جو اسے مصنوعی چہرہ دیا گیا تھا وہ اپنی مثال آپ تھا ڈاکٹر فولاد نے خود ہی کہا۔"

"اور تم جانتے ہو کہ اس چہرے کے ساتھ ساتھ صنفِ نازک کا کیا حال ہوگا یہ میں تمہیں زندگی کی دلچسپیوں کا ایک تحفہ دے رہا ہوں اور اس میں ایک نفسیاتی عمل بھی ہے' جانتے ہو کیا......"

"میں نہیں جانتا۔" شاہ ور نے مسکرا کر کہا۔

"ایک سوال کا جواب دو......"

"جی......"

"عورت پسند ہو......؟"

"یقین کریں گے۔"

"ہاں۔"

"نہیں ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"کیسے......؟"

"تمہاری شخصیت سے......"

"کیا مطلب......"

"دراصل تمہاری شخصیت سے وہ چیز جھلکتی ہی نہیں ہے کیا مزے کی بات ہے تم نے نہ جانے کیوں اپنا حلیہ بھکاریوں جیسا بنا رکھا تھا لیکن اب کوئی تمہیں دیکھے گا تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا کہ تم وہی شخص ہو۔"

"آپ نے میرے لیے مشکل پیدا کر دی ہے ڈاکٹر......"

"کیوں......؟"

"بتا چکا ہوں کہ عورت پرست نہیں ہوں......"

"زندگی کا یہ رخ بھی بڑا دلچسپ ہے اور جو بات میں تم سے کہہ رہا تھا وہ یہ تھی کہ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے کہ حسین چہرے صرف عورتوں ہی کو متاثر نہیں کرتے بلکہ حسن ہر شخص پر اثر انداز ہوتا ہے اور یوں سمجھو کہ انسان کے چالیس نمبر خود بخود بن جاتے ہیں باقی ساٹھ نمبر اس کی صلاحیتوں پر ملتے ہیں۔" شاہ ور ہنسنے لگا پھر بولا۔

"آپ تو مجھے اپنے تجربات کا مرکز بنا رہے ہیں۔"

"بڑے درست الفاظ کہے تم نے ایسی ہی بات ہے مجھے تمہاری شخصیت میں ایک خوب صورت انسان ملا ہے اور میں بہت سے معاملات میں تمہیں اپنا عکس بنانا چاہتا ہوں تمہارے چہرے کو یہ رنگ و روپ دینا بھی میرے اس احساس کا ایک حصہ ہے یعنی جو چیزیں میں نہیں حاصل کر سکا وہ میں تم میں دیکھنا چاہتا ہوں تا کہ میں تمہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھوں' شاہ ور نے دل ہی دل میں کہا کہ ڈاکٹر فولاد گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کی جانب بھاگتا ہے کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے انسان کے زوال کا ذریعہ اگر تم اپنی ان سوچوں میں مخلص ہو تو سہی معنوں میں یہ تصور کر لو کہ تمہارے بدترین زوال کا آغاز ہو چکا ہے وہ میں ہی ہوں گا جو تمہیں زندہ قبر میں اتارے گا' بہرحال ڈاکٹر لیزر تخلیق پا گیا' ڈاکٹر فولاد اس کے چہرے کی تکمیل کے بعد بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

(جاری ہے)

☆☆☆